اسلامی افکار و شخصیات

سید محمد قرۃ العین عابدی

ناشر
ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی۔ فون: ۲۶۳۲۰۱۵۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

پروفیسر سحر انصاری
صدر شعبہ اردو
جامعہ کراچی

حرف پذیرائی

تاریخی اعتبار سے ہم جس عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں اسے نو آبادیاتی نظام کے بعد کا دور (Post Colonial Era) کہا جا رہا ہے۔ نو آبادیاتی نظام نافذ کرنے والی قوتوں نے محکوم اقوام کے ساتھ انفرادی، اجتماعی، اقداری اور تہذیبی سطح پر کیسے کیسے ناقابل تلافی مظالم کئے ہیں ان کی تفصیلات سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ اسی زمانے میں مسلم معاشروں پر بطور خاص توجہ رہی ہے۔ مسلمانوں اور اسلام کے ضمن میں نو آبادیاتی ہتھکنڈوں نے بہت نقصان پہنچایا۔ اور متعدد معاملات کو اس طرح مسخ کیا کہ حقائق تک پہنچنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا۔

اب یہ "مابعد نو آبادیات" زمانہ بھی نقاب ڈال کر اسی تسلسل میں کام کر رہا ہے مسلمانوں میں کٹر پنتھیوں یا بنیاد پرستوں (Fundamentalists) کا شوشہ چھوڑ کر مغرب کی نئی حکمت عملی نہ معلوم کیا کچھ کرنا چاہتی ہے۔ روس کی وہ حیثیت تو ختم ہو چکی ہے جس نے اسے دنیا کی دوسری بڑی طاقت بنا رکھا تھا۔ اس سے ایک نوع کا احتساب، توازن اور معیار سیاست قائم تھا۔ اب صرف ایک طاقت کا نعرہ ہے۔ انا ولا غیری۔

اس پس منظر میں اہل ذکر و نظر پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ نئی استعماریت کس طرح اپنے جال پھیلا رہی ہے؟ اقوام پس ماندہ یا ترقی پذیر ممالک کو اسلحہ اور جنگ کے ذریعے کھلم کھلا شکست نہیں دی جا رہی ہے بلکہ مختلف چیرہ دستیوں اور پابندیوں کے ذریعے معاشی طور پر تباہ کیا جا رہا ہے۔ یہ شکست زیادہ سنگین، دیرپا اور دوررس ہو گی اس کے آثار جس تیزی سے نمایاں ہو رہے ہیں اگر اب بھی ارباب نظر نے توجہ نہ دی تو وہی ہو گا کہ "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں"

مجھے نوجوان محقق اور اہل قلم سید محمد قرۃ العین عابدی کی ضخیم اور فکر انگیز کتاب "اسلامی افکار و شخصیات" کا مطالعہ کر کے یک گونہ مسرت و طمانیت حاصل ہوئی ہے۔ مسرت تو اس بنا پر کہ سنجیدہ اور ادق موضوعات پر کام کرنے والے تازہ دم اذہان ابھی ہم میں موجود ہیں اور

طمانیت یوں کہ قرۃ العین عابدی نے بڑی محنت' جاں فشانی اور عرق ریزی سے یہ کتاب مکمل کی ہے۔ گویا نئے چراغ روشن ہو رہے ہیں۔ روشنی کا سفر جاری ہے۔

دور جدید میں ڈاکٹر حسین نصر اور ڈاکٹر اکبر ایس۔ احمد نے اسلام سے متعلق جو کتابیں تحریر کی ہیں وہ بلا شبہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عالم اسلام کے ماضی موجودہ مسائل اور آئندہ امکانات کو پیش نظر رکھ کر معروضی انداز بیان سے کام لینا اس وقت کی فوری ضرورت ہے۔

قرۃ العین عابدی نے سب سے پہلے اسلام میں علم کے تصور سے بحث کی ہے اس ضمن میں مغرب کے مفکرین اور مورخین کے موقف کو بھی مباحث میں شامل کیا ہے اور بنیادی سوال جو قرآن کریم میں ہے ایک محور کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ "کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جانتے ہیں' ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جو نہیں جانتے"۔ جناب ختمی مرتبتؐ' حضرت علیؑ حضرت امام جعفر صادقؑ' امام غزالی' شاہ ولی اللہ' سید جمال الدین افغانی اور سر سید احمد خان کے افکار اور خیالات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے دیگر مباحث میں مؤاخات اور اخوت' قومی زبان' سر سید کی تعلیمی آراء' پھر جمع بین الصلاتین' علمائے دیوبند' خاتم الانبیاء' آخری خلیفہ' صلح امام حسنؑ جیسے اہم موضوعات پر غیر روایتی انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ مصنف معروضیت اور سائنسی نقطہ نظر کو پسند کرتے ہیں اس لئے جابر ابن حیان' ابن سینا اور جمال الدین افغانی پر بطور خاص تحقیق کی ہے۔ اور جہاں جہاں ابن خلدون یا دیگر مفکرین سے اختلاف رائے ہے اسے شائستگی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

انیسویں صدی کا برصغیر تاریخ عالم میں ایک Case Study کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مختلف گوشوں پر از سر نو تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ سر سید احمد خان' نیچر کا تصور' جمال الدین افغانی کے تاثرات ان سب پر غور و فکر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ قرۃ العین عابدی نے اصل مآخذ و مدارک کی روشنی میں اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان نتائج میں سے بعض پر اختلاف رائے بھی ہو سکتا ہے لیکن مصنف کی محنت' خلوص اور جذبے سے انکار ممکن نہیں۔ مصنف کو اردو کے علاوہ انگریزی' فارسی اور عربی پر بھی دسترس ہے۔ اس لئے انہوں نے اصل کتب کو ان کے نمایاں حوالوں کے ساتھ شامل مباحث کیا ہے۔

اخوت اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں قرۃ العین عابدی کا موقف کیا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکے گا۔

"اگر ہمارے علما اور دانشور حضرات سنت نبویؐ کو سر مشق بناتے ہوئے اسوۂ حسنہ پر چلتے جو آنحضورؐ نے قائم کیا تھا اور جزدی اختلافات اور معمولی جھگڑوں میں الجھنے

کے بجائے اسلامی اقدار کو فروغ دیتے اور دنیاوی زندگی سے نکل کر خود بھی روحانیت کی جانب مائل ہوتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تو ہماری عبادات اور نماز روزے کی روحانیت میں کمی نہ آنے پاتی اور اسے بے روح نمازوں اور بے جان روزوں کا خطاب نہ ملتا۔ اگر ہم نے اسلامی اخلاق کو صحیح معنی میں اپنالیا ہوتا تو ہمارے بہت سے اختلافات خود بخود حل ہو چکے ہوتے اور نفاق وانتشار کی جگہ اتحادواخوت نے لے لی ہوتی"۔(زیر نظر کتاب ص۔۱۰۹)

یہ ایک اصولی' خوش آئند اور قابل عمل موقف ہے اس کو مختلف الفاظ میں دیگر اہل قلم بھی دہراتے رہتے ہیں۔ لیکن قرۃالعین عابدی نے صرف نشستند و گفتند و برخاستند جیسا طریق کار اختیار نہیں کیا بلکہ بڑی محنت اور جاں کاہی سے ایسے واقعات' افراد اور نظریات کو یکجا کر دیا ہے کہ قارئین اگر ان سے صد فی صد متفق نہ بھی ہوں تو ان کے خلوص محنت اور دعوت فکر کی داد ضرور دیں گے اور خود بھی سوچنے کی طرف مائل ہوں گے۔ ایک نئی کتاب کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب وہ یا تو قلب وروح پر اثر کرے یا ذہن کو سوالات اٹھانے اور غور و فکر کرنے پر راغب کرے۔ اس لحاظ سے "اسلامی افکار و شخصیات" ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کتاب کا سب سے حساس حصہ وہ ہے جہاں مسیحیت 'اسماعیلی فرقے' امامت کے تصور اور اجتہاد جیسے معاملات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس ضمن میں بھی مصنف کی تحقیق اور دلائل قابل توجہ ہیں لیکن یہ اتنے محکم نہیں کہ ہر شخص جس کے اپنے بھی تاریخی دلائل و شواہد ہیں ایک ہی جست میں اپنے دائرہ عقائد سے نکل کر قرۃالعین عابدی کا قائل ہو جائے۔ لیکن وہی بات کہ مصنف نے ان معاملات پر بھی شائستگی' تحقیق' تجزیے اور براہین سے کام لیا ہے۔ انہیں رد یا قبول کرنے والے کو بھی یہی طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔

اردو میں جمال الدین افغانی پر مستند کتابیں بہت کم ہیں۔ ان کے افکار و مقالات کے مختصر انتخابات کے علاوہ قاضی عبدالغفار کی 'آثار جمال الدین افغانی' بلا شبہ ایک اہم کتاب ہے تاہم مجھے ذاتی طور پر قرۃالعین عابدی کی اس کاوش کو سراہنا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں خاصی تفصیل سے سید جمال الدین افغانی کی حیات' شخصیت' کارناموں اور تاریخی امور پر قلم اٹھایا ہے۔ متعدد معلومات اہل اردو کے لئے یقیناً نئی ہوں گی۔ اس کے بعد سر سید احمد خان اور نیچریت کے موضوع پر بھی صاحبان فکر و دانش اپنا اپنا موقف بیان کر سکیں گے۔ علامہ اقبال' ابوالکلام آزاد' جواہر لعل نہرو اور امیر شکیب ارسلان کی آراء سے بھی سید جمال الدین افغانی کے تاریخی کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

"اسلامی افکار و شخصیات" اپنے اسلوب' زبان اور بیان کے لحاظ سے سنجیدہ عالمانہ اور شگفتہ ہے۔ ایسی کتابوں میں عموماً اصطلاحات اور فقہی یا شرعی مواد اس طرح آجاتا ہے کہ اسلوب بیان کی انفرادیت کہیں گم ہو جاتی ہے۔ قرۃ العین عابدی اس اعتبار سے قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو Readable بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ اس میں مکمل طور پر کامیاب رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسلام' تعلیم' عقائد' ادیان اور اہم شخصیات عالم سے دلچسپی رکھنے والے سید محمد قرۃ العین عابدی کی اس علمی کاوش "اسلامی افکار و شخصیات" کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر ویلکم بک پورٹ کے ادب دوست اور علم پرور رویے کو بھی مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں۔

۱۲' مارچ ۱۹۹۸

باسمہ تعالیٰ

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو **مذہب** کی ضرورت کو اس کی فطرت میں ودیعت کردیا۔
البرٹ آئنسٹائن (Albert Einstein) کا مشہور قول ہے:

Science without spirituality is lame, spirituality without science is blind.

"روحانیت کے بغیر سائنس لنگڑی ہے اور سائنس کے بغیر روحانیت اندھی ہے۔ حقیقت بھی یہی کچھ بتا رہی ہے کہ ہماری سائنس لنگڑی ہے اور روحانیت سے وابستہ حلقے بینائی سے محروم ہیں۔

بہر حال **مذہب** کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔ نفسیاتی۔ اعصابی بیماریوں سے بچاؤ کے ماہرین (Psycho Neuro Immunologist) نے جدید تحقیقات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ مذہبی اعتقادات انسان کی نشو ونما' جسمانی صحت اور دماغی توازن پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہذا جسمانی صحت کے دوسرے اصولوں کی رعایت کے ساتھ انسان کے عقیدے اور نظریئے کا درست ہونا بھی لازمی ہے تاکہ یہ عقیدہ اسے بے چینی' اضطراب' مایوسی ' نفرت' ڈر اور بے یقینی سے نجات دے۔ دراصل **مذہب** کا مقصد بھی انسان کو درندگی سے نکال کر ایک اچھا اور مہذب انسان بنانا ہے اور اسے یہ موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ خلافت الٰہیہ کے رتبہ کو حاصل کر سکے۔ انسان نے زمین پر قدم اتارا کہ ہدایت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انبیاء علیھم السلام لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے تھے اور انہیں اپنے نفوس کے تزکیہ اور احتساب کا ایک جامع پروگرام ترتیب دینا سکھاتے تھے۔ وہ انسانوں پر واضح کر دیتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنی خواہشات پر قابو نہ پایا اور اپنے اندر موجود جہالت کا خاتمہ نہ کیا تو وہ ایک دوسرے کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے اور یوں زمین پر فتنہ وفساد پھیل جائے گا۔

پس **مذہب** انسان کو اس دنیا میں رہنے کا ڈھنگ سکھانے کے ساتھ ساتھ آخرت کے گھر کی تیاریاں کروانے آیا تھا۔ یوں دنیا و آخرت دونوں جہاں کی خوشیاں' سعادتیں اور کمالات کو حاصل کرنا صرف مذہب کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

ایسا کر دکھایا۔ آنحضورؐ نے جہالت' حیوانیت' ظلم تعصبات اور قتل وغارتگری میں مبتلا قبیلوں کو دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف اول میں کھڑا کیا اور آخرت کی جانب بھی مائل کیا۔ انہوں نے ایک ایسے مثالی معاشرے کی بنیاد رکھی جس میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ اقلیتوں کو بھی مکمل تحفظ حاصل تھا اور ان کے تمام انسانی اور مذہبی حقوق بحال تھے۔ موجودہ اسلامی معاشروں میں موجود ناخواندگی' غربت' افلاس' فرقہ واریت' علاقائیت' بدعنوانیاں بتارہی ہیں کہ ہم اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں خاصی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمارے درمیان موجود اختلافات جو گھر اور خاندان کی سطح سے شروع ہوتے ہیں اور کسی سطح اور زاویے پر نہیں رکتے ایک عرصے سے بحران کی شکل اختیار کرچکے تھے لیکن اب ناسور بنتے جارہے ہیں۔!

اگر دنیا ہم سے یہ پوچھے کہ جس مذہب پر تم فخر کرتے ہو وہ تمہاری حالت بہتر بنانے میں کسی طرح معاون ثابت نہیں ہورہا' تو ہم کیا جواب دیں گے؟

آج ایک عام دانشور جب مسلمان ہونے کی تعریف جاننا چاہتا ہے تو مذہبی حلقے اسے اطمینان بخش جواب نہیں دے پاتے اس لئے کہ ہر فقہ سے وابستہ گروہ ایک خاص زاویے سے اس کی تعریف کرتا ہے جس پر صرف اس فقہ یا گروہ سے وابستہ لوگ پورے اترتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بنیادی عناصر (Essentials) بھی متنازعہ بنتے جارہے ہیں! اسلامی معاشرے میں پرورش پانے والا ایک نوجوان بچہ جب سن شعور تک پہنچتا ہے اور غلافوں میں چڑھا ہوا روایات میں لپٹا ہوا فرسودہ مذہب اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس کا پاک باطن اسے ماننے سے انکار کردیتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے کہ وہ کون ہے لیکن معاشرہ اس کی رہنمائی کرنے کے بجائے اسے سرگرداں کردیتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں موجود سیاسی عدم استحکام' معاشی بدحالی اور اخلاقی گراوٹ کے ساتھ ایک مسئلہ قتل اور دہشت گردی کے واقعات کا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے دور میں بنی اسرائیل کے درمیان ایک انسان کا قتل ہوا۔ یہ قتل سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا لہٰذا قاتل کے قبیلے والے اس کی سرپرستی کرنے لگے۔ اس زمانہ میں جبکہ نہ تفتیش کے باقاعدہ ادارے تھے' نہ پولیس اور نہ عدلیہ کا نظام تھا اللہ تعالیٰ نے قاتل کا سراغ لگانے کے لئے بنی اسرائیل کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ لیکن کیونکہ وہ قاتل کو چھپانا چاہتے تھے لہٰذا اس میں بھی ٹال مٹول کرنے لگے۔ اذ قتلتم نفساً فادرء تم فیھا و اللہ مخرج ما کنتم تکتمون (بقرہ۔ ۷۲)" اس وقت کو یاد کرو جبکہ تم نے ایک (بے گناہ انسانی) جان کا خون کیا اور اس کے (قاتل کے) بارے میں تمہارے درمیان اختلاف پھوٹ پڑا۔ اور اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرے گا جسے تم چھپارہے

تھے۔''

ایسا ہی ہوا اور جب اللہ تعالی کے حکم سے اس ذبح شدہ گائے کے ایک حصے کو مقتول پر لگایا گیا تو وہ بطور اعجاز زندہ ہو گیا۔ اس واقعہ سے متعلق تفصیلات سورہ بقرہ (۷۳۔۶۷) میں درج ہیں۔

یہ تو اس دور کی بات تھی لیکن آنحضرتؐ نے یہ قانون تعلیم دیا کہ جب تک بے گناہ انسان کا خون کرنے والے قاتل کو اس کے کیفر کردار تک نہیں پہنچایا جائے گا اس وقت تک معاشرے میں امن وامان بحال نہیں ہو سکتا۔ اس قانون کو اتنی اہمیت دی کہ اگر کوئی اس جرم کو دیکھ لینے کے بعد گواہی دینے سے کترائے یا بیان دینے سے گریز کرے تو اسے ایک سنگین جرم اور گناہ کبیرہ قرار دیا۔

ولا تکتمو ا الشھادہ ومن یکتمھا فانہ آثم قلبہٗ (مائدہ۔۳۲)

اور تم گواہی مت چھپاؤ اس لئے کہ جو اسے چھپائے گا تو بے شک اس کا دل گناہ گار ہو جائے گا اور اگر کوئی قاضی یا جج کسی قتل کا فیصلہ کرنے میں دیر کرے یا اس سے کترائے تو یقیناً وہ زیادہ قصور وار ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معاشرہ بھی انسانیت کے قاتلوں کو ان کے کیفر کردار تک نہیں پہنچا سکتا وہ نہ فلاح اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسے سکھ اور چین نصیب ہو سکتا ہے۔ مذہبی تشدد اور فرقہ واریت کی روک تھام کے لئے ہمارے دانشوروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ اسلام میں موجود ''خوارج'' کو پڑھیں اور ان نقصانات کا اندازہ لگائیں جو انہوں نے اسلامی معاشرے کو پہنچائے تھے۔ دور حاضر کے علماء کی ذمہ داریاں بہت سنگین ہیں۔ انہوں نے ان ذمہ داریوں کو نبھانے اور لوگوں کے مسائل حل کرنے کے بجائے انہیں فقہی مسائل، جزوی اختلافات اور فرقہ واریت میں دھکیل دیا۔ اس سب کا فائدہ پہلے سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں اٹھایا کرتی تھیں لیکن اب لسانی گروہ اور انسانی حقوق کی نام نہاد سماجی تنظیمیں اٹھا رہی ہیں۔ لوگوں نے نیشنلزم اور علاقائیت کا پرچار کرنے والے گروہوں کو اپنے حقوق کا محافظ تصور کر لیا ہے۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ کون مظلوموں اور محروموں کے حقوق کی پاسداری کر سکتا ہے اور ظلم اور آمریت کا مخالف ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے اسلام کے پرچم سے ہٹ کر لوگوں کے حقوق کی تحریک چلائی اور ناکام ہوئے ان میں نمایاں طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزاد سے زیادہ قابل اور مدبر خود کانگریس میں نہ تھا۔ وہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک کانگریس کے صدر رہے اور بعد میں وزیر تعلیم بنا دیئے گئے۔ انہوں نے پوری زندگی کانگریس کی سیاسی جدوجہد اور کامیابی کے لئے وقف کر دی لیکن پاکستان بننے کے دوران جب نئی دہلی میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح قتل عام کیا جا رہا تھا تو وہ کچھ نہ

کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ سیاسی لیڈران اور رہنماؤں کو اس تلخ تجربہ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے!

پس ایک ایسے وقت اور ماحول میں جب سرزمین مشرق میں مغرب کی یلغار ہو مذہبی لوگوں پر عریانیت اور فحاشی مسلط کی جارہی ہو اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے اور انسانی رشتوں کا احترام کرنے والی قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑوایا جارہا ہو ہم نے یہ سوچا کہ مذہبی شعور اور مذہبی تعلیم کی سطح اور معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ پس "اسلامی افکار و شخصیات" کو لکھنے سے مقصد یہ ہے کہ :

- اسلامی اقدار کو فروغ دیں
- مسلمانوں کے درمیان موجود اختلافات کو مستقل بنیادوں پر حل کریں
- امت مسلمہ کے درمیان موجود غلط نظریات کی حقیقت کو واضح کریں
- مختلف زاویوں سے اسلام کی بعض مثالی شخصیات کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالیں۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ **تعلیم** پر نئے افکار و نظریات کو پیش کرتی ہے۔ تعلیم پر حکومت پاکستان ایک نئی پالیسی کا اعلان کررہی ہے اور ہمارے ملک کے تعلیمی ماہرین اور دانشور وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن (ڈائریکٹر کیمسٹری انسٹی ٹیوٹ جامعہ کراچی) نے تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اعلیٰ تعلیم کو پاکستان کی بقا کا راز قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

The real wealth of a country is not in its natural resources but the quality of education with which its people are blessed and their ability to use their education.

ایک ملک کا حقیقی سرمایہ اس کے قدرتی ذرائع نہیں ہوا کرتے بلکہ تعلیم کا معیار جس سے لوگوں کو نوازا جائے اور تعلیم کو استعمال کرنے کی صلاحیت ہی ایک ملک کا سرمایہ ہے۔

تعلیم کو بہتر بنانے کے سلسلے میں ہم ان کی تمام تجاویز سے اتفاق کرتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جمیل الدین عالی، ڈاکٹر اقبال احمد (Eqbal Ahmed) اور ان جیسے دوسرے ماہرین تعلیم کا سارا جمع خرچ اس پر صرف ہوتا ہے کہ حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ اگر وہ سرسید احمد خان کی طرح اس میدان میں عملی طور پر کود جاتے تو وہ تعلیم میں ایک نمایاں تبدیلی لا سکتے تھے۔ ہماری نظر میں تعلیم کے سلسلے میں تین تجاویز قابل غور ہیں (ان کی جانب کتاب کے بعض ابواب میں روشنی ڈالی گئی ہے)

(۱) تعلیم کو مذہبی فریضے کے طور پر پیش کیا جائے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے۔
(۲) تعلیم کو اکثریت کی مادری اور روزمرہ کی زبان یعنی اردو میں پھیلانے کا صحیح اہتمام کیا جائے۔
(۳) تعلیمی اخراجات کا تمام تر بوجھ حکومت پر ڈالنے کے بجائے عوام کو اعتماد میں لیا جائے۔

اس ضمن میں ہم نے سید جمال الدین افغانی اور سر سید احمد خان کے نظریات کو پیش کیا ہے اور مسلمانوں کے مشہور سائنس دان جابر بن حیان کی شخصیت اور نوشتہ جات کا تعارف کرایا ہے افکار و شخصیات کے اس امتزاج میں قومی اقدار اور اخلاقی اصولوں پر لکھا گیا ہے۔ سیرت النبیؐ کے بعض گوشوں پر قلم اٹھایا گیا ہے اور تاریخ اسلام کے حوالے سے نواسۂ رسول سیدنا حسن اور ان کے دور میں ہونے والے اختلافات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ سیاسی شعور بیدار کرنے اور مذہبی تحریکوں کو صحیح راستہ دکھانے کیلئے اتحاد اسلامی کے نظریے (Pan-Islamism) کے داعی سید جمال الدین افغانی کی حیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب :

- تعصبات سے بالاتر ہو کر لکھی گئی ہے۔
- اس کا بنیادی مدرک قرآن و سنت ہے۔
- اس کی تالیف میں اسلام پر موجود دنیا کی چار زندہ زبانوں یعنی عربی' اردو' فارسی اور انگریزی کے دفاتر اولیہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔
- کوئی حوالہ کتاب کو بذات خود دیکھے بغیر نہیں دیا گیا۔

اس سب کے باوجود میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہوں گی میں اپنے تمام قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مفید مشوروں سے نوازیں تاکہ Islamisation کا عمل تیز ہو سکے۔ میں ڈاکٹر سحر انصاری کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو پڑھا اور اپنی مفید آراء سے نوازا۔ نیز کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اسلامی افکار فاؤنڈیشن اور ویلکم بک پورٹ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کو قارئین تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ
سید محمد قرۃ العین عابدی
۱۲' ذیقعد ۱۴۱۸

اسلام اور علم

یہ عجیب بات ہے کہ جب علم کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے تو دانشور طبقہ اس سے جدید علوم یعنی سائنس وغیرہ کو مراد لیتا ہے اور جب اسلام کے حوالہ سے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے تو مذہبی طبقہ اسے ان علوم کی صورت میں تفسیر کرتا ہے جو براہ راست قرآن و سنت سے وابستہ ہیں۔ ہم اس پر بعد میں روشنی ڈالیں گے لیکن علم سے ہماری مراد بغیر کسی تفریق یا محدودیت کے تمام علوم ہیں۔

تاریخ ہمیں اسلام سے پہلے کی کچھ تہذیبوں کی خبر دیتی ہے جنھوں نے تعلیم کو معاشرے کے خاص طبقوں تک محدود کر دیا تھا اور دوسرے طبقات کو اس سے محروم رکھا تھا۔ اسی قسم کی صورت حال کچھ عرصہ پیشتر امریکہ میں بھی تھی جہاں صرف گوروں کو تعلیم حاصل کرنے کے حقوق حاصل تھے اور کالے اس سے محروم تھے۔ زیادہ پرانی بات نہیں میلکم ایکس (Malcom X) سے پہلے کالے ہر طرح کے حقوق سے محروم تھے اور ان سے حیوانوں سے برا سلوک برتا جاتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کا ترقی یافتہ متمدن معاشرہ ان تمام برائیوں سے باہر نکل چکا ہے یا نہیں...... ؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہمیں اس کا جواب نفی میں دینا پڑے گا اس لیے کہ آج بھی اعلیٰ تعلیم سرمایہ داری اور بیورو کریسی کی ذاتی جاگیر ہے اور امیروں کے گھر کی لونڈی ہے اور

آج بھی کسی غریب کسان یا مفلس کاریگر کا بیٹا اعلیٰ تعلیم کی خواہش نہیں کر سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام علم کے بارے میں، کیا نظریہ رکھتا ہے اور انسانیت میں تعلیم عام کرنے کے لیے کیا لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے ؟

علم کے بارے میں اسلام کا طرز فکر اور طرز عمل موجودہ تعلیمی نظام اور عربوں کی سابقہ جاہلیت کے دور سے یکسر مختلف ہے۔ سب جانتے ہیں کہ طلوع اسلام سے قبل جزیرہ نما عرب جہالت و تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور تعلیم اور تہذیب و تمدن سے بالکل نابلد تھا۔ اسلام نے نہ صرف جہالت و نادانی کی مذمت کی اور اسے تمام برائیوں اور گناہوں کا سرچشمہ قرار دیا بلکہ تعلیم کے سلسلہ میں ہر قسم کی تفریق اور امتیاز کو مسترد کر کے اسے تمام انسانوں کا اولین حق بتلایا۔ اسلام نے علم کے بارے میں صرف خشک و خالی نظریات پیش نہیں کیے بلکہ علم کی اہمیت اور عظمت کو اس طرح اجاگر کیا کہ انسانوں میں علم دوستی اور علم کی محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ دوسری طرف سے علم کو ہر قسم کی قیدو شرط سے مستثنیٰ کر دیا اور اس کے حصول کو فریضہ اور عبادت قرار دیا اور لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ اگر وہ جانتے ہوتے کہ علم میں کیا راز پنہاں ہیں تو اسے حاصل کرتے چاہے اس کے لیے انہیں اپنا خون بہانا پڑتا یا سمندر کی تہوں میں غوطے مارنا پڑتے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہالت و وحشی گری میں ڈوبا ہوا معاشرہ اب تہذیب و تمدن کی مثال بن گیا۔ مدینہ منورہ ایک مدینہ فاضلہ تھا جس میں اخلاقی اقدار حاکم تھیں اور انسانی حقوق کا مکمل احترام کیا جاتا تھا۔ اس مثالی شہر میں غیر مسلمان بھی آباد تھے لیکن ان کی جان' مال اور ناموس محفوظ تھی۔ صدر اسلام کے مسلمان اگرچہ ابتداء میں دنیا میں رائج علوم سے ناواقف تھے لیکن ہستی کے حقائق اور ساز فطرت سے آشنا ہو چکے تھے اور سید جمال الدین کے بقول ان میں فلسفی روح پیدا ہو گئی تھی۔ یہی مسلمان کچھ عرصہ بعد اس وقت کے رائج علوم میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ تہذیب و تمدن اور علم و دانش میں مسلمانوں کی برتری اور عظمت کا دور صدیوں پر محیط ہے۔ انہوں نے اپنے وقت کی سپر پاورز کو صرف میدان جنگ میں شکست نہ دی تھی بلکہ علم' صنعت' ٹیکنالوجی' ہنر اور فن غرض ہر شعبہ زندگی میں مات کر دیا تھا۔ ابن سینا' جابر بن حیان' ابن رشد' محمد بن زکریا رازی' فارابی اور سید جمال الدین افغانی اسلام کی تہذیب و تمدن کے ان سرشناس چہروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے علوم اور سائنسز کو خاطر خواہ ترقی دی تھی۔
جابر بن حیان (Geber) کی کیمسٹری میں ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں اسی طرح جنگی ٹیکنالوجی اور اسلحہ و جنگی سازوسامان پر ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں۔ ابن سینا (Avicennae) اگرچہ بنیادی طور پر ایک فلسفی اور مابعد الطبیعات کے ماہر تھے لیکن طب و حکمت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے

کہ ان کی کتاب "القانون فی الطب" (Canon of medicine) چھ صدیوں تک مغرب کے تمام میڈیکل کالج اور یونیورسٹیز میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی اور اس کے صرف مغربی زبانوں میں آٹھ سو چھیتر (۸۷۶) ترجمے کیے گئے۔ ان میں سے کچھ ترجمے کامل اور کچھ ناقص ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف مستشرقین نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (دائرہ المعارف اسلامی) میں کیا ہے (۱) بہتر ہے کہ اس ضمن میں کچھ یورپی دانشوروں کی رائے بھی پیش کی جائے تاکہ قارئین ہماری باتوں کو مبالغہ اور زیادہ روی خیال نہ کریں۔

برٹینڈ رسل (Bertrand Russell) جیسے دانشور مغربی فلسفہ کی تاریخ پر لکھی گئی اپنی کتاب (History of western philosphy) میں لکھتے ہیں:

"Our use of the phrase the dark ages,to cover the period from 699 to 1000 marks our undue concentration on western Europe... From India to spain, the brilliant civilization of Islam flourished."

"تاریک دور کی اصطلاح کا ہمارا استعمال جو ۶۹۹ء سے لے کر ۱۰۰۰ء بعد مسیح تک ہے' مغربی یورپ پر ہماری توجہ کے مرکوز ہونے کی نشاندہی کرتا ہے...... (ورنہ) انڈیا سے لے کر اسپین تک اسلام کی درخشاں تہذیب پھل پھول رہی تھی۔"

اس اعتراف کے ساتھ کہ اس دوران جو مسیحیت کی دنیا نے کھویا وہ تہذیب و تمدن کی دنیا نے ہرگز نہ کھویا برٹینڈ رسل ایک دلچسپ جملے کا اضافہ کرتے ہیں:

" To us it seems that European civilization is the civilization but it is a narrow view."(2)

"ہمیں ایسا لگتا ہے کہ گویا مغربی تمدن ہی صحیح معنی میں تمدن کا آئینہ دار ہے لیکن یہ ایک تنگ نظری ہے۔"

قوموں کی تہذیب و تمدن اور عروج و زوال پر مشتمل ہزاروں سالہ تاریخ رقم کرنے والے وِل ڈیورانٹ (Will Durant) اپنی مشہور عالم کتاب (The story of civilization) میں اسلام کی تہذیب کی عظمت کو مانتے ہیں اور پانچ صدیوں تک اس کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ یونانی علوم عربی کی کتابوں سے ترجمہ ہو کر مسلمانوں کے ذریعہ سے یورپ تک پہنچتے ہیں۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

"عرب دانشوروں نے یونان کے علوم یعنی ریاضی' طبعیات (Physics) کیمیا'

(Chemistry)' ہیئت' (Astronomy) اور طب (Medicine) کو محفوظ کیا اور کمال تک پہنچایا۔ اور یونان سے حاصل ہونے والی میراث کو جو اب بہت غنی و بے نیاز ہو چکی تھی' یورپ میں منتقل کیا۔" (۳)

پس اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان علم و دانش اور تہذیب و تمدن میں ایک سنہری دور گزار چکے ہیں جب یورپ خواب غفلت (Dark Ages) میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن ہم صرف ماضی کی داستانیں سنا کر اپنا دل خوش نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں موجودہ حقائق کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بحیثیت قوم کے مسلمان تعلیم اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اقوام عالم سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ عام طور پر اسلامی ممالک میں خواندگی کی شرح اور تعلیم کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ وہ علم و دانش کے بارے میں اسلام کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داریوں سے غفلت کرتے ہیں اور اس کے باوجود خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ وہ تعلیم و تعلم اور تحقیق و ریسرچ کو ایک بیہودہ اور بیکار چیز سمجھتے ہیں اور یہی ان کے انحطاط اور پسماندگی اور فقر و ناداری کی بنیادی وجہ ہے۔ انیسویں صدی میں عالم اسلام کے ایک عظیم مصلح اور مفکر سید جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کے مسائل کے لیے ایک جامع حل پیش کیا اور انہیں جہالت و تاریکی سے نکالا۔ یوں تو ہم علم و دانش کے بارے میں ان کے افکار علیحدہ سے پیش کر چکے ہیں لیکن مناسب ہے کہ اس ضمن میں ان کا مندرجہ ذیل قول نقل کرتے چلیں۔ وہ مسلمانان عالم سے خطاب کر کے کہتے ہیں:

"یہ صرف علم کی توانائی ہے جس کے بل بوتے پر یورپ آج اپنی قدرت و طاقت کے کرشمے دکھا رہا ہے۔ مسلمان جدید علوم میں مہارت حاصل کر کے اپنی عظمت رفتہ کو بحال کر سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے فاصلہ رکھیں۔"

یہ حقیقت ہے اس لیے کہ جب جہالت و وحشی گری میں ڈوبے ہوئے بدو اسلام کی تعلیمات کے سائے میں چودہ سو سال پہلے علم و دانش اور تہذیب و تمدن میں دنیا کو مات کر سکتے ہیں تو آج کے ترقی یافتہ دور میں جبکہ ہر طرح کے وسائل اور امکانات فراہم ہیں' وہ علم و دانش میں ارتقا کا یہ سفر زیادہ آسانی سے طے کر سکتے ہیں۔ فلسفہ تاریخ تمدن یعنی قوموں کے بارے میں خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ جو قوم علم و دانش میں برتری حاصل کرے گی وہ پوری دنیا پر اپنی حکومت واقتدار اور عظمت و برتری برقرار کر لے گی اور جو علم سے غفلت کرے گی وہ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔ لیکن کیونکہ اس عروج و زوال میں بسا اوقات صدیاں لگ جاتی ہیں اس لیے سادہ ذہن رکھنے والے تنگ نظر افراد سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ محکوم رہیں گے اور دوسرے حاکم۔

مسلمانوں کے علمی انحطاط کا ایک بنیادی سبب ان کی تنگ نظری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ تنگ نظری خود ان کی ایجاد کردہ ہے یا قرآن و سنت اس کی طرفدار ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ علم کے بارے میں قرآن و سنت کا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے۔

قرآن کریم اور علم

اس سے پہلے کہ ہم علم کے بارے میں قرآن کریم کے نقطہ نظر کو بیان کریں بائبل سے کچھ اقتباسات کا نقل کرنا ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ علم اور ایمان یا مذہب اور سائنس میں موجود تضاد مذہبی دنیا میں قرآن کی طرف سے نہیں بلکہ بائبل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ تورات میں جو تحریفیں کی گئیں اس کے نتیجہ میں علم و ایمان کا یہ تضاد مذہبی دنیا میں خاصا رسوخ کر گیا۔ عہد عتیق میں پیدائش کے دوسرے باب میں، خداوند عالم کا یہ حکم حضرت آدم کو سنایا جاتا ہے:

"And the lord God commanded the man, You are free to eat from any tree in the garden, but you must not eat from the tree of knowledge of good and evil, for you when eat of it you will surely die (Genesis 2:16).

اور خداوند عالم نے انسان کو یہ حکم دیا کہ تم باغ (بہشت) میں ہر درخت سے کھانے میں آزاد ہو لیکن تمہیں اچھائی اور برائی کے علم کے درخت سے نہیں کھانا چاہیے اس لیے کہ اگر تم نے اس سے کھالیا تو تم ضرور ہلاک ہو جاؤ گے۔"

چنانچہ تورات کے مطابق شجر ممنوعہ گندم کا درخت نہ تھا بلکہ علم و معرفت کا درخت تھا نیز تیسرے باب میں شیطان حضرت حوا کو اس انداز میں ورغلاتا ہے:

"The serpent said to the woman for God knows that when you eat of it your eyes will be opened and you will be like God knowing good and evil."(3:4-5) (4)

سانپ نے عورت (حضرت حوا) سے کہا کہ جب تم اس میں سے کھاؤ گی تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی طرح ہو جاؤ گی (یعنی) اچھائی اور برائی جاننے لگو گی۔"

ان آیات میں صاف واضح ہے کہ علم اور معرفت کی تلقین شیطان کی طرف سے ہوئی اور بعد کی آیات میں اس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسی جرم کے ارتکاب کی خاطر انہیں جنت سے

نکال باہر کیا گیا۔ تورات کے بر خلاف قرآن کریم نہ صرف علم اور ایمان میں کسی قسم کے تضاد کا قائل نہیں بلکہ علم و دانش کے لیے ایک غیر معمولی اہمیت اور شرف و فضیلت کا قائل ہے۔ اللہ کی اس کتاب میں جب اہل علم و دانش اور اہل ایمان کا موازنہ کیا جاتا ہے تو اہل علم کو اہل ایمان پر غیر معمولی برتری دی جاتی ہے۔

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والّذین اُوتوا العلم درجات ۔(مجادلہ ۔ ۱۱)

اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان لانے والوں کا ایک درجہ بڑھاتا ہے لیکن جنہیں علم دے دیا گیا ان کے (بہت سے) درجے بڑھا دیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں لفظ علم بہت کثرت سے وارد ہوا ہے اور اگر ہم چاہیں کہ ان تمام آیات کا جائزہ لیں تو مقام اس کی اجازت نہیں دیتا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جتنا کہ اسلام علم کو عزت عطا کرتا ہے ادیان الہٰی میں بھی اس کی مثال نہیں لائی جا سکتی۔ نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی پہلی آیات جو کہ غار حرا میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئیں علم، قرائت اور قلم کے بارے میں ہیں۔ ان آیات میں ایک طرف حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ وحی کو پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو دوسری طرف یہ کلیہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعہ سے انسان کو علم کی دولت سے نوازا۔

اقرء باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرء وربك الاکرم الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم۔(علق ۔ ۵۔۱)

ان آیات میں شہید ثانی (زین الدین عاملی) نے ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے انسان کی خلقت کے ابتدائی مرحلہ کی نشاندہی کی ہے جب وہ خون کا ایک لوتھڑا تھا اور پھر اس کی تکمیل کے آخری مرحلہ کی جانب جب وہ کمال کے رتبہ پر فائز ہو گیا اور اس نے علم حاصل کر لیا۔ پس یہ شرف اور یہ رتبہ اسے علم کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی سلسلہ میں دوسرا بیان یہ ہے کہ پروردگار خود کو "بڑا کریم" کا لقب دیتے ہوئے خلقت کے بعد اپنی یہ نعمت گنوا رہا ہے کہ اس نے انسان کو علم کے زیور سے آراستہ کیا پس اگر کوئی اور چیز علم سے افضل ہوتی تو خالق کائنات اس نعمت کا تذکرہ کرتا اور اس کے حوالہ سے اپنی اکرمیت کا ثبوت پیش کرتا۔(۵)

قرآن کریم عقل اور سوچ رکھنے والوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جانتے ہیں ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جو نہیں جانتے۔ بعد میں تاکید کرتا ہے کہ عالم و جاہل کے اس فرق کو صرف اہل خرد ہی سمجھ سکتے ہیں یعنی جو سمجھ بوجھ رکھتے

ہیں (زمر۔۹) نیز قرآن کریم میں جہاں حضرت آدم کی خلقت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور فرشتوں کا اعتراض بیان کیا گیا ہے وہاں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ کہہ کر فرشتوں کا اعتراض مسترد کر دیا تھا کہ ان کا علم ناقص اور محدود ہے جبکہ بارگاہ ربوبیت کا علم لا محدود ہے۔قال انی اعلم مالا تعلمون (بقرہ۔٣٤) نیز جب آدم کو تمام اسماء کا علم دے دیا گیا تب ہی وہ مسجود ملائک قرار پائے۔ ان آیات میں جگہ جگہ علم کی عظمت و سربلندی جھلک رہی ہے۔امام فخر رازی ان آیات کے ذیل میں تفصیل سے علم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔(٦)

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور علم

قرآن کریم نے اپنی مختلف آیات میں انبیاء کے بھیجنے (بعثت) کا ایک بنیادی مقصد یہ بتلایا کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں۔ راغب اصفہانی المفردات میں حکمت کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں: "علم اور عقل کی مدد سے سچائی اور حقیقت تک پہنچنا اور ہستی کے تمام موجودات کی معرفت حاصل کرنا۔" (٧)

پس اس سے معلوم ہوا کہ حکمت علم سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ یعنی علم کے توسط سے اور عقل کی مدد سے انسان جب کائنات کے موجودات اور ہستی کے حقائق سے آشنا ہو جائے تو اسے حکمت کہتے ہیں۔ پس وہ علم حکمت کا سبب بنتا ہے جو انسانیت کے لیے نفع بخش ہو صرف خشک و خالی فرضیوں (Theories or Assumptions) کی حد تک محدود نہ ہو۔ اور انبیاء علیہم السلام کو خداوند عالم کی جانب سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ انسان کو ایسا علم دیں جو انہیں ساز فطرت سے آشنا کر دے۔

سورۂ انبیاء میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حضرت داؤد کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وعلّمناه صنعة لبوس لكم لتحصنكم من باسكم فهل انتم شاكرون۔

"اور ہم نے اسے تمہاری خاطر زرہ کی صنعت تعلیم دی تاکہ معرکہ کارزار کے وقت یہ تمہاری حفاظت کر سکے پس کیا تم شکر گزار ہو۔" (انبیاء۔٨٠)

یہ آیہ کریمہ اس وقت کو یاد دلا رہی ہے جب انسان کو زرہ بنانا نہ آتا تھا کہ وہ جنگ کے وقت اپنے جسم کی حفاظت کر سکے۔ خداوند عالم نے حضرت داؤد کے ذریعہ سے اس صنعت کو انسانوں میں عام کیا اور پھر ان سے پوچھا کہ کیا ہم نے تمہیں جو یہ نعمت دی ہے تم اس پر ہمارا شکر ادا کرو گے یا نہیں...... ؟ پس آیہ کریمہ میں جنگی فنون اور عسکری ٹیکنالوجی کو ایک عظیم نعمت اور انسان کے محافظ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اس لیے کہ "لبوس" عربی زبان میں اسلحہ اور جنگی

سازوسامان کو کہتے ہیں جس کا ایک مصداق زرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو اس سے بڑی نعمت عطا کی۔ یعنی ہوائیں ان کے حکم کے تابع تھیں اور وہ انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے جس طرح سے کہ سائنس آج ہوا اور فضا کو تسخیر کر کے اس سے مختلف کام لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم حضرت سلیمان کے وزیر آصف بن برخیا کا برسوں کی مسافت لمحے میں طے (طی الارض) کر کے چلے جانے اور تخت بلقیس لے آنے کو جادو یا مافوق الفطرت امر نہیں بتاتا بلکہ علم کے نتائج میں سے قرار دیتا ہے۔ (۸) حضرت یوسف کو خوابوں کی تعبیر کا علم دیا گیا اور حضرت خضر کو علم لدنی عطا ہوا جس سے حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم نبی بھی ناواقف تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نبیؑ نے علوم میں اپنی شمولیت کا دعویٰ نہ کیا جس طرح سے کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انامدینۃ العلم وعلی بابھا (۹)

میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف کتاب وسنت سے واقف نہ تھے بلکہ تمام علوم ان کے سینۂ مبارک میں اس طرح جمع تھے جیسا کہ مختلف عمارتیں اور مکانات ایک شہر کی چاردیواری اور حصار میں بند ہوا کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کو علم کے اس شہر کا دروازہ بتلایا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ علوم جنہیں حضرت علی نے آنحضورؐ سے حاصل کیا تھا مسلمانوں میں منتقل ہوئے۔ ہمیں حضرت علی کے علم پر بحث نہیں کرنا اس لیے کہ اُمت مسلمہ قرآن، وسنت، تفسیر، حدیث، قضاوت اور دوسرے علوم میں ان کی برتری پر مکمل اتفاق رکھتی ہے اور صحابہ کرام بھی ان کے اس مقام کو تسلیم کرتے تھے اور مختلف مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ علم کا شہر اور کتاب وحکمت کا معلم ہونے کے باوجود خداوند عالم نے اپنے اس حبیبؐ کو حکم دیا کہ وہ اپنے علم میں مزید اضافے کی دعا کرے اس لیے کہ علم وہ باعزت حقیقت ہے جس کی بلندیاں لامتناہی اور جس کی عظمتیں ختم نہ ہونے والی ہیں۔ وقل ربّ زدنی علما (طہ۔ ۱۱۴) علمی طور پر بھی اگر دیکھا جائے تو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنی اہمیت علم کو دی اتنی عبادت وریاضت کو نہ دی۔ اسی ضمن میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد تشریف لے جارہے تھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ کچھ صحابی ایک گوشہ میں بیٹھے دعا اور عبادات میں مشغول ہیں اور کچھ دوسری طرف علم وحکمت سیکھ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ ایک لمحہ کے لیے رکے اور فرمایا کہ دونوں

سعادت کے راستہ پر ہیں لیکن مجھے تعلیم و تعلّم کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ کہہ کر آپؐ درس و تدریس کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ (۱۰) سیرت النبیؐ کی کتابوں میں آنحضورؐ کے غزوات کو تو بڑی خوبصورتی سے رقم کیا جاتا ہے لیکن علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے لیے جو سرور کائناتؐ نے کیا' اس پر توجہ نہیں دی جاتی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مدینہ ہجرت کے بعد جنگوں کا سلسلہ ختم نہ ہونے پاتا تھا۔ ابھی ایک بغاوت کو کچلا نہ جاتا تھا کہ دوسری جگہ بغاوت سر اٹھانے لگتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو علم و دانش سے آراستہ کرنے کے لیے آپ ہمہ تن کوشاں رہتے اور ہر ممکنہ فرصت سے استفادہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنگ بدر میں قید ہونے والے کچھ کفار فدیہ دینے کی توان نہ رکھتے تھے تاکہ خود کو مسلمانوں کی قید سے آزاد کر سکیں تو آنحضورؐ نے انہیں پابند کیا کہ ان میں سے ہر ایک دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ یہی ان کا فدیہ ہے۔ (۱۱) اس طرح آپؐ نے ایک طرف سے علم کا احترام برقرار رکھا اور دوسری طرف مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کی جانب اہم قدم اٹھایا۔ اسی سنت رسولؐ سے متاثر ہو کر امام شافعی کو کہنا پڑا کہ علم کا حاصل کرنا نافلہ نمازیں پڑھنے سے افضل ہے۔ (۱۲)

علم...... جہاد اکبر

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ تلوار اٹھا کر کفار و مشرکین سے جنگ کرنا ہی جہاد ہے لیکن اسلام کی نظر میں ایک اس سے بھی بڑا جہاد ہے۔ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں کچھ لوگ محاذ جنگ سے پلٹے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ آفرین ہو اس قوم پر جس نے جہاد اصغر یعنی چھوٹا جہاد انجام دیا اور جہاد اکبر یعنی بڑا جہاد ان کے ذمہ باقی رہ گیا۔ جب اس بڑے جہاد کے بارے میں آنحضورؐ سے پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا اپنے نفس اور اپنے آپ سے جہاد کرنا۔ (۱۳) یعنی اپنے نفس کو رذیلہ اور ناپسندیدہ صفات۔ (جھوٹ' حسد' تکبر' جہالت......) سے نکال کر اخلاق حسنہ اور کمالات سے آراستہ کرنا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مسلمان معاشرے میں موجود اخلاقی برائیوں اور مذموم صفات کے خلاف جہاد کرنے کو محاذ جنگ میں لڑنے سے بڑا جہاد قرار دیا۔ پس جہالت جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے اس کے خلاف کام کرنا اور علم جو تمام کمالات میں نمایاں امتیاز رکھتا ہے اس کی راہ میں جدوجہد اور تلاش کرنا یقیناً جہاد اکبر ہوگا۔ نیز جہالت و نادانی برائی ہے منکر ہے' اور علم و دانش نیکی ہے معروف ہے لہٰذا اس حوالہ سے بھی اسلام علم کا حکم دیتا اور جہالت و ناخواندگی سے ممانعت کرتا ہے۔ جو اہمیت اسلام علم و دانش اور تہذیب و تمدن کو دیتا ہے

اور انسانی حقوق اور اخلاقی اقدار کا جس قدر احترام کرتا ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ منورہ میں ایک مدینہ فاضلہ (Ideal society) قائم کر دیا گیا تھا بہر حال علم حاصل کرنا اور تعلیم عام کرنا جہاد اکبر ہے اور اس ضمن میں امام غزالی ایک مشہور صحابی ابودرداء کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اگر کوئی حصول علم کے لیے باہر نکلنے کو جہاد نہ سمجھے تو اس کی رائے اور اس کی عقل میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔(۱۴)

تعلیم کے عملی پہلو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعلیم و تعلم پر ہمارے لیے احادیث کا ایک وسیع ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ فقہ و حدیث کا شاید ہی کوئی ایسا مجموعہ ہو جس میں کتاب العلم نہ ہو۔ ہم ان تمام احادیث کو تو پیش نہیں کر سکتے لیکن ان میں سے چار احادیث پر گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اسلام تعلیم کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے سلسلہ میں کیا لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔

پہلی حدیث

قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة (۱۵)

جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ یہ حدیث ان مسلّمہ اور متفقہ احادیث میں سے ہے جنہیں فریقین صحیح سمجھتے ہیں۔ اس حدیث میں علم کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت' بوڑھے و جوان' گورے و کالے' امیر و غریب' شہری و دیہاتی اور آفیسر و مہتر سب پر فرض ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے نماز روزہ زکوٰۃ اور دوسرے فرائض بغیر کسی تفریق کے معاشرے کے ان تمام طبقات کی گردن پر ہیں اسی طرح علم حاصل کرنا بھی فرض ہے اور اس میں فرق نہیں کہ مسلمان خاکروب ہو یا گورنر وزیر ہو یا سفیر لیکن اگر اس نے اس فریضہ کو نظر انداز کر دیا تو وہ گناہگار ٹھہرایا جائے گا جس طرح سے کہ نماز نہ پڑھنے یا زکوٰۃ نہ دینے والا بارگاہ الٰہی میں مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔

کون سا علم......؟

اس ضمن میں جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کون سا علم ہے جس کے حصول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام مسلمانوں پر بغیر کسی تفریق کے فرض ٹھہرایا ہے۔

امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی تفسیر میں مسلمانوں کے بیس سے

زیادہ گروہ وجود رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر گروہ اس سے مراد وہ علم لیتا ہے جس سے وہ وابستہ ہے۔ مثال کے طور پر علمائے کلام کا کہنا ہے کہ آنحضورؐ کی مراد علم کلام ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے توحید تک پہنچا جاتا ہے۔ فقہا و مجتہدین کا موقف یہ ہے کہ علم سے مراد علم فقہ ہے جس کے توسط سے حلال و حرام میں تمیز کی جاتی ہے۔ مفسرین و محدثین کہتے ہیں کہ یہ کتاب و سنت کا علم ہے جبکہ اہل تصوف دعویدار ہیں کہ یہ علم عرفان و طریقت ہے۔ ان گروہوں کی نظر بیان کرنے کے بعد امام غزالی اپنی نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فرائض اور حرام کے بارے میں علم حاصل کرنا فرض عین ہے اور غیر دینی علوم فرض کفائی ہیں۔ فرض عینی سے مراد وہ فرض ہے جس کا انجام دینا بالذات ہر مسلمان پر فرض ہے جیسے نماز پنجگانہ اور رمضان شریف کے روزے۔ فرض کفائی وہ ہے جس کا انجام دینا ہر مسلمان پر فرض نہیں لیکن اگر کوئی بھی انجام نہ دے تو سب گناہگار ہوں گے۔ جیسے نماز جنازہ اور مردے کا دفن کرنا۔ یہ دونوں فرائض تمام مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتے بلکہ کوئی بھی انہیں انجام دیدے کافی ہے لیکن اگر کوئی بھی انجام نہ دے تو سب قصوروار ٹھہرائے جائیں گے۔ وہ اپنی نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ہمارے اس قول پر تعجب نہ کیا جائے کہ علم طب (Medicine) اور علم حساب (Mathematics) فرض کفائی ہیں اس لیے کہ تمام صنائع کے اصول چاہے زراعت ہو کپڑے کی بنائی ہو یا سیاست یہ سب فرض کفائی ہیں۔ (۱۶) بہر صورت اگر ہم علماء اور دیندار طبقے کے نقطہ نظر کو بیان کرنا چاہیں تو با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ اس حدیث کے فہم میں زیادہ تر علماء ایک طرح کی تنگ نظری کا شکار ہیں۔ ان میں امام غزالی نے خاصی روشن فکری کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کا علوم کو شرعی اور غیر شرعی یا دینی اور غیر دینی علوم میں تقسیم کرنا کسی صورت قابل قبول نہیں۔ ان سے بہتر نظریہ کے حامل شہید ثانیؒ (شیخ زین الدین عاملی وفات ۹۶۵ھ) ہیں جو تعلیم و تعلم پر لکھی گئی اپنی مشہور کتاب میں علم کے بارے میں کسی محدودیت کے قائل نہیں اور نہ ہی قرآن و حدیث میں ذکر کیے گئے علم کو صرف منقولہ علوم میں تفسیر کرتے ہیں تاہم معرفت پروردگار اور توحید کے علم کو افضل ترین علم قرار دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ علم کے بارے میں فکری محدودیت کے طرفدار صرف علماء ہوں گے لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے علماء کی طرح مسلمان دانشور بھی اس کا شکار ہیں۔ ہم اس ضمن میں علامہ اقبال اور علامہ ابن خلدون (Ibn-e-Khallidoon) کی مثال پیش کرتے ہیں:

علامہ اقبال اور علم

امر ہمارے لیے خاصا باعث تعجب ہے کہ علامہ اقبال جیسا عظیم دانشور جابجا اپنے مجموعہ کلام میں جدید علوم کی مذمت کرے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ علم کے بارے میں انہوں نے اسلام کے پیغام کو جس سلیقہ سے نظم کیا ہوگا اور شعر و قافیہ کا لباس پہنایا ہوگا اُسے قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ لیکن اندازہ یہ ہوا کہ اقبال اسلام کے ایک ترجمان کی حیثیت سے نہ صرف علم کے بارے میں اسلام کا پیغام ادا نہیں کرتے بلکہ صرف علم عرفان و طریقت اور خودی کو علم قرار دیتے ہیں اور باقی علوم کو بیکار اور بیہودہ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے دسیوں اشعار میں مختلف انداز سے جدید و قدیم علوم کے بے مایہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اگر ہم ان کی طرفداری کرنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ علوم کو خاص شرائط اور خاص طریقہ کار سے مفید سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ناگزیر یہ کہنا پڑے گا کہ ان کے یہاں صرف خودی ہی علم ہے۔ اپنے اردو کے مجموعۂ کلام میں وہ کبھی دانش حاضر کے لیے آگ و عذاب کی تعبیر ذکر کرتے ہیں تو کبھی فرشتوں کے گیت میں علم و دانش کو انسانی ہوس کی بندگی قرار دیتے ہیں۔ وہ ضرب کلیم میں فلسفہ و مابعد الطبیعیات (Metaphsics) کو زندگی سے دوری کا سبب بتاتے ہیں اور ابلیس کی مجلس شوریٰ میں علم کلام کو مشرق کی افیون سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ علم خودی کو تو آزاد مردوں کا شیوہ قرار دیتے ہیں لیکن موسیقی و صورت گری کی طرح علم نباتات (Botany) کو غلاموں کا وطیرہ سمجھتے ہیں۔ وہ تعلیم نسواں پر بھی شدید حملے کرتے ہیں اور مرید ہندی کی زبان سے یہ فقرہ نقل کرتے ہیں : علم حاضر سے ہے دین زار و زبوں

دوزخی کی مناجات میں وہ علم کے بارے میں اپنی آراء کا نچوڑ اس شعر میں پیش کرتے ہیں:

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ فکر ملوکانہ کی ایجاد

وہ علم کو زندگی سے موازنہ کرتے ہوئے ایک الگ حقیقت تصور کرتے ہیں حالانکہ علم ہی زندگی کی کتاب کا نام ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ وہ علم کے بارے میں خاصی تنگ نظری کا شکار ہیں اور ان کے یہاں علم اور مذہب کا وہ تضاد بھی دکھائی دیتا ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سب کے باوجود کہیں کہیں وہ علم کی ہمت افزائی بھی کرتے ہیں۔ علم کی مدح میں ان کا یہ شعر قابل تعریف ہے۔ چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو (۱۷)

علامہ ابن خلدون

علامہ ابن خلدون بھی جو کہ فلسفہ تاریخ و تمدن میں غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں' علوم کے بارے میں خاصی تنگ نظری کا شکار ہیں۔ وہ واضح طور پر علم کیمیاء Chemistry کو علم یا صنعت ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور اسے روحانی نفوس کے اثرات میں سے قرار دیتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تھے اور علم کیمیاء اس وقت تک خاصی ترقی کر چکا تھا لیکن وہ پوری کیمسٹری کو اس ایک مسئلہ میں محدود کر کے کہ آیا مختلف دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے یا نہیں' کیمیا کو جادو اور مسلمانوں کے مشہور کیمیاء دان و سائنسدان جابر بن حیان کو جادوگر قرار دیتے ہیں۔ وہ عقلی علوم یعنی فلسفہ و منطق و کلام کو بھی دین کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ ان علوم کی مذمت میں صفحات رقم کرتے ہیں اور ان علوم کے صاحبان یعنی ارسطو' افلاطون' و ابن سینا' ابن رشد پر بھی تعریض کرتے ہیں۔ (۱۸) ہم جابر بن حیان پر لکھے گئے مقالہ میں اس جانب اشارہ کریں گے۔

ہم نے علم کے بارے میں مسلمان علماء اور دانشوروں کے افکار کی محدودیت کی جو وضاحت کی ہے اس سے ہر گز یہ نہ سمجھا جائے کہ مغرب اور جدید علوم کے بانی علم کے بارے میں کسی تنگ نظری کا شکار نہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو وہ ان دانشوروں سے زیادہ تنگ نظر ہیں اس لیے کہ وہ ہر اس چیز کے منکر ہیں جو مادے (Matter) کی حدود (Framework) سے باہر ہے۔ انہوں نے ان علوم کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی جن کا منشاء یونان تھا اور جنہیں مسلمانوں نے خاطر خواہ ترقی دی تھی۔ وہ صرف فلسفہ' مابعد الطبیعیات سے نہیں بھاگتے بلکہ انہوں نے یونانی طب (Greek medicine) یا حکمت پر بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ وہ علوم کا منشاء صرف تجربہ اور مشاہدہ کو سمجھتے ہیں اور ہم ان کی نظر مسترد کر چکے ہیں۔ اسی طرح وہ باطنی علوم کے بھی سرے سے منکر ہیں اور قرآن و سنت سے وابستہ علوم کو بھی صحیح معنی میں علم کا درجہ نہیں دیتے۔

بہر حال علم کے بارے میں مشرق و مغرب کی طرف سے عائد کردہ ان پابندیوں سے نکلتے ہوئے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کون سے علم کو فرض قرار دیا ہے۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو پیغمبر اکرمؐ اس حدیث میں فرما رہے ہیں کہ تعلیم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے یعنی ہر مسلمان کو جدید و قدیم علوم سے اجمالی طور پر ایک واقفیت ہونی چاہیے تاکہ وہ دنیا و آخرت کی

سعادت حاصل کر سکے۔ جس طرح سے کہ ماہرین تعلیم انسانی ارتقاء کے لیے تعلیم کو عام کرنے کی بات کرتے ہیں۔ پس پیغمبر اکرمؐ کی نظر میں کوئی خاص علم نہیں بلکہ مطلق علوم ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اصول فقہ اور عربی ادب کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک باشعور انسان اپنی گفتار میں کسی قید یا شرط کا تذکرہ نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نظر میں کسی قسم کی قید یا شرط نہیں تھی۔ اس طرح اگر پیغمبر اکرمؐ کی نظر میں کوئی خاص علم ہوتا تو آپ اسے بیان کرتے اور فرماتے کہ علم تفسیر یا علم اخلاق یا علم طبیعیات کا حاصل کرنا فرض ہے لیکن کیونکہ آپ نے ایسی کوئی قید کا اضافہ کر کے علم کو کسی خاص علم میں محدود نہیں کیا تو آپؐ کی مراد تمام علوم ہیں۔ بطور کلی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن و سنت کے مطالعہ کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ وہ تمام علوم جو انسان کو اس دنیا کی سعادت سے ہمکنار کریں اور انسانی معاشرے کی ضروریات' رفاہ اور مسلمان قوم کی عزت و شوکت جن علوم سے وابستہ ہو ان کا حاصل کرنا فرض ہے۔ اسی لیے احادیث میں نافع کا لفظ وارد ہوا ہے یعنی وہ علوم جو انسانیت کے لیے مفید اور نفع بخش ہوں۔ (۱۹) چاہے وہ ایٹمی و نیوکلیئر توانائی اور کمپیوٹر سائنس ہی کیوں نہ ہو۔ پس ہر علم میں دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک اس کا منفعت بخش پہلو اور ایک اس کا خشک و خالی فرضیوں اور کمزور اور حقیقت سے دور نظریات کا پہلو۔ اس میں فرق نہیں کہ فلسفہ ہو یا علم کلام ہو یا کوئی اور علم ہو جس حوالہ اور جس زاویہ سے وہ انسانیت کے حق میں مفید اور ضروری ہو گا اس کا حاصل کرنا ضروری ہے جس طرح کہ حلال و حرام اور آخرت کی سعادت پر موقوف علوم کا حصول ضروری ہے۔ پس اسلام علم کے بارے میں کسی تفریق کا قائل نہیں البتہ اس کی افادیت کو مد نظر رکھتا ہے اس لیے بطور مطلق اسلام میں صرف علم سحر یا جادو کا علم حرام ہے باقی تمام علوم فرض ہیں۔ ممکن ہے خاص شرائط میں بعض مسائل کی وجہ سے کچھ علوم حرام قرار دیئے جائیں جیسا کہ علم نجوم کو آئندہ پیشگوئیوں کے حوالہ سے استعمال کیا جائے۔ پس علم کے بارے میں جو حدود مشرق و مغرب کی جانب سے تصور کی گئی ہیں ان کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام علم کو سعادت کا منشاء سمجھتا ہے اور اس کے حصول کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے۔

تعلیم نسواں

پہلی حدیث کے فہم میں بہت سے لوگ عورتوں اور مردوں کے درمیان تفریق کے قائل ہیں ان لوگوں نے حدیث کے اس نقل کو بنیاد بنایا ہے جس میں صرف مسلم کا لفظ موجود ہے۔ ان

لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صرف مردوں کو حصول علم کا پابند کرتی ہے اور خواتین اس میں شامل نہیں کیونکہ اگر خواتین پر بھی علم کا حاصل کرنا فرض ہوتا تو "مسلمہ" کا لفظ بھی اضافہ کیا گیا ہوتا۔ ان لوگوں کے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ قرآن وسنت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر موارد میں مذکر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس سے مراد "تغلیب" کے قاعدہ کے مطابق عورت اور مرد دونوں ہوتے ہیں۔ اسی لیے وضاحت کے لیے بہت سی جگہ مسلمہ (مؤنث) کا لفظ استعمال کر کے صراحت بھی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کہا جائے کہ ("ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات......) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام انجام دیے' اس میں اگرچہ لفظ مذکر ہے لیکن مراد وہ تمام انسان ہیں جو یہ کام انجام دیں چاہے مرد ہوں یا عورت۔ یہی حال اخلاقی وروحانی اقدار اور اسلام کے دوسرے احکام کا ہے۔ اگر حضور مقبولؐ فرماتے ہیں کہ "المسلم اخ المسلم" "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مسلمان عورتیں آپس میں بہنیں نہیں۔ پس جو چیز مراد ہے وہ مسلمان ہے چاہے کسی صنف اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام نے حصول علم کے مسئلہ میں مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی۔ اسلام نے تعلیم کو جتنا کہ مردوں کے لیے ضروری سمجھا ہے اتنا ہی عورتوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں لفظ "مسلمہ" (مؤنث) کی صراحت بھی کی گئی ہے۔ تعلیم نسواں میں اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ خواتین مغربی تہذیب کا دھوکہ کھا کر بے حیائی کا شکار نہ ہو جائیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ راہ حل نہیں کہ ہم انہیں یکسر تعلیم سے محروم کر دیں۔ بلکہ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ ایسے کالج اور یونیورسٹیاں تشکیل دی جائیں جن میں اسلامی تہذیب حاکم ہو اور جو اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے مسلمان بچیوں کو علم کی دولت سے مالا مال کریں۔ نیز مخلوط طریقہ تعلیم (Co-education) پر مکمل پابندی عائد ہونی چاہیے۔

دوسری حدیث

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أطلبوا العلم ولو بالصین۔ (۲۰)

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے تمہیں چین جانا پڑے۔

اسلام میں بہت سے ایسے فرائض ہیں جنہیں صرف خاص جگہوں پر انجام دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر حج کے فریضہ کو صرف مکۃ المکرمہ میں انجام دیا جا سکتا ہے لیکن مذکورہ حدیث

میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں کسی جگہ کی کوئی قید و شرط نہیں۔ مغرب ہو یا مشرق اس فریضہ کو کہیں بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسکول کالج ہو یا گھر، آفس، مسجد یا گلی کوچہ جہاں علم کی دولت ملے لے لینی چاہیے۔ جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں چین کی مثال پیش کی۔ اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔

(۱) پہلی یہ ہے کہ چین اس زمانہ میں دور دراز کی سرزمین تصور کی جاتی تھی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے بہت مشقتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ لہٰذا آنحضورؐ کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم حاصل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے اگرچہ اس کے لیے انہیں دور دراز کے سفر کی صعوبتیں اور مشقتیں اٹھانا پڑیں۔ اسی لیے اپنے صحابی حضرت سلمان کے علمی مقام کی تعریف کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ اگر علم ستارۂ ثریا پر بھی ہوتا تو سلمان اسے حاصل کر لیتے اور اس تک پہنچ جاتے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ چین اس زمانہ میں تہذیب و تمدن اور علم و دانش کا گہوارہ تھا اس لیے آپ نے اس کو مثال کے طور پر پیش کیا۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ آنحضورؐ جانتے تھے کہ مسلمان مستقبل میں جدید علوم کے نام پر مغربی تہذیب کا دھوکہ کھا جائیں گے اور ان کے غلام بن جائیں گے اس لیے آپؐ نے چین کو ایک متبادل کی حیثیت سے پیش کیا تاکہ علم کے حصول کے مسئلہ میں وہ صرف مغرب کی جانب رخ کرنے کے عادی نہ بن جائیں بلکہ مغرب کے ساتھ ساتھ مشرق میں بھی ان ممالک کو اہمیت دیں جو علم و دانش کا مرکز ہیں اور جس کی بہترین مثال اس دور میں چین تھا۔

تیسری حدیث قال رسول اللہؐ: اُطلبوا العلم من المهد الی اللحد

گہوارے سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو۔

آنحضورؐ کی اسی حدیث سے متاثر ہو کر فردوسی نے یہ شعر کہا

گفتار پیغمبر راستگوی

زگہوارہ تا گور دانش بجوی

اس حدیث میں علم کو ایک ایسی بافضیلت اور حمیدہ صفت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اگر انسان اس کے لیے اپنی پوری زندگی بھی وقف کر دے تو بجا ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جذبہ اور ولولہ کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ اس حدیث میں دو نکات قابل غور ہیں۔

(۱) ہمارے معاشرے میں جس طرح سمجھا جاتا ہے کہ صرف بچپن ہی میں تعلیم حاصل کی

جا سکتی ہے اور اگر عمر زیادہ ہو گئی تو پھر تعلیم کا وقت گزر گیا۔ پیغمبر اکرمؐ اس بدعت اور غلط سوچ کو مسلمانوں کے ذہن سے باہر نکالنا چاہتے ہیں اور انہیں تعلیم بالغاں کی اہمیت بھی اسی طرح ذہن نشین کرا رہے ہیں جس طرح بچوں کی تعلیم ضروری ہے۔

(۲) نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے برخلاف جن کا ایک خاص اور مقررہ وقت ہے حصول علم ایک ایسا فریضہ ہے جس کے لیے کسی خاص وقت یا خاص زمانہ کی شرط نہیں اسے ہر وقت اور ہر زمانہ میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح سے کہ اس کے لیے عمر کی قید نہیں ہے اور اگر انسانی ارتقاء اس منزل پر پہنچ جائے کہ ایک نوزائیدہ بچہ کو بھی جھولے میں تعلیم سے آشنا کیا جا سکے تو ضرور کرانا چاہیے۔

چوتھی حدیث الحکمۃ ضالۃ المؤمن یاخذھا اینما وجدھا

حکمت مؤمن کی گمشدہ میراث ہے وہ اسے جہاں بھی پائے گا حاصل کر لے گا۔

ہم حکمت کے معنی بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ حکمت علم سے ایک درجہ آگے کی چیز ہے۔ حکمت یعنی علم اور عقل کی مدد سے حقائق کی شناخت اور ہستی اور فطرت کی گہری معرفت۔ حکمت یعنی وہ علم جو عمل سے نزدیک ہے۔ انسان کی اگر کوئی قیمتی چیز گم ہو جاتی ہے اور تلاش کے بعد اتفاق سے کسی کے پاس دکھائی دے جائے تو وہ کبھی لینے والے سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو کس مذہب، گروہ یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ صرف اتنا کہے گا کہ یہ میری چیز ہے میں اس کا حقدار ہوں لہٰذا اسے واپس لیتا ہوں۔ اس حدیث میں حکمت کو مؤمن کی گمشدہ میراث بتایا گیا ہے۔ یعنی بندۂ مؤمن حکمت کا زیادہ حقدار ہے لہٰذا اگر یہ حکمت اسے کافر کے پاس سے بھی ملے تو لے لینی چاہیے اس لیے کہ وہ اس میراث کو رکھنے کا کافر سے زیادہ سزاوار ہے۔ پس مذکورہ حدیث میں علم و حکمت کے حصول کے سلسلہ میں کسی خاص فرد کی قید حذف کر دی گئی ہے۔ انسان جس سے علم و حکمت حاصل کرنا چاہے کرے اس میں کسی قسم کی قید و شرط نہیں بشرطیکہ علم و حکمت ہو کی تعلیم دینے والا اس کا اہل ہو۔ اور یہ جو صحیح بخاری میں آنحضورؐ کی حدیث نقل کی گئی ہے کہ اہل کتاب سے نہ پوچھو یہ اس وقت کی بات ہے جب علم و حکمت کی تعلیم دینے والا رسولؐ لوگوں کے درمیان موجود تھا اور وہ علمائے یہود سے گزشتہ امتوں کے واقعات پوچھنے جاتے تھے۔ (صحیح بخاری۔ باب ۱۲۳۲)

نتیجہ

ہم اسلام اور علم' پر بیان کیے جانے والے حقائق سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اسلام تعلیم

و تعلم کے مسئلہ میں انسانوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق کو برداشت نہیں کرتا۔ اسلام علم و دانش اور تہذیب و تمدن کا ایک سنہری دور گزار چکا ہے اور مسلمانوں کی علمی پسماندگی ان کی اپنی بداعمالیوں اور فکری محدودیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن و سنت کے مطالعہ کے بعد یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اسلام نہ صرف علم اور ایمان میں کسی قسم کے تضاد کا قائل نہیں بلکہ علم کے لیے ایک بلند رتبہ اور عظیم درجہ کا قائل ہے۔ نیز اسلام مختلف علوم کے بارے میں ان محدودیتوں سے بھی آزاد ہے جن میں مشرق و مغرب مبتلا ہیں۔ اسلام علم کے بارے میں ایک جامع نظام اور لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ ایک طرف سے اسے ایک مذہبی فریضہ قرار دیتا ہے اور دوسری طرف سے اسے زمان و مکان اور شخص کی قید (Time,place,person) سے آزاد کر دیتا ہے تاکہ انسان ان رہنما تعلیمات کے سائے میں علم کی بلندیوں کو طے کرتا چلا جائے اور خلافت الٰہیہ کے رتبہ پر فائز ہو۔

مدارک

1- B.Lewis, ch.Pellat..., The Encyclopedia of Islam, Leiden: E.J. Brill,1991, Vol. II, pp.357-359, 1986, Vol-III , PP.941-945

ابن الندیم، کتاب الفہرست، ترجمۂ م۔ رضا تجدد، ایران چاپخانہ بانک بازرگانی، 1967، ص ۶۴۰۔۶۳۶

احمد شنتناوی وابراہیم زکی...... مصر: وزارۃ المعارف العمومیہ، جلد ششم ۱۹۳۳ء ص ۲۳۲۔۲۲۸

2- Bertrand Russell, History of the western philospły, London.1948, P.419

(بحوالہ) جمال الدین اسد آبادی، اسلام و علم، تبریز: کتاب فروشی سعدی، ۱۹۷۱ء

3- Will and Ariel Durant, the story of civilization.

تاریخ تمدن، تہران: سازمان انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی، 1991ء

مرتضٰی مطہری، مجموعۂ آثار (انسان و سرنوشت)، تہران: انتشارات صدرا، ۱۹۹۳ء، جلد اول، ص ۳۴۹

4- The holy Bible, New Int. Version, England:

Int. Bible Society, 1990, Genesis, Chapters 2&3

مرتضٰی مطہری، مجموعہ آثار (انسان وایمان)، تہران: انتشارات صدرا ۱۹۹۴ جلد دوم ص ۳۰

(۵) زین الدین عاملی، منیة المرید فی آداب المفید و المستفید، قم: دار المرتضٰی، ۱۰۴۲ ھ، ص ۲۰۔۱۹

(۶) امام فخر رازی، التفسیر الکبیر، تہران: دار الکتب العلمیہ، جزء اول

(۷) راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، تہران: المکتبہ المرتضویہ، ۱۳۷۳ھ،

(۸) طبرسی، مجمع البیان، دمشق: ۱۹۳۷، مطبعہ العرفان حسین طباطبائی، المیزان، بیروت: مئوسسۃ الاعلمی، ۱۹۷۲، جلد ۱۴، ص ۳۱۳

(۹) سلطان الواعظین، شبہای پشاور، تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۹۷۳ء ص ۶۴۷۔۶۴۶۔ سلطان الواعظین اہل سنت کی حدیث کے قدیم و معتبر دفاتر وماخذ کا حوالہ دیتے ہیں۔

(۱۰) امام غزالی، احیاء علوم الدین، بیروت: دار المعرفتہ، ۱۹۸۲، جلد اول ص ۱۰[اخرجہ ابن ماجہؒ مرتضٰی مطہری، دہ گفتار، تہران: انتشارات صدرا، ۱۹۹۶ء ص ۱۸۷۔۱۵۴

(۱۱) امام غزالی، احیاء علوم الدین

مسند احمد بن حنبل، بیروت: دار الفکر، ص ۲۴۷ جلد اول

(۱۲) امام غزالی، احیاء علوم الدین جلد اول ص ۹

(۱۳) امام خمینی، چہل حدیث، قم: مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۹۹۴، ص ۵

(۱۴) امام غزالی، احیاء علوم الدین جلد اول ص ۹

(۱۵) سنن ابن ماجہ، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۹۷۵، المقدمۃ، حدیث نمبر ۲۲۴، جلد اول، ص ۸۱

وکتاب الطہارۃ حدیث نمبر ۵۵۲

غزالی احیاء علوم الدین، جلد اول،

باقر مجلسی، مرآۃ العقول، تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۹۸۳، جلد اول ص ۱۰۲۔۹۸

مرتضٰی مطہری، دہ گفتار، تہران: انتشارات صدرا، ص ۱۸۷۔۱۵۴

(۱۶) امام غزالی، احیاء علوم الدین، جلد اول ص ۱۶۔۱۵ مرتضٰی مطہری، دہ گفتار

(۱۷) علامہ اقبال 'کلیات اقبال (اردو) 'لاہور : شیخ غلام علی اینڈ سنز '۱۹۸۶ 'ص ۳۵۵ و ۴۰۱ '۴۸۰ '۵۴۰ '۵۴۱ '۵۵۸ '۶۴۸ '۴۲۶ '۴۲۷ '۶۶۵

(۱۸) ابن خلدون 'مقدمہ ابن خلدون 'کراچی: نفیس اکیڈمی '۱۹۸۶ 'حصہ دوم ص ۴۲۸ و ص ۴۴۹ ص ۴۵۲ ص ۴۰۱ و حصہ اول ص ۱۸۹

(۱۹) زین الدین عاملی 'منیۃ المرید ص ۲۵

مرتضیٰ مطہری 'دہ گفتار

ری شہری 'میزان الحکمۃ قم: مکتب الاعلام الاسلامی '۱۹۹۱ 'جلد ہشتم ص ۵۲۷ (۲۹۱۲)

(۲۰) باقی احادیث کے مآخذ کی لیے نمبر ۲۰ کی طرف رجوع کریں۔

تعلیم پر سید جمال الدین افغانیؒ کے افکار

سید جمال الدین انیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر' مدبر' فلسفی اور مرد مجاہد ہیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانان عالم کو خواب غفلت میں سوتے اور سلطنت برطانیہ کو ایک شکاری عقاب کی طرح پر پھیلاتے دیکھا۔ ان سے یہ برداشت نہ ہو سکا چنانچہ انہوں نے عالم اسلام کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ایک لشکر جرار کی مانند سلطنت کبیر برطانیہ سے مقابلہ کیا۔ انیسویں صدی میں سوڈان' مصر' ایران' افغانستان اور برصغیر ہندوپاک میں جو تحریکیں وجود میں آئیں اور جن انقلابات نے جنم لیا کم وبیش یہ سب سید جمال الدین کی طاقت فرسا کوششوں کا نتیجہ تھے۔ نتیجتاً برطانوی سامراج کو غیر معمولی نقصانات اٹھانا پڑے اور اپنی تمام عزت و شوکت کے باوجود ان ملکوں کو ترک کرنا پڑا۔

تعلیم و تعلم کے بارے میں سید جمال الدین کے افکار نہایت جامع ہیں۔ اگر دانشور طبقہ ان نادر و کمیاب افکار پر توجہ کرے تو شک نہیں کہ یہ نئی اصلاحات کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔

سید جمال الدین کی نظر میں بادشاہت اور عظمت ہمیشہ ہمیشہ سے علم کی رہی ہے اور قیام قیامت تک علم کی یہ سلطنت باقی رہے گی۔ مشرقی اقوام کی پسماندگی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ علم' تحقیق اور ریسرچ کو ایک بیکار' بیہودہ اور مہمل چیز سمجھتے ہیں۔ علم کی عظمت کو سلام کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"حقیقت میں یہ تمام تجاوزات کشور کشائی اور دوسروں کو محکوم بنانا نہ فرنگیوں کے بس کی

بات ہے نہ انگریزوں کے لئے ممکن بلکہ یہ علم ہے جو ہر موقع و مقام پر اپنی عظمت و شوکت کو ظاہر کرتا ہے اور جہالت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی پیشانی کو ذلت و رسوائی کی خاک میں ملے اور علم کی عظمت کو سجدہ کرے۔ پس حقیقت میں بادشاہت ہرگز علم کے گھر سے باہر نہیں نکلی لیکن علم جو کہ حقیقی بادشاہ اور حکمران ہے اپنا دارالخلافہ بدلتا رہا ہے کبھی مشرق سے مغرب چلا جاتا ہے اور کبھی مغرب سے مشرق......"

نومبر 1872 کو البرٹ ہال کلکتہ میں تعلیم و تعلم پر دیئے گئے لیکچر میں سید جمال الدین نے ایک نئی حقیقت کا انکشاف کیا اور ہندوستان کے دانشوروں کے لیے اس امر کی وضاحت ضروری سمجھی کہ شروع میں تمام علوم و فنون کا مرکز مشرق اور بالخصوص ہندوستان کی سرزمین تھی۔ علم کا یہ طویل تاریخی سفر جو صدیوں پر محیط ہے سید جمال صرف چند سطروں میں بیان کر دیتے ہیں:

"شروع میں تمام علوم کا آغاز ہندوپاک سے ہوا۔ وہاں سے بابل اور بابل سے یہ علوم مصر منتقل کر دیئے گئے۔ پھر مصر سے انہیں روم و یونان روانہ کر دیا گیا۔ اس جابجائی میں ہر مرتبہ ان علوم میں ایک نئی حالت رونما ہوئی اور ہر سفر میں نئے انکشافات منصۂ شہود پر آئے۔ اگرچہ یونان و روم کے فلسفی ان علوم میں چند آراء اور محدود اقوال سے زیادہ کا اضافہ نہ کر سکے لیکن کیونکہ انہوں نے صراحت سے اپنے اساتذہ کا نام نہ لیا تو مسلمان دانشوروں کو یوں لگا جیسے وہ ہی اس کے اصلی صاحب اور موجد ہیں۔ اور انہی کے توسط سے یہ علم نیستی سے ہستی اور عدم سے معرض وجود میں آیا ہے۔ بعض مسلمان دانشوروں نے تقلید کے اسی تنگ دائرے میں رہ کر ان علوم پر چند اعتراضات اور طویل و بے فائدہ بحثوں کا اضافہ کر دیا۔"

علم کا یہ طویل سفر طے کرنے کے بعد جو ہزاروں سال پر محیط ہے' سید جمال مشرقی اقوام سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بغیر تفریق کے تمام علوم و فنون کی جانب توجہ دینا ہوگی۔ یہ ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جس میں ان کی ناکامی' شکستگی اور لاعلاج امراض کا علاج مضمر ہے۔ نیز دین و دنیا کی سعادت بھی تعلیم و تعلم کے مرہون منت ہے۔ "علم مسلمانوں اور مشرقی اقوام کی پسماندگی اور بیماریوں کا تنہا علاج ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کوئی قوم زندہ ہوتی ہے تو علم سے۔"

تعلیم و تعلم' فلسفہ و حکمت اور جدید و قدیم علوم پر سید جمال کے افکار کو ان کے مجموعہ مقالات "مقالات جمالیہ" اور جریدے "عروۃ الوثقی" سے لیا گیا ہے جو پیرس سے منتشر ہوتا تھا۔ اس ضمن میں ان کا ایک مقالہ "اسلام اور علم" بھی قابل ذکر ہے جسے انہوں نے فرانسیسی دانشور ارنسٹ رنان (Ernest Renan) کے جواب میں لکھا تھا۔ زیر نظر مقالہ میں ہم

مندرجہ ذیل چار عناوین کے تحت ان کے افکار پیش کر رہے ہیں۔

(ا)مادر علوم

(ب)جدید علوم

(ج)قومی زبان میں علوم کی اشاعت

(د)مسلمانوں کی علمی پسماندگی کے اسباب

(الف)مادر علوم

سید جمال الدین فلسفہ کو مادر علوم(علوم کی ماں) سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں فلسفہ یعنی حیوانیت و بربریت کی تنگ و تاریک گھاٹیوں سے نکل کر عقل' بصیرت اور دانائی کے دار السلام میں قدم رکھنا اور ظلم و تشدد و غارت سے نجات حاصل کر کے صحیح و کامل انسان بننا اور مقدس و پاکیزہ زندگی گزارنا۔ان کی نظر میں فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی عقل' اس کے نفس اور اس کی معیشت و اقتصاد میں کمال حاصل ہو۔ اس لیے کہ جب تک انسان کو زندگی کی ضروریات و سہولیات اور رفاہ فراہم نہیں کیا جائے گا اس کی عقل اور نفس ترقی کے مدراج طے نہیں کر سکتے اور حیوانیت و وحشیت سے نکل کر مدنیت(Civilizition)اور تہذیب(Culture) کے دائرہ میں قدم نہیں جما سکتے۔اسی بنا پر وہ انسانی معیشت اور رفاہ عامہ کو تمام علوم و دانش کی ایجاد کا منشاء سمجھتے ہیں(ضرورت ایجاد کی ماں ہے)۔اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنے کے لیے زراعت' باغبانی' پھلوں کی حفاظت' حیوانات سے صحیح استفادہ کرنے' نہر ندی و نالہ کے پانی کو مہار کرنے' کنویں کھودنے پل اور فلائی اوور تعمیر کرنے' سوت کاتنے کپڑا بننے' کنویں کھودنے اور دیدہ زیب عمارتیں تعمیر کرنے کا محتاج ہے جو انسانی زندگی کے شایان شان ہوں۔اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی صحت کی حفاظت کرے اور بیماریوں اور امراض کا معالجہ کرے۔اس مقصد کے حصول کے لیے انسان نے ان سب فنون سے متعلق معلومات کو اصول و قواعد اور قوانین کی صورت میں ایک خاص ترتیب سے جمع کر لیا اور یوں علم و دانش کا سنگ بنیاد رکھا۔مثال کے طور پر علم نباتات(Botany) حیاتیات(Biology) علم ریاضی' الجبرا' جیومیٹری اور علم طب و جراحات(Medicine or Surgery)اور فزیولوجی(Physiology)اور دواؤں کی ترکیب کا علم (Pharmacy)

تمام علوم و فنون کی پیدائش کا منشاء بیان کرنے کے بعد وہ عنان قلم کو ایک مرتبہ فلسفہ کی جانب پھیرتے ہیں اور فلسفہ کو ایک عام معنی میں لیتے ہوئے اس کی یہ اقسام بیان کرتے ہیں۔

☆...... فلسفۂ عقلیہ

☆...... فلسفۂ اخلاق

☆...... فلسفۂ تاریخ

☆...... فلسفۂ قانون

☆...... فلسفۂ اولیٰ و حکمت علیا

ان اقسام میں سے وہ فلسفہ اولیٰ و حکمت متعالیہ کو دراصل مادر علوم قرار دیتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فلسفہ اولیٰ وہ علم ہے جو حقیقی موجودات کے مختلف حالات کے بارے میں بحث و گفتگو کرتا ہے اور ان موجودات کے اسباب و علل اور لازم و ملزوم کو بیان کرتا ہے۔ فلسفہ اولیٰ یا حکمت متعالیہ سے سید جمال الدین کی مراد وہ علم ہے جو ارسطو اور سقراط سے شروع ہوتا ہے اور ابن سینا' فارابی' البیرونی اور شہاب الدین اشراقی سے ہوتا ہوا ملا صدر الدین شیرازی پر ختم ہوتا ہے۔ سید جمال فلسفہ کو تمام علوم و فنون کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک ایسے مرکز سے تشبیہ کرتے ہیں جس نے ان تمام علوم کو ایک دوسرے سے منسلک کیا ہو وہی مقام جو روح یا انسانی قلب کو تمام اعضاء کی بہ نسبت حاصل ہے۔

فلسفہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ یہ سطریں سپرد قلم کرتے ہیں:

"ہر علم کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے جس کے لوازم اور عوارض کے بارے میں وہ علم گفتگو کرتا ہے۔ مثال کے طور پر علم طبیعیات (Physics) جسم کی خصوصیات اور اس پر طاری ہونے والی کیفیات کو مورد نظر قرار دیتا ہے' علم کیمیا (Chemistry) اجسام کو تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اور اس حوالہ سے اجسام کا مطالعہ کرتا ہے اور علم نباتات (Botany) صرف پودوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اگر ہم غور و فکر کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی علم بھی دوسرے علوم سے علیحدہ ہو کر اور سب سے ہٹ کر نہ اپنی بقا کا ضامن بن سکتا ہے اور نہ ہی نوع انسانی کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر علم دوسرے علم سے اسی طرح ملا ہوا ہے جس طرح علم ریاضی جیومیٹری و ہندسہ سے۔ اور علوم کا ایک دوسرے کا محتاج ہونا خود اس علم سے سمجھا نہیں جا سکتا اسی لیے اگر اسے علیحدہ کر دیا جائے تو نہ اس میں ترقی ہوگی نہ پائیدار رہ پائے گا پس ایک ایسا علم ہونا چاہیے جو تمام علوم کی بہ نسبت اس روح کی مانند ہو جو بکھرے ہوئے اعضاء کی طرح ان علوم کو ایک جان اور ایک دوسرے سے منسلک کر دے تاکہ ان علوم میں استحکام و ثبات حاصل ہو سکے۔ نیز ان میں سے ہر ایک کو اس کے خاص موقع و مقام پر استعمال کیا جائے اور ہر علم کو ترقی دی جائے۔ اور وہ علم جو ان علوم کے لیے یکجا کرنے والی روح محافظ و

نگہبان اور ان کی بقا کا ضامن ہو وہ علم فلسفہ اولیٰ یا حکمت متعالیہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا موضوع ان سب سے زیادہ وسیع اور عام ہے۔ یہ فلسفہ ہوتا ہے جو انسان کو اس کے لوازمات کی نشاندہی کرتا ہے' علوم کی ضرورت کو آشکار کرتا ہے اور ہر علم کو اس کی مناسب جگہ استعمال کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اگر کسی قوم کے درمیان فلسفہ رائج نہ ہو اور اس قوم کے سارے افراد ان علوم پر حاوی ہوں جن کے موضوعات اور میدانات محدود ہیں تو ممکن نہیں کہ یہ علوم اس قوم کے درمیان ایک صدی تک بھی باقی رہ سکیں۔ اور محال ہے کہ فلسفی روح کے بغیر وہ قوم ان علوم سے فائدہ اٹھا پائے۔ خلافت عثمانیہ اور خدیو مصر کی حکومت ساٹھ سال سے اپنے تعلیمی مراکز میں جدید علوم پڑھا رہی ہے لیکن اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے تعلیمی مدارس و مراکز میں فلسفہ نہیں پڑھایا جاتا۔"

اس انداز میں سید جمال فلسفہ اولیٰ کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور اس کے موضوع اور محور کی غیر معمولی وسعت و شمولیت کے قائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفی ابحاث کا محور وہ تمام چیزیں ہیں جو ایک طرح کا وجود رکھتی ہوں اور واقعیت و حقیقت کی آئینہ دار ہوں یعنی وہم و خیال کی تراشیدہ نہ ہوں۔ اسی لیے فلسفہ ادنیٰ موجودات و جمادات سے لے کر واجب الوجود یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ تک کے بارے میں گفتگو اور بحث کرتا ہے جو کہ کائنات کا خالق اور وحدہ لاشریک ہے۔ فلسفہ کا ایک زاویہ یہ ہے کہ وہ دہریوں اور خدا کا انکار کرنے والوں کے سامنے عقلی دلائل کی روشنی میں باری تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات حسنہ کو ثابت کرتا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی جتنی بھی ترقی کر جائے حقائق و معانی کے اس سمندر میں جو کہ محسوسات اور مادیات سے ماوراء ہے. یعنی (Metaphysics) مابعد الطبیعیات میں اپنی عقل نہیں لڑا سکتا اور اس وسیع میدان میں قدم نہیں رکھ سکتا کیونکہ اس کا ایک خاص اور محدود دائرہ کار ہے۔ البتہ اس سے ان تجرباتی علوم کی اپنی اہمیت و افادیت کم نہیں ہوتی۔ سید جمال ایک باعمل انسان تھے چنانچہ ایک طویل عرصہ تک مصر میں اسلامی علوم کی جامعہ جامعہ الازہر میں فلسفہ کی تدریس کرتے رہے۔ اور دینی علوم کے طالب علموں کو فلسفہ کے حقائق اور جدید علوم سے آشنا کرتے رہے۔ وہ صرف فلسفہ کی تدریس و تعلیم پر زور نہیں دیتے بلکہ اس طریقہ کار کو بھی تنقید کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس میں فلسفہ اب بھی چند علمی حلقوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ چند مسلمان فلاسفرز اور ان کی کتابوں کو مورد تنقید قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کتابوں میں درج کیے گئے مطالب شاید و باید اور جس طرح سے کہ یونانی حکماء کے نزدیک واضح تھے ہمارے لیے واضح نہ ہو سکے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان فلاسفرز نے ان

مطالب کو اس طرح جلوہ دیا گویا کہ یہ غلطیوں سے مبرا اور نقائص سے منزہ ہیں۔ اور یوں نئے اذہان پر کیوں کیسے اور چوں وچرا (How & Why) کا دروازہ بند کر دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ روم و یونان کے حکما کی عقلیں کامل ہیں وہ مقدس کمالات اور سچے مکاشفات سے بر خوردار ہیں اور ان کے شعور و تفکرات کا افق دوسرے انسانوں سے کہیں بلند ہے۔ اس لیے وہ ان سے منسوب اقوال کو آسمانی وحی سمجھ کر اس کی اندھی تقلید کرنے لگے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں موجود بہت سی فلسفی ابحاث صابئین کے ان عقیدتی مسائل سے مخلوط ہو گئیں جو یونانیوں کے یہاں رائج تھے۔

فلسفہ اولیٰ اور حکمت متعالیہ کو بیان کرنے کے بعد سید جمال کا عنان قلم ایک مرتبہ فلسفۂ اخلاق کی جانب مڑ جاتا ہے اور حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے وہ اخلاق کی ضرورت پر یہ سطریں سپرد قلم کرتے ہیں:

"معیشت میں آرام اور زندگی میں رفاہ و آسائش حاصل کرنے کے بعد عقل ایک مرتبہ انسانی نفس کی جانب توجہ کرتی ہے اور اس نتیجہ تک پہنچتی ہے کہ اگر انسان معیشت میں کمال اور زندگی میں رفاہ حاصل کرلے لیکن اس کا اخلاق فاسد ہو جائے اور اگر وہ انسانی جسم کے لیے ہر طرح کی راحت و آسائش کا سامان اکٹھا بھی کرلے لیکن اس کا باطن اور اس کی روح بری صفات سے آلودہ ہو چکی ہو تو یہ گھاٹے کا سودا اور خسارے کا سامان ہے۔ اس لیے کہ جو شخص مشکلات وحادثات میں بزدل ہو، وہم وخیال کی تراشی ہوئی پریشانیاں اسے مضطرب و بے چین کر دیں، ختم نہ ہونے والی آرزوئیں اور خواہشات اسے اپنا غلام بنا چکی ہوں اور اسی طرح وہ حاسد جو دوسروں کی چیزوں پر نالاں ہو اور وہ غصہ ور جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر جل کر کباب بن جائے اور وہ کنجوس جو زندگی کی نعمتوں اور لذائذ سے محروم ہو اگر اس قسم کے لوگوں کے لیے زندگی کی سہولیات اور عیش و عشرت کے تمام سامان بھی فراہم کر دیے جائیں تو کیا وہ سکون اور آرام کی زندگی گزار پائیں گے۔ لہٰذا عقل انسانی نے فلسفہ کی بنیاد پر اچھے اخلاق اور نیک صفات کو برے اخلاق اور رذیلہ صفات سے علیحدہ کیا تاکہ خود کو اخلاق حمیدہ سے آراستہ کرے اور بری و ناپسند صفات سے جان چھڑائے اور اس طرح خود کو کمال تک پہنچا سکے۔"

(ب) جدید علوم

سید جمال الدین مسلمانوں کو جدید علوم پر عبور حاصل کرنے کی ترغیب بڑے زور و شور سے دیتے تھے۔ اگر وہ موجودہ دور میں ہوتے تو ایٹمی و نیوکلیئر توانائی حاصل کرنے اور

کمپیوٹر سائنس میں نام پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیتے۔ وہ عام ماہرین تعلیم کی طرح خالی مغربی طرز پر جدید علوم کی نشرواشاعت کے حامی نہ تھے بلکہ اس میدان میں خاص نظریات کے حامل تھے اور خاص شرائط و طریقہ کار کو مد نظر رکھ کر ان علوم کو پھیلانے کے خواہاں تھے۔ ان کی نظر میں اگر ان شرائط کا خیال نہ رکھا گیا تو ان علوم سے وہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا جو مغربی اقوام اٹھا رہی ہیں۔

جدید علوم کے بارے میں سید جمال کا موقف اس وقت واضح ہوتا ہے جب وہ سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہیں۔ انہیں دو تحریکوں کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک علیگڑھ کی تحریک اور دوسرے علمائے دیوبند۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے سیاسی زوال کو دیکھ کر سرسید نے جدید علوم کی تحریک چلائی' انگریزوں سے رواداری اختیار کی اور مسلمانوں کو انگریزی تہذیب اپنانے کی دعوت دی۔ مسلمانوں کو جہالت و غلامی اور تباہی و بربادی سے نکالنے کے لیے سرسید کو بہت سے اصولوں سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور ان میدانوں میں طبع آزمائی کرنا پڑی جن میں وہ مہارت نہ رکھتے تھے۔ دوسری طرف جب علمائے دیوبند نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی طرف بڑھتے دیکھا تو جدید علوم کے حصول کو بھی ناجائز اور حرام قرار دیا۔

سید جمال الدین نے نہ علیگڑھ تحریک کی طرح انگریزوں میں ضم ہو جانا صحیح سمجھا اور نہ علمائے دیوبند کی طرح جدید علوم پر حرمت کے فتوے لگائے بلکہ افراط و تفریط کی اس فضا میں علیگڑھ تحریک کی اصلاح اور اس کے نقائص کی نشاندہی کو اپنا اولین فرض قرار دیا۔

جدید علوم کے بارے میں سید جمال کے افکار کو ہم مندرجہ ذیل چار نکات کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

(۱) مغربی علوم یا مغربی تہذیب
(۲) آداب و اطوار پر توجہ
(۳) علم کے ذرائع
(۴) علم و ایمان ساتھ ساتھ

(۱) مغربی علوم یا مغربی تہذیب......؟

مغربی تہذیب کے جراثیم کو سید جمال عالم اسلام و مشرقی اقوام کی سالمیت کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ وہ جدید علوم کی ضرورت پر زور دیتے ہیں لیکن جدید علوم اور جدید تہذیب میں تفریق کے قائل ہیں۔ یوں وہ جدید علوم کے محصلین کو خبردار کرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ ان علوم

کو حاصل کرتے کرتے وہ مغربی تہذیب کے جال میں پھنس جائیں۔ وہ اس حقیقت کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اگر جدید علوم حاصل کرنے والوں نے شروع سے اس نکتہ کی طرف توجہ دی ہوتی تو نہ ان کا اسلامی تشخص خطرے میں پڑتا اور نہ ہی دیندار طبقہ ان علوم سے متنفر ہوتا۔

"اگر مغربی تہذیب مشرقی اقوام میں سے کسی ایک کے درمیان پھیلادی جائے تو یہ اس دروازے کی مانند ہوتی ہے جس سے اس قوم کے درمیان پھوٹ ڈالی جاسکتی ہے اور ان میں تفرقہ واختلاف کا بیج بویا جاسکتا ہے۔ یوں بیرونی اقوام کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ہے کہ وہ انسان دوستی اور نصیحت واصلاح کے لباس میں چھپ کر وارد ہوں اور یوں جدید تہذیب کے یہ علمبردار اپنی قوم کو گراوٹ کی طرف لے جاتے ہیں۔"

اس ضمن میں سید جمال اپنے مزید مشاہدات کو ذیل میں دی گئی سطور کی صورت میں بیان کرتے ہیں:

"باہر کے تعلیم یافتہ افراد نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ انہوں نے باہر پڑھا ہے اسے (آنکھیں بند کر کے) اپنے ملک میں پھیلائیں۔ نتیجتاً انہوں نے اپنے ملک کی اخلاقی بنیادیں اور طور طریقے بھی بدل دیئے نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ خوردونوش کی اشیاء' لباس و پوشاک کے طرز گھر کی آرائش وسجاوٹ کے طور طریقے اور گھریلو استعمال کے برتنوں میں بھی تبدیلی لائی گئی۔ اس دوڑ میں یہ لوگ یورپ سے بھی آگے نکل گئے اور ان کاموں کو اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگے۔ نیز ان کی نمودونمائش کر کے اپنی قوم کے لوگوں پر برتری جھاڑنے لگے حالانکہ یہ نادان اس سے غافل تھے کہ ایسا کر کے انہوں نے اپنا قومی اثاثہ تو دوسرے ملکوں کی نذر کر دیا اور بدلے میں چمک دمک کی کچھ چیزیں لے لیں جن میں شوشا تو ہے تاہم نہ یہ پائیدار ہیں اور نہ ان کی کوئی خاص افادیت ہے۔"

(۲) آداب واطوار پر توجہ

ایک تجربہ کار اور کامیاب ماہر تعلیم کی حیثیت سے سید جمال ایسے لائق وبابصیرت افراد کا وجود ضروری سمجھتے ہیں جنہوں نے اپنے حافظہ میں صرف جدید معلومات کا ذخیرہ نہ بھر لیا ہو بلکہ یورپی ماہرین تعلیم کی طرح یہ لوگ ان علوم کی گہرائیوں میں اتر چکے ہوں اور ان کے راز و رموز سے واقف ہوگئے ہوں۔ جدید علوم کی اشاعت سے قبل وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے مغربی اقوام کے آداب واطوار کا بھرپور جائزہ لیا جائے پھر جس معاشرے میں ان علوم کو پھیلانا ہو وہاں کے لوگوں کے اخلاق وآداب' طرز رہن سہن اور سیاسی وسماجی حالات پر گہرا مطالعہ

کیا جائے تب کہیں جا کر لوگوں کی طبیعت و مزاج کی مطابقت سے خاص انداز میں ان علوم کی اشاعت کی جائے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے تعلیمی نظام کی بے تحاشا مثالیں مل جائیں گی جہاں اس نکتہ سے غفلیت برتی گئی ہے۔ اب بھی ہمارے ملک و شہر میں سینکڑوں آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز کے اسکول کالج ہیں جن میں ہمارے وطن کے نونہالوں کو وہ معانی اور مفاہیم سکھائے جاتے ہیں اور ان ناموں اور اصطلاحات کی تعلیم دی جاتی ہے یعنی ایک ایسی تہذیب کی جھلک دکھائی جاتی ہے جس سے وہ یکسر نامانوس ہوتے ہیں اور اس کی مثال بھی ان کے معاشرے و ماحول میں نہیں ملتی۔ پھر جب وہ ٹومی' جیک اینڈ جل(Tomy, Jack & Jill) جیسی چیزوں سے انس پیدا کرتے ہیں تو اپنی تہذیب و تمدن سے اتنا ہی دور ہونے لگتے ہیں۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صرف اسی وجہ سے وہ تعلیم میں اتنی ترقی اور کمال حاصل نہیں کر پاتے جتنا کہ اسے حاصل کرنے کی صلاحیت و قابلیت رکھتے تھے۔ سید جمال الدین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"وہ لوگ کیا کر سکیں گے جنہوں نے جدید علوم کو سطحی طور پر حاصل کیا ہے اور ان کے دل ان علوم کا سرچشمہ نہیں ہیں' اگرچہ یہ لوگ وطن کی خدمت کرنے میں سچے ہی کیوں نہ ہوں.....! انہوں نے ان علوم کو جس طرح سیکھا اور پڑھا ہے اسی طرح آنکھیں بند کر کے دوسروں تک منتقل کر دیتے ہیں۔ نہ اپنی قوم کی عادات اور اطوار کی جانب کوئی توجہ دیتے ہیں' نہ ان علوم کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنا جانتے ہیں اور نہ ہی ان علوم کی تاریخ اور ان کے ماضی و حال سے واقف ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ان علوم کا مرکز نہیں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ معلومات کا جو ذخیرہ انہوں نے جمع کر لیا ہے اسے عام انسانی جانوں کے لیے کمال اور ہر ذی روح کے لیے زندگی و حیات سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہیں صرف اپنی معلومات اور تصورات کی حد تک محدود رہتی ہیں اور ہرگز یہ نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں کو یہ علوم سکھانا چاہتے ہیں' وہ کتنی صلاحیت اور استعداد سے برخوردار ہیں۔ اور کیا ان علوم کو پھیلا کر وہ لوگوں میں اپنا نام پیدا کر سکیں گے اور کیا ان علوم کو وہ مزید وسعت دے سکتے ہیں......؟ اس قسم کے سوالات ہمیشہ ان لوگوں کے ذہنوں میں اٹھتے رہتے ہیں کیونکہ یہ ان علوم کے بانی اور اصلی صاحبان میں سے نہیں ہیں بلکہ صرف اسے لادنے والے اور دوسروں تک منتقل کرنے والے ہیں۔ اپنی قوم کے لیے یہ لوگ اس زہر قاتل کی مانند ہیں جن کے ذریعہ سے اس قوم کے اتحاد اور یکجہتی کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اس قوم کا شیرازہ بکھیرا جا سکتا ہے۔"

(۳) علم کے ذرائع

سید جمال ایک طویل عرصہ تک اسلامی علوم کے مآخذ ومدارک کو کھنگالتے رہے۔ انہوں نے فلسفہ، حکمت وریاضی میں ید طولیٰ حاصل کیا اور سرزمین ہند میں جدید علوم کو بھی پڑھا۔ اور جب وہ تمام علوم پر عبور حاصل کر چکے اور اقوام عالم کے عروج وزوال کی داستان اور زندگی کی کتاب کے بہت سے اوراق پڑھ چکے تو ہر شعبہ حیات میں ان کی رائے بہت وزنی ہو گئی۔ وہ مغرب کی اس روش سے اتفاق نظر نہیں رکھتے تھے جس میں صرف تجربہ (Experiment) کو تمام اکتشافات اور ایجادات کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے وہ البیرونی کے نقطہ نظر کو سامنے لاتے ہیں اور مشرقی اقوام کو مشورہ دیتے ہیں کہ تجربہ کے ساتھ وہ علم کے دوسرے ذرائع بھی بروئے کار لائیں:

"دور حاضر میں جو کہ ایک نیا دور ہے، جدید علوم کے پیروکاروں نے فطرت کے مطالعہ کے لیے ایک نیا طریقہ کار وضع کیا ہے۔ یہ لوگ صرف اسی طریقہ کار کو تنہا راستہ اور حل سمجھتے ہیں حالانکہ اسلامی علوم میں جیساکہ البیرونی کے بارے میں اس چیز کو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، کتاب فطرت کی ورق گردانی کے لیے صرف ایک طریقہ وضع نہیں کیا بلکہ تجربہ مشاہدہ (Observation) استدلال واستنباط، گذشتگان کے مدراک اور آسمانی کتب میں غور وفکر، ان میں سے ہر ایک کائنات کی پیدائش اور اس کی خلقت کی کیفیت کے بارے میں علم حاصل کرنے کا ایک علیحدہ راستہ ہے۔ نیز جو جوابات فطرت فطرت شناس کو دیتی ہے وہ ان سوالات پر منحصر ہیں جنہیں وہ دانشور فطرت کے سامنے رکھتا ہے اور اس پر کہ ان سوالات کو کس انداز میں پیش کرتا ہے۔ نیز جو نتائج وہ تجربہ یا مشاہدہ سے حاصل کرتا ہے وہ اسی وقت معقول ہو سکتے ہیں جب انہیں اپنے تفکرات کے پیکر میں شامل کر لیا جائے۔ البیرونی کے بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ کائنات کے بارے میں اس کے افکار کا مجموعہ اسلامی افکار کا پیکر ہے۔"

(۴) علم وایمان ساتھ ساتھ

سید جمال یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں جدید علوم کو اسی صورت میں ترقی دی جاسکتی ہے کہ انہیں مذہب اور ایمان سے الگ نہ کیا جائے۔ وہ مذہب کو ہرگز علم کا مخالف نہیں سمجھتے اور تمام ادیان کے مقابلہ میں سب سے زیادہ دین اسلام کو علم کا حامی وپشت پناہ قرار دیتے ہیں۔ وہ مذہبی اقدار کو بے جا رسومات، فرسودہ روایات اور باپ دادا کی اندھی تقلید سے علیحدہ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ جدید علوم کی مخالفت کو اسلامی اصولوں کے

خلاف قرار دیتے ہیں۔ یوں اس طرز فکر کے جامد مولویوں کی اسلام سے لاعلمی کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ہمارے علماء علم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا علم ہے اور دوسرے کے بارے میں کہ یہ فرنگیوں کا علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کو بہت سے مفید علوم سیکھنے اور سکھانے سے روکتے ہیں اور اس پر غور و فکر نہیں کرتے کہ علم وہ باعزت چیز ہے جسے کسی گروہ سے نسبت نہیں دی جاتی۔ علم کسی اور کے حوالہ سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ اگر دنیا میں کسی چیز کو شہرت حاصل ہوتی ہے تو علم کی بدولت اور اگر کچھ لوگ نام پیدا کرتے ہیں تو علم کے بل بوتے پر! انسانوں کو علم سے منسوب کرنا چاہیے نہ علم کو خاص قسم کے افراد میں محدود کر دیا جائے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ مسلمان ان علوم کو تو ذوق و شوق سے حاصل کریں جو ارسطو سے منسوب ہوں گویا کہ ارسطو مسلمان تھا لیکن جیسے ہی کسی چیز کو گالیلہ نیوٹن اور کپلر سے نسبت دی جائے تو اسے کفر سمجھنے لگیں۔ علم کا ماں باپ دلیل و منطق ہے نہ ارسطو نہ گالیلہ!"

(ج) قومی زبان میں علوم کی اشاعت

فلسفہ و حکمت ہو یا جدید علوم سید جمال الدین اس نقطہ نظر کے قائل ہیں کہ جب تک ان علوم و فنون، صنعت و حرفت اور معاشرے میں رائج پیشوں کے بارے میں ضروری اصطلاحات و روز مرہ کا ایک وافر ذخیرہ قومی زبان میں نہ ہو گا اس وقت تک وہ زبان عرصہ دراز تک باقی نہیں رہ سکتی۔ وہ صرف نقائص کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ راہ حل بھی تجویز کرتے ہیں اور قومی زبان پر مبنی ان کا یہ فارمولا با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ قومیت کی اساس پر گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"قوم سے وابستگی فخر کے قابل ہے بشرطیکہ وہ قوم عزت و شرافت رکھتی ہو اور شرافت مل نہیں سکتی مگر علم و دانش کے دروازے سے اور علم و دانش اس وقت ایک قوم کے لیے باعث عزت بنتا ہے جب اسے عام کر دیا جائے اور ممکن نہیں کہ علم کو معاشرے کی سطح پر عام کر دیا جائے مگر یہ کہ وہ لوگوں کی اپنی زبان میں ہو۔"

سید جمال اس کے قائل ہیں کہ معاشرے کی نچلی سطح کے لوگوں کو اعلیٰ سطح کے افراد کے علوم و فنون اور ہنر و پیشہ سے مختصر واقفیت ضرور ہونی چاہیے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ معاشرے کے نچلے طبقات کا پیشہ اعلیٰ سطح کے افراد کے پیشہ اور صنعت و حرفت سے منسلک ہوتا ہے یعنی دونوں میں ایک رابطہ ضرور پایا جاتا ہے۔ لہٰذا جب تک نچلی سطح کے لوگ اور محروم

طبقات ان علوم سے مختصر آشنائی حاصل نہیں کریں گے ان علوم اور صنائع میں چنداں ترقی حاصل نہ ہو گی۔ نہ اس قوم کی بنیادیں مستحکم ہو پائیں گی اور نہ ہی اس کی صفوں اور مختلف طبقات میں اتحاد و یکجہتی برقرار رہ سکے گی۔ وجہ یہ ہے کہ مدنیت کے قوانین (Laws of civilization) میں یہ اصول محفوظ ہے کہ معاشرے کے ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے ہنر و پیشہ اور ذخیرۂ معلومات سے مختصر طور پر واقف ہونا چاہیے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک تمام علوم وفنون اور مختلف صناعتوں کا وافر ذخیرہ معاشرے کے ان طبقات کی علاقائی اور قومی زبان میں نہ ہو۔ ہندوستان میں وہ اس کمی کا احساس کرتے ہوئے ہندو پاک کے دانشوروں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں:

''کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ پوری دنیا میں جدید علوم کا چرچا ہو اور نت نئی ایجادات نے کرۂ ارض کو گھیر لیا ہو اس کے باوجود بھی ہندوستان کی زبان میں اس ضمن میں کوئی قابل ذکر ذخیرہ نہ ہو۔ کیا یہاں کے لوگ اس حقیقت سے غافل ہو گئے ہیں کہ اقوام عالم میں سے کسی قوم کے پاس جب تک اپنی زبان میں مدنیت (Civilization) پر مفید علوم کا وافر ذخیرہ نہ ہو گا اس وقت تک وہ قوم ثابت و پابر جا باقی نہیں رہ سکتی۔ پس جدید علوم کو ملکی زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی خصوصاً اردو زبان میں جو یہاں کے عام باشندوں کی زبان ہے؟ اور اس زبان کو وسعت دینے کے لیے اس سے ملتی جلتی زبانوں سنسکرت، مرہٹی اور بنگالی سے مدد کیوں نہیں لی جاتی...... ؟ اور اسے تکامل دینے کے لیے بوقت ضرورت انگریزی زبان سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا جاتا...... ؟

مغرب زدہ دانشوروں سے خطاب کر کے سید جمال کہتے ہیں: کیا یہ بھی ان کے لیے فخر کا مقام ہے کہ اقوام عالم کی زبانوں میں ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ جمع کریں لیکن قومی زبان میں ان کے پاس ایک بھی وزنی کتاب نہ ہو!''

سید جمال اس ضمن میں اپنی آراء کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تعلیم و تعلم یعنی علوم و دانش اور صنعت و حرفت کی منتقلی اور افہام و تفہیم ایک قوم کی مقامی زبان میں ہونی چاہیے تاکہ وہاں کے لوگوں کا قومی تشخص استوار ہو سکے...... بہ الفاظ دیگر اگر علوم وفنون اور صنائع ایک قوم کی اپنی زبان میں ہوں گے تو ان علوم کی بنیادیں اس قوم کے درمیان گہری ہوتی چلی جائیں گی اور ایک عرصۂ دراز تک یہ علوم مٹائے نہ مٹیں گے۔ ان کے پوتے پر پوتے اور آئندہ نسلیں باپ دادا کی کتابوں اور تصانیف سے فائدہ اٹھا کر ان علوم کو دوبارہ سے زندہ کر دیں گی اور ان میں ایک نئی رمق ڈال کر ایک نئی عزت و شرف سے خود کو آراستہ

کریں گی اس کے باوجود کہ ان علوم کے صاحبان اصلی مرحوم ہو چکے ہوں گے اور ان کا وجود بھی باقی نہ رہا ہوگا۔ پھر اگر تعلیم و تعلم قومی زبان میں ہو تو اس قوم کے بچوں کے لیے ان علوم کا حاصل کرنا آسان ہوتا ہے اور ذہنوں میں علم کا نقش گہرا اور پائیدار ہوتا ہے۔ اس طرح عقلیں زیادہ تیزی سے اس علم کی جزئیات اور گہرائیوں کو سمجھ سکیں گی اور ان کے علوم کے طلاب زیادہ تنومندی سے مسائل کی تہہ تک پہنچ پائیں گے۔ اور یہ خود اس کا باعث بنے گا کہ دانشور ہنر پیشہ اور علم رکھنے والے افراد کی تعداد قوم کے درمیان بڑھ جائے گی اور سعادت کے دروازے اس قوم کے تمام افراد کے لیے کھل جائیں گے۔"

آخر میں وہ ہندوپاک کے دانشوروں اور سنجیدہ لوگوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دنیا کی زندہ زبانوں پر عبور حاصل کریں اور علوم وفنون پر دسترس حاصل کرنے کے بعد انہیں قومی' علاقائی زبان میں ترجمہ کریں۔ صرف اسی صورت میں مدنیت کے اصولوں کو اپنا کر وہ اپنا قومی تشخص اور ملکی وقار باقی رکھ سکتے ہیں۔

(د) مسلمانوں کی علمی پسماندگی کے اسباب

مسلمانوں کو تعلیم و تعلم کی عام طور سے جو ترغیب دی جاتی ہے وہ اتنی مؤثر ثابت نہیں ہو پاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے درخشاں ماضی سے ناواقف ہیں اور ان اسباب و عوامل سے بے خبر ہیں جن کی وجہ سے وہ علم' سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لاعلمی کی وجہ سے انہیں لاشعوری طور پر یہ باور ہو گیا ہے کہ جہالت و نادانی اور علمی پسماندگی ان کا مقدر ہے۔ لہٰذا جب تک انحطاط کے ان عوامل پر روشنی نہیں ڈالی جائے گی اس وقت تک کوئی اصلاحی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سید جمال الدین نے عام ماہرین تعلیم کی طرح صرف تعلیم و تعلم پر نظریئے قائم نہیں کیے بلکہ مسلمان قوم کے ایک شفیق' جہاندیدہ اور تجربہ کار باپ کی حیثیت سے' جو مسلمانوں کے درخشاں ماضی اور ابتر حال کو قریب سے دیکھ چکا ہو اور اقوام عالم کے عروج و زوال کی کتاب پڑھ چکا ہو' ضروری سمجھا کہ تعلیم و تعلم کے جامع اصول بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان وجوہات کی نشاندہی بھی کی جائے جن کے باعث مسلمان علم و صنعت کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ اس حقیقت پر سچا ایمان رکھتے ہیں کہ اگر ارتقاء کی راہ میں کھڑی کی گئی ان رکاوٹوں کو برطرف کر دیا جائے اور ان کی نشاندہی کرانے کے بعد ان دیواروں کو گرا دیا جائے تو مسلمان پھر سے اپنی کھوئی ہوئی عزت و عظمت بحال کر سکتے ہیں اور ترقی یافتہ اقوام کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔

بہر صورت مسلمانوں کے علمی انحطاط کے بارے میں سید جمال کے افکار کو چھ نکات کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) فلسفی روح کا فقدان

(۲) اسلاف پر فخر و مباہات

(۳) اندرونی اختلافات

(۴) دینی تعصب

(۵) دینی مدارس کی اصلاح

(۶) علم و اہل علم کی ناقدری

(۱) فلسفی روح کا فقدان

سید جمال فلسفی روح کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس سے پہلے کہ فلسفی روح کی وضاحت کی جائے ہم اپنے مخاطبین کے سامنے فلسفی روح سے متعلق ان کا یہ کلیہ پیش کر رہے ہیں:

"جو قوم بھی انحطاط کی طرف بڑھی ہے سب سے پہلا نقص اس کی فلسفی روح میں حاصل ہوا ہے۔ اس کے بعد یہ نقص آہستہ آہستہ تمام علوم و فنون اور طرز معاشرت میں سرایت کرتا چلا گیا ہے۔" اس کلیہ کی مزید وضاحت کے لیے وہ صدر اسلام کے مسلمانوں کی مثال پیش کرتے ہیں:

"صدر اسلام کے مسلمان کسی علم سے آشنا نہ تھے لیکن اسلامی دیانتداری کے نتیجہ میں اُن کے اندر ایک فلسفی روح پیدا ہو گئی تھی۔ اس فلسفی روح کی وجہ سے انہوں نے کائنات کے رموز اور انسانی خلقت کے بارے میں غور و فکر کا آغاز کیا اور بعد کے ادوار میں یعنی منصور دوانیقی کے زمانہ میں سریانی' فارسی اور یونانی زبانوں سے عربی زبان میں ان علوم کو منتقل کیا۔ بعد ازاں بہت کم عرصہ میں ان کا شمار ان علوم کے ماہرین میں ہونے لگا۔"

فلسفی روح سے سید جمال کی مراد ایک خاص طرز فکر ہے جس میں ہر کام کو عقل و منطق کے دائرے میں پرکھا جاتا ہے اور ہر چیز کو اس کے مقصد' نتیجہ اور افادیت کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ فلسفی روح فکری جمود' شخصیت پرستی اور اسلاف کی اندھی تقلید کے بالکل متضاد ایک حقیقت ہے۔ یہ حقیقت ہر چیز کے بارے میں کیوں اور کیسے (How or why) کے سوالات اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ فلسفی روح جب مذہب میں داخل ہوتی ہے تو اسے غلط عقیدے' بے جا رسومات' فرسودہ روایات اور بدعتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور جب ناپید ہونے لگتی ہے تو

مذہبی اقدار کی جگہ رسم ورسومات لے لیتی ہیں۔ اور یہاں آکر سید جمال کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ صدر اسلام کے مسلمانوں کے برخلاف اب مسلمان تنگ نظری' مذہبی ولسانی تعصبات اور فکری جمود کا شکار ہو گئے ہیں اور اپنے اسلاف اور علماء کی چیزوں کو ناقدانہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے اور اس پر غور وفکر کرنے اور ان اقوال وکلمات کو ترقی دینے کے بجائے آسمانی کتاب کی طرح انہیں قبول کیے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح جب وہ فلسفی روح کو جدید علوم سے منسلک کرتے ہیں تو خلافت عثمانیہ اور خدیو مصر پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں جنہوں نے سالہاسال جدید علوم کو پڑھایا لیکن اسی فلسفی روح کے فقدان کی وجہ سے وہ ان علوم سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے اور ان علوم میں بے نیاز نہیں ہو سکے۔ اس لیے کہ اگر ان کی نیاز برطرف ہو چکی ہوتی تو نہ انہیں اپنی اولاد کو باہر بھیجنا پڑتا اور نہ اپنے تعلیمی مراکز کے لیے باہر سے استاد بلوانا پڑتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفی روح ایک غیر معمولی وسعت سے برخوردار ہے جو دین کے تمام مسائل سے لے کر جدید علوم اور ٹیکنالوجی تک تمام چیزوں میں شامل ہو سکتی ہے اور انہیں اپنا میدان بنا سکتی ہے۔

(۲) اسلاف پر فخر ومباہات

سید جمال اس تلخ حقیقت پر سے پردہ ہٹانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب مسلمانوں کو اپنے سامنے ایک تاریک اور بھیانک مستقبل دکھائی دیتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرنے اور اس کی اصلاح کے بجائے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ماضی کے شاندار راگ الاپنے لگتے ہیں۔ یہ ماضی انہیں کبھی بھی حقیقت کی طرف دیکھنے اور اصلاح احوال پر نظر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ گو یہ گلہ سر سید احمد خان کو بھی مسلمانان ہند سے تھا لیکن سید جمال کے الفاظ اس ضمن میں یوں ہیں:

"مسلمانوں کی اس طرح پرورش کی گئی ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ انسان بن جاؤ تو وہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا ایسے تھے اور ویسے تھے۔ یہ لوگ اس خیال میں جیتے ہیں کہ ان کے باپ دادا کیسے زندگی گزارتے تھے اور یہ نہیں سوچتے کہ باپ دادا کے نام نشان سے وہ اپنی گمنامی وپسماندگی کا علاج نہیں کر سکتے۔"

(۳) اندرونی اختلافات

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات' جھگڑے' گروہ بازیاں اور دھڑے بندیاں چاہے فرقہ واریت کے نام سے ہوں یا قومیت ولسانیت کے عنوان سے' ایک طویل عرصہ سے ان کے علمی انحطاط کا سبب بنی ہیں۔ وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ

خلفائے راشدین کے بعد سے اسلامی مرکز کمزور ہوتا چلا گیا' دین سیاست سے الگ کر دیا گیا اور مسلمانوں کی خلافت کے ٹکڑے ہونے کے نتیجہ میں مختلف حکام ان کے سروں پر مسلط ہو گئے۔ ان حکمرانوں نے اپنا اقتدار باقی رکھنے کے لیے ایک خطے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو دوسری جگہ کے مسلمانوں سے لڑوایا۔ اور اسی وقت سے مسلمان اجتماعی اور معاشرتی لحاظ سے کمزور ہو چکے تھے اور پھر ان کے شہر اندرونی اختلافات' فرقہ گرائی اور ایک دوسرے کے خلاف لڑائی کی آماجگاہ بن چکے تھے۔ سید جمال اپنے خطاب میں ان حکام پر سخت تنقید کرتے ہیں اور انہیں اس انتشار کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ جرثومہ اتنا پھیلے گا کہ پوری مسلمان قوم کے لیے ناسور بن جائے گا اور درباری و نادان ملا بھی اس میدان میں کود پڑیں گے۔ یہ لوگ توحید و رسالت کا کلمہ پڑھنے والوں کو کافر ٹھہرا کر ان کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیں گے مسجدیں جلیں گی' گھر ویران ہوں گے' قرآن کریم کی بے حرمتی ہوگی' آپس میں قتل و غارتگری کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور یوں یہ نیم ملا امت مسلمہ کے اتحاد و یکجہتی کو تار تار کر دیں گے اور پھر سے مسلمانوں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا مشکل ہو جائے گا۔

"ان حکام اور اقتدار کے ایوان میں بیٹھنے والوں نے اپنی قوم کے مسلمانوں کو دوسری قوم سے لڑنے پر راغب کیا اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے دشمنی و تشدد کے تمام حربے استعمال کیے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات اور آپس کے جھگڑے وہ واحد سبب ہے جس نے انہیں سائنس و ٹیکنالوجی سے دور کر دیا اور بات یہاں تک جا پہنچی کہ مسلمان اس ٹیکنالوجی کے حصول میں بھی سستی دکھانے لگے جو ان کے پاس نہ تھی۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم و تعلم یعنی علم سیکھنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں جب تک اس جذبہ ایمانی سے کام نہ لیا جائے گا کہ کلاشنکوف کی صداؤں اور فتنہ و فساد کے شور و غل میں بھی علم کے سفر کو جاری رکھا جائے اس وقت تک تعلیم کو عام کرنا خاصا مشکل ثابت ہوگا۔

(۴) دینی حمیت

سید جمال الدین بذات خود ایک باعمل انسان اور سچے مسلمان تھے۔ وہ اسلامی اقدار کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور پوری دنیا کے سامنے مختلف دلائل کے ذریعہ ان کی حقانیت ثابت کرتے تھے اور آخری دم تک ان کا دفاع کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جدید تہذیب و تمدن کے طرفداروں پر شدید اعتراض کیا کہ ان میں دین کی حمایت و غیرت کا جذبہ نہیں پایا جاتا اور وہ اصولوں سے سمجھوتہ کرتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود سید جمال دینی حمیت اور دینی تعصب

کو ہر موقع اور مقام پر استعمال کرنے کے سخت خلاف تھے اور اس ضمن میں مسلمانانِ ہند پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے جن کی دینی حمیت اور دینی تعصب اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ علم و دانش سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں۔ اپنے خطاب میں وہ فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے مسلمانوں نے دینی حمایت کے جذبے یعنی دینی تعصب کو بہت بے جا اور غلط انداز سے استعمال کیا ہے وہ اس تعصب کو یہاں تک لے گئے ہیں کہ علم و دانش اور سائنس و ٹیکنالوجی سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر اس چیز سے نفرت کرنی چاہیے جو بے دین لوگوں سے منسوب ہو حالانکہ دینی تعصب کی رو سے یہ ان کا فرض تھا کہ جہاں بھی کوئی کمال و فضیلت یا علم و ہنر نظر آتا وہ دوسروں سے زیادہ خود کو اس کا مستحق ٹھہراتے اور اس کے حصول میں اس حد تک جدوجہد کرتے کہ اسلام دشمن عناصر فضیلت و کمال کے کسی میدان میں بھی ان پر سبقت حاصل نہ کر پاتے...... افسوس! صد افسوس کہ یہ دینی حمیت پسماندگی کی طرف لے جائے اور میں ڈرتا ہوں کہ یہ دینی تعصب اس حد تک پہنچ جائے کہ اس خطہ کے مسلمان صرف اس لیے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں کہ اس دنیا میں اسلام دشمن طاقتیں بستی ہیں۔"

(۵) دینی مدارس کی اصلاح

سید جمال الدین جانتے تھے کہ اسلامی معاشروں میں کسی قسم کی تحریک چلانے کے لیے دیندار طبقے کی حمایت اور علماء کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ دینی مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب میں وسیع پیمانہ پر اصلاحات کے قائل تھے۔ البرٹ ہال کلکتہ میں تعلیم و تعلم پر دیئے گئے لیکچر میں انہوں نے دینی مدارس کے اساتذہ و طلبا پر کڑی نکتہ چینی کی کہ وہ جدید علوم کی جانب توجہ نہیں دیتے اور صرف رائج علوم کو جو پہلے سے چلے آرہے ہیں کافی سمجھتے ہیں۔ سید جمال نے بذاتِ خود مصر میں دینی علوم کی جامعہ جامعۃ الازہر میں ایک طویل عرصہ تک فلسفہ و ریاضی کی تدریس کی۔ وہ دنیا کا گلوب لے کر جاتے اور دینی طلاب کو مختلف ملکوں کی جغرافیائی حدود دکھاتے اور مختلف علوم سے آشنا کرتے۔ ان کی ان اصلاحات پر مصر کے مقدس نما اور رجعت پسند علماء کی طرف سے شدید اعتراض ہوا لیکن انہوں نے اس وقت تک اپنا جہاد جاری رکھا جب تک کہ انہیں مصر سے جلاوطن نہیں کیا گیا۔

اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ صرف ہمارے ملک پاکستان میں ایسے ہزاروں بلکہ لاکھوں طالب علم ہیں جو دینی مدارس و مساجد سے وابستہ ہیں۔ صرف پنجاب میں دینی مدارس کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ نچلی سطح پر ان طالب علموں اور مستقبل کے مولویوں کو قرآن کریم،

ناظرہ' حفظ اور حدیث و وعظ کی مختصر تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اعلیٰ سطح پر عربی ادب اور فقہ وحدیث جیسے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر دینی مدراس کے نظام و نصاب میں ایک بہتر تبدیلی لائی جائے اور آئندہ کے ان مفتی اور علماء حضرات کے لیے انگریزی و فرانسیسی زبان اور معاشرتی و جدید علوم کا ایک محدود کورس لازمی قرار دے دیا جائے تو کسی بڑی سرمایہ کاری کے بغیر معاشرے میں تعلیم کی سطح اور شرح خواندگی میں بڑی تبدیلی لائی جاسکتی ہے اور اس مذہبی منافرت' فرقہ گرائی اور مذہبی تشدد کی روک تھام کی جاسکتی ہے جو در حقیقت جہالت و نادانی اور جدید علوم سے عدم واقفیت کی صورت میں وجود میں آئے ہیں۔ اور جب تک اس بارے میں کوئی لائحہ عمل طے نہ کیا جائے گا اس وقت تک دین و دنیا کا یہ تضاد اور فرقہ واریت کا یہ طوفان اپنی شدومد سے جاری وساری رہے گا۔ اس ضمن میں شید جمال کی تحریر کردہ مندرجہ ذیل سطریں قابل ذکر ہیں:

"علم کا ماں باپ دلیل اور منطق ہے۔ نہ ارسطو (Aristotle) نہ گالیلہ (Galileo)۔ حق وہاں ہے جہاں منطق ہو دلیل ہو عقل ہو اور جو لوگ اس زعم میں علم و دانش کی مخالفت کرتے ہیں کہ دینداری کو باقی رکھ سکیں در حقیقت وہ خود دینداری کے دشمن ہیں۔ تمام ادیان میں صرف دین اسلام ہے جو علم و دانش سے زیادہ نزدیک ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اسلامی دیانت اور علم و فن کی بنیادوں میں کسی طرح کا تصادم نہیں پایا جاتا۔ اسلام کی نمایاں و برجستہ شخصیت امام غزالی اپنی تصنیف "منقذ الضلال" میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ دیندار ہونا ریاضی کے اصول' فلسفی دلائل اور قوانین فطرت کے خلاف ہے تو وہ اسلام کا نادان دوست ہے۔ اسلام کے اس نادان دوست کا خطرہ ملحدوں اور اسلام دشمن عناصر سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے کہ یہ اصول و قاعدے واضحات اور بدیہیات میں سے ہیں۔ پس اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا دین بدیہی اشیاء کے خلاف ہے تو اس نے خود اپنے دین کے باطل ہونے کا اذعان کر لیا ہے۔"

(۶) علم اور اہل علم کی ناقدری

سید جمال الدین اس کے قائل ہیں کہ ہماری شکستگی اور زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے علم و صنعت' تجارت و حرفت اور ہنر کی اتنی عزت افزائی نہیں کی جتنا کرنا چاہیے تھا۔ ہم علم و دانش' ٹیکنالوجی و ریسرچ اور تحقیق کو ایک بیکار' بیہودہ اور بے مقصد چیز سمجھتے ہیں اور اہل علم' دانشور طبقے ہنر پیشہ افراد اور صاحبان فن کی عظمت کو سلام نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہزار حیف اور صد افسوس کے بعد حال حاضر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرقی اقوام کے

فقر و فاقہ' ذلت و رسوائی اور ناداری کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ صاحبان علم اور اہل دانش کی قدر و قیمت نہیں جانتے اور محققین' علماء اور دانشور طبقے کی عزت افزائی نہیں کرتے۔ اور صاحبان فن کے ان آسمانوں کی عزت و توقیر کا حق ادا نہیں کرتے اور اپنے تئیں یہ گمان کرتے ہیں کہ علم ایک بے فائدہ ولاحاصل پیشہ اور بے مقصد ہنر ہے کہ جس کا نہ کوئی فائدہ ہے نہ نتیجہ اور بیکار لوگ اس سے شغف رکھتے ہیں۔ نتیجتاً اس قوم کے درمیان اہل علم و دانش کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کے باپ دادا کی تمام کامیابیاں' ترقیاں بلکہ دنیا میں پائی جانے والی ہر سعادت علم اور معرفت کا نتیجہ ہے اور یہ بھی نہیں سمجھتے کہ علم اور اہل علم کی عظمت کرنے میں وہ دوسروں سے زیادہ سزاوار ہیں۔"

ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے تعلیمی ماہرین اور دانشور حضرات اگر سید جمال الدین کے ان نظریات کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھیں اور عملی بنانے کی کوشش کریں تو وہ تعلیمی سطح' تعلیمی نظام اور خواندگی کی شرح میں واضح تبدیلی لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مدارک

سید جمال الدین' مقالات جمالیہ (تدوین و ترتیب میرزا لطف اللہ و میرزا صفات اللہ) تہران: انتشارات اسلامی' ۱۳۴۳

سید جمال و شیخ محمد عبدہ' العروۃ الوثقی' مصر: مکتبۃ العرب' ۱۹۵۷ (با مقدمہ سید ہادی خسروشاہی ۱۳۹۰ھ۔ق۔ قم)

سید جمال' اسلام و علم' تبریز: مرکز انتشارات دار التبلیغ' ۱۹۸۶

احمد موثقی' علل و عوامل ضعف و انحطاط مسلمین' تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی ۱۹۹۴

صفات اللہ جمالی' اسناد و مدارک در بارۂ سید جمال الدین' قم: مرکز انتشارات دار التبلیغ' ۱۹۷۲

سر سید کی تعلیمی آراء

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے تعلیم اور تعلّم پر جتنا زور دیا ہے مسلمان تعلیم کے عملی میدان میں اتنا ہی پیچھے ہیں۔ یوں تو ہمارے یہاں کے مفکرین اور ماہرین تعلیم اس موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اُن بزرگوں کے افکار کو چنداں اہمیت نہ دی جنہوں نے جہالت' مذہبی تعصب کے اندھیرے اور مخالفت کے طوفان میں علم کی شمع جلائی۔ برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کی نسلیں سر سید احمد خان کے احسان تلے دبی رہیں گی جنہوں نے اپنی عزت' حیثیت اور ہر چیز کا سودا کر کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور انگریزوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ مسلمانوں سے مخاصمانہ رویہ ترک کر دیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی پسماندگی پر صرف اظہار افسوس نہ کیا بلکہ انہیں اس حالت سے نکالنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا۔ وہ مسلمانوں کو ترقی یافتہ اور باعزت قوموں کی صف اول میں دیکھنا چاہتے تھے لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام سے سبق حاصل کریں اور سمجھیں کہ ان قوموں کی ترقی کا راز جدید علوم کے حصول میں مضمر ہے۔ لیکن جب مسلمان اُن کی پدرانہ نصیحت کو سننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتے تھے تو انہیں بڑا افسوس ہوتا تھا۔ یہ افسوس اس وقت زیادہ ہو جاتا تھا جب وہ پارسیوں اور ہندوؤں کو تعلیم میں آگے بڑھتا دیکھتے تھے'

''افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں

......ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :

"مگر ہمارے ہم وطن ہندو اور مسلمان بھائی اب تک کوئے جہالت میں پڑے ہیں اور آئندہ مدت تک پڑے رہیں گے اور شاید مسلمان تو اتنے دن تک پڑے رہیں کہ پھر وقت اور زمانہ ان کی ترقی و شائستگی کا باقی نہ رہے اور جو اب مرض ہے وہ علاج پذیر نہ رہے کیونکہ ان کو یعنی مسلمانوں کو جہل مرکب نے گھیرا ہے۔ اپنے باپ دادا کے قصے یاد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم سے بہتر کون ہے......" (ماخوذ از سفر نامہ لندن مطبوعہ کراچی ۱۹۹۷ء ص ۱۹۶ و ۲۶۴)

جدید علوم کی نشر و اشاعت کے لیے سر سید سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لاتے ہیں۔ اگر انجمن ترقی اردو اور ہمارے دوسرے تعلیمی ادارے صرف انہی اصولوں کو اپنا لیتے جن پر سائنٹفک سوسائٹی سرگرم عمل رہی تو ہماری قوم کے نوجوان اردو زبان کی ہمہ گیریت اور مختلف علوم میں اس کی شمولیت کے بارے میں اتنے ناامید نہ ہوتے۔

محمد اسماعیل پانی پتی سفر نامہ لندن ص ۱۸۵ میں لکھتے ہیں کہ:

"فارسی کی قدیم عمدہ کتابیں اردو میں شائع کرنے اور انگریزی سے سائنس، تاریخ اور مختلف علوم و فنون کی بہترین کتابیں اردو میں منتقل کرنے کے لیے سر سید نے ۱۸۶۳ء غازی پور میں جہاں وہ اس وقت ملازم تھے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک خالص علمی انجمن قائم کی تھی۔ وزیر ہند اس کے سرپرست اور یوپی اور پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر اس کے نائب سرپرست تھے اور ممبر ملک کے تمام معزز اور تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان۔ سر سید اس کے آنریری سیکریٹری تھے اور عملاً سب کچھ وہی تھے۔ اس سوسائٹی نے بہت سی اعلیٰ پائے کی انگریزی کتابوں کے اردو ایڈیشن نہایت نفاست کے ساتھ شائع کیے۔"

سر سید تعلیم کو اتنی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی بقا کا راز تعلیم میں مضمر سمجھتے ہیں۔ لندن سے ایک خط مؤرخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے سیکریٹری راجا جے کشن داس کو لکھتے ہیں:

"اپنی سوسائٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت جانے دینا۔ سررشتہ تعلیم کی بھلائی اور برائی پر تمام ہندوستان کی زندگی اور موت منحصر ہے۔" (سفر نامہ لندن ص ۲۰۴)

یوں تو سر سید نے اپنی پوری زندگی مسلمانان ہند کو جدید علوم سکھانے میں وقف کر دی اور آکسفورڈ کی طرز پر علیگڑھ میں محمڈن کالج قائم کیا لیکن اس مقالہ میں ہم ان اصولوں پر مختصر سی روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جن پر سر سید نے اپنے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی۔ مولانا الطاف حسین حالی

لکھتے ہیں کہ انگلستان کے طریقہ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے تھے۔ اگرچہ یہ پمفلٹ ہماری دسترس میں نہیں لیکن سرسید کے سفرنامہ لندن (مسافران لندن) اور ان کی خود نوشت حیات (جنگ پبلشرز ۱۹۹۳) سے کچھ نکات اور اصول سامنے آتے ہیں جن کی روشنی میں ہم ان کی تعلیمی آراء کو منعکس کر سکتے ہیں۔

(۱) تعلیم کو عام کرنا
(۲) اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنا
(۳) حکومت پر عدم انحصار
(۴) بچوں پر توجہ

(۱) تعلیم کو عام کرنا

سرسید تعلیم کو اتنا عام کرنا چاہتے تھے کہ عام ٹھیلے والے اور ٹیکسی ڈرائیور سے لے کر قوم کی اعلیٰ سطح کے لوگوں تک سب تعلیم حاصل کر لیں اور ان کے خیال میں جب تک ایسا نہیں ہوگا اس وقت تک کوئی قوم شائستگی حاصل نہیں کر سکتی۔ اپنے سفرنامہ لندن میں وہ انگلستان میں تعلیم کے عام رجحان پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"کیب مین اور کوچوان اپنی گدی کے نیچے کوئی اخبار یا کتاب دبائے رکھتے ہیں جہاں سواری پہنچائی اور کیب یا اور جو سواری ہو وہ کھڑی کی اور انہوں نے اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ آپ خیال کر لیں کہ یہاں کیب مین کی ایسی حیثیت ہے جیسی کہ بنارس میں وہاں پر یکہ چلانے والوں کی حیثیت۔ پس جب تک کہ اس قدر ترقی عام تعلیم کی نہ ہو شائستگی اور تربیت کسی قوم میں آنی اور اس قوم کی عزت ہونی ناممکن ہے۔"

ہمارے ملک میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ صرف شہری آبادی میں تعلیم کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے اور دیہی آبادی میں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔ نیز شہریوں میں بھی صرف ایک خاص طبقے کے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر پاتے ہیں اور ان میں بھی ایک بڑی تعداد اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنے کے بجائے باہر کے ملکوں میں جا کر اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔

(۲) اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنا

سرسید یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح انگلستان کی قومی زبان انگریزی ہے جس میں وہاں کے لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں اسی طرح ہندوستان کے لوگوں کی زبان اردو ہے۔ چنانچہ انہیں

تمام علوم و فنون اردو زبان میں حاصل کرنا چاہئے۔ بہت بہادری کے ساتھ اس نکتہ پر تاکید کرتے ہیں اور اپنے اس جملہ کو ہمالیہ کی چوٹی پر کندہ کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اسے اپنے لیے سر مشق قرار دیں۔

"اس تمام ترقی کا باعث انگلستان میں صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں تمام علوم تمام فن جو کچھ ہے اسی قوم کی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ گو اسی انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسے ہندوستان میں علی الخصوص شمال و مغربی اور صوبہ بہار میں اردو جس کو ہر کوئی سمجھتا ہے۔ پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انہی کی زبان میں ان کو دیئے جاویں۔ میری یہ رائے ہندوستان کی ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھودے جاویں "اگر تمام علوم ہندوستان کو اس کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا۔ یہی سچ ہے' یہی سچ ہے یہی سچ ہے (سفرنامہ لندن ص ۲۰۳۔۲۰۲)

افسوس کے ساتھ یہ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ ہم نے کبھی اس چیز پر اتنی توجہ نہیں دی کہ تمام علوم کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ دوسری طرف ہندوستان کی حکومت نے مسلمانوں سے عناد میں انہیں اُردو زبان سے اتنا نابلد کر دیا کہ نوجوان طبقہ نہ اردو رسم الخط لکھ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ اور اس طرح نہ صرف وہاں کے مسلمان اپنے ایک عظیم ادبی' علمی اور مذہبی ورثہ سے محروم ہوتے جا رہے ہیں بلکہ بر صغیر خود اپنی ترقی یافتہ زبان سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔

(۳) حکومت پر عدم انحصار

سر سید ایک باعمل انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حکومتیں اپنی سیاسی باگ ڈور کو مضبوط کرنے میں لگی رہتی ہیں اور تعلیم کو نظر انداز کرتی ہیں۔ دوسری طرف سے مسلمان ہمیشہ حکومت پر تکیہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم حاصل نہیں کر پاتے اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ باہمی تعاون اور آپس کے چندے سے تعلیم کے مسائل کو حل کریں۔ علیگڑھ کے کالج کے لیے بھی سر سید نے اسی طرح پیسہ جمع کیا اور امام ضامن کے پیسے سے لے کر یہاں تک کیا کہ لاٹری کھیلی' تھیٹر اور اسٹیج شو کیا اور اس کا گلہ کیا کہ مسلمان قومی اور تعمیری کاموں میں پیسے خرچ نہیں کرتے جبکہ غیر ضروری چیزوں میں دل کھول کر لٹاتے ہیں۔ سر سید کے یہاں تعلیم صرف نوکری حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ مستقل بنیادوں پر معاشی

مسائل کے حل کرنے اور عزت و عظمت حاصل کرنے کا نام ہے۔

"مگر اے ہندوستان کی بھلائی چاہنے والو! تم کسی سے توقع مت رکھو اور خود اپنے بھروسے اور آپس کے چندے سے اپنے ملک میں تمام علوم اعلیٰ درجے سے ادنیٰ درجے تک اپنی زبان میں پھیلاؤ۔ پھر جب تم علوم سے واقف ہو جاؤ گے' شائستگی و تربیت تک پہنچو گے تب تمہاری نگاہ میں گورنمنٹ کے نوکریوں کے لالچ کی کچھ بھی حقیقت نہیں معلوم ہو گی۔ اُمید ہے کہ کسی نہ کسی دن ایسا ہی ہو گا!۔۔ ہو گا!!۔۔ ہو گا!!!

(۴) بچے اور نوجوان

تعلیم کے میدان میں سر سید سب سے زیادہ زور بچوں اور اُن نوجوانوں پر دیتے ہیں جنہوں نے مستقبل میں جا کر ملک و قوم کی تعمیر کرنی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"اے ہمارے عزیز ہم وطنو! ہماری قوم کے جو لوگ بوڑھے ہیں وہ کے دن کے ہیں ان کو خدا جلد بہشت نصیب کرے گا۔ جو جوان ہیں ان سے ہاتھ اٹھاؤ' جب درخت کی شاخ سخت خشک ہو جاتی ہے وہ ٹوٹ جاتی ہے پر کسی طرف پھر نہیں سکتی۔ ہاں اپنی اولاد کی جو چھوٹی پود ہے خبر لو' ان کی تعلیم و تربیت کا فکر کرو۔ تمہاری حالت تمہارے باپ دادا کی حالت سے زیادہ خراب ہے اور تمہاری اولاد کی حالت تم سے بھی زیادہ بدتر اور ابتر ہو گی۔ اگر تم اس کی فکر نہ کرو گے تو تمہاری ارواح قبر میں ان کے لیے روویں گی۔

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کے دانشور' مفکر' اساتذہ اور ماہرین تعلیم ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کریں گے اور جب تک کہ قومی بھلائی کے کاموں میں جذبہ ایثار کار فرمانہ ہو گا اس وقت تک ہم ان خطوط پر آگے نہیں بڑھ سکتے جو ایک قوم کو شائستگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ بصورت دیگر سر سید مرحوم کے بقول پھر بہت دیر ہو جائے گی اور اصلاح احوال کا وقت بھی باقی نہ رہے گا۔

مدارک

سر سید احمد خان' مسافران لندن' کراچی: علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن' ۱۹۹۲ء

سر سید احمد خان' خود نوشت حیات' کراچی: جنگ پبلشرز' ۱۹۹۲ء

اسلامی اخوت

یہ صدر اسلام کی بات ہے۔ شہر مکہ ایک نئے دین و آئین کا پیغام سن رہا تھا۔ کچھ لوگ اس نئے دین پر ایمان لے آئے تھے لیکن ابھی بھی مکہ کے زیادہ تر لوگ اپنے آباء و اجداد کے دین اور گذشتہ رسم و رسوم پر باقی تھے۔ وہ اس نئے دین کے سخت مخالف تھے اور مسلمانوں کو طرح طرح کے شکنجے دیتے تھے۔ مکہ کے ان نئے مسلمانوں کو ایک طرف سے اپنے قوم قبیلہ سے بھی الگ کر دیا گیا تھا اور دوسری طرف سے کفار کے مظالم کا سامنا تھا۔ مکہ کے سیاسی و سماجی بائیکاٹ میں انہیں بڑی شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے اور اس احساس کی تسکین کے لئے اسلام نے ان کے درمیان ایک دینی و روحانی رشتہ قائم کیا۔ یہ ایمانی رشتہ ان خونی رشتوں سے الگ ہے جن کی بنیاد پر میراث تقسیم ہوتی ہے اور دوسرے اسلامی قوانین لاگو ہوتے ہیں۔ یہ کون سا جذبہ اور رشتہ ہے کہ جب دنیا کے کسی گوشہ و کنار میں چاہے فلسطین ہو یا لبنان اور بوسنیا و چیچنیا اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا جاتا ہے تو اس کی تکلیف کا احساس دل میں ہوتا ہے۔ بلا شبہ یہ وہ بھائی چارہ ہے جسے "اسلامی اخوت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کے بعد ایک مسلمان اپنے دینی بھائی کو بھی اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس نگاہ سے اپنے سگے بھائی کو دیکھتا ہے۔ تاریخ اسلام سے ثابت ہوا کہ بسا اوقات یہ دینی رشتہ خاندانی و قبائلی رشتوں اور قومی بنیادوں سے زیادہ گہرا اور پائیدار ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور سیرت النبیؐ میں اس اخوت کے بارے میں کیا کچھ بیان کیا گیا ہے۔

اہل تاریخ و سیر میں سے کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے صرف

مدینہ میں مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس سے پہلے بھی شہر مکہ میں آپؐ اس کام کو انجام دے چکے تھے۔ چنانچہ مکہ میں آنحضورؐ نے حضرت ابو بکر کو حضرت عمر کا حضرت عثمان کو عبدالرحمٰن بن عوف کا' حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کو زید بن حارثہ کا' اور طلحہ کو زبیر کا بھائی بنایا اور جب صرف حضرت علی باقی رہ گئے تو انہیں اپنا بھائی بنایا اور فرمایا کہ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔ علامہ ابن حجر عسقلانی' علامہ ابن عبدالبر' حاکم بن عبداللہ نیشا پوری' حسین دیار بکری (صاحب تاریخ الخمیس) اور اہل سیر میں سے جعفر مرتضٰی عاملی اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہیں اور اس اخوت کو ایک مسلمہ حقیقت گردانتے ہیں جس کے توسط سے مکہ کے مسلمانوں کے معاشرتی مسائل کو حل کیا گیا تھا۔(۱)

مدینہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کے سامنے ایک نیا مستقبل تھا۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یثرب میں ایک نیا اسلامی اور انسانی معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے کہ جس میں امن و سکون ہو اور جو ان نو مسلموں کو ہدایت و سعادت کی طرف لے جائے۔ ایک ایسا مدینہ فاضلہ جو ان کے تمام انسانی حقوق کا ضامن ہو اور انہیں جنگ و جدال اور قتل و غارتگری سے بچائے۔ ایسے مثالی معاشرے کے قیام میں ایک بنیادی رکاوٹ یہ تھی کہ یثرب کے لوگوں کا رہن سہن، خصلتیں اور قبائلی رسوم مکہ کے لوگوں سے یکسر مختلف تھیں۔ یہ فرق خود اسلام قبول کرنے اور اس کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں بھی خاصا واضح تھا۔ مہاجرین کی آمد سے قبل مدینہ کے لوگ اوس و خزرج (Khazraj) نامی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اسی طرح مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین بھی مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی قومی تعصبات اور قبیلہ پرستی (Tribal Ethnicity) اس مدینہ فاضلہ کی راہ میں پہلی رکاوٹ تھی اور دوسری بڑی رکاوٹ مہاجرین کے معاشرتی و معاشی مسائل تھے جو اپنا گھر بار سب کچھ مکہ چھوڑ آئے تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ جناب رسالت مآبؐ نے دونوں مسائل کا علاج "اسلامی اخوت" کے ذریعے سے کیا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والوں کو "مہاجر" کا لقب دیا مہاجر سے مراد وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار' خاندان سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور ایک ایسی جگہ سکونت اختیار کی تھی جہاں اخلاق و کمالات کو حاصل کر سکیں۔ اسی طرح مدینہ کے باشندوں کو "انصار" کا خطاب دیا۔ انصار یعنی اللہ کے دین کی نصرت و مدد کرنے والے۔ اللہ کے دین کے فدائی۔ یہ مکہ اور مدینہ کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو ختم کرنے کی جانب پہلا قدم تھا۔ دوسرا بنیادی قدم یہ اٹھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے پہلے سال ہی انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کا پیوند لگایا۔ صحیح مسلم

میں انس بن مالک سے مروی ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں اپنے گھر میں انصار اور قریش کے درمیان اخوت برقرار کی۔ اس کے تحت ایک مہاجر کو ایک انصار کا بھائی بنایا اور کسی کو اکیلا نہ چھوڑا۔ (۲) اس ضمن میں مشہور و معروف سیرت نگار ابن اسحٰق کی یہ عبارت قابل غور ہے۔

"آنحضرتؐ نے (جیسا کہ ہم سے نقل کیا گیا ہے اور معاذ اللہ ہم آنحضرتؐ سے وہ بات منسوب کریں جو آپؐ نے نہ فرمائی ہو) اپنے صحابہ میں سے انصار و مہاجرین کے درمیان برادری برقرار کی اور فرمایا کہ "اللہ کے راستے میں دو دو کر کے بھائی بن جاؤ۔ پھر علی بن ابی طالب کا ہاتھ تھاما اور فرمایا کہ یہ میرے بھائی ہیں۔ حمزہ بن عبدالمطلب اور زید بن حارثہ کو بھائی بنایا' حضرت ابو بکر اور خارجہ بن زہیری کو' حضرت عمر اور عتبان بن مالک کو' عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ربیع کو اور بلال اور ابورویحہ کو اور حضرت جعفر طیار اور معاذ بن جبل کو بھائی بنایا"

ابن اسحٰق کی یہ روایت کئی مستند ذرائع سے نقل ہوئی ہے اور غیر قابل خدشہ ہے تاہم اس پر کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ حضور اکرمؐ مہاجر و انصار کے درمیان محبت والفت برقرار کرنا چاہتے تھے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ حضرت علیؑ کو اپنا بھائی بنائیں۔ حافظ ابن کثیر اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ نبی کریمؐ حضرت علیؑ کو کسی اور پر نہ چھوڑنا چاہتے تھے جو بچپن ہی سے یعنی حضرت ابو طالب کی حیات سے پیغمبر اکرمؐ کے زیر کفالت تھے۔ حافظ ابن کثیر کے بیانات کے علاوہ صحاح ستہ سے نقل کی گئی بہت سی احادیث اس مواخاۃ کی شاہد ہیں۔ انہی کے ضمن میں ترمذی شریف سے نقل کی گئی وہ مشہور حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ " انت اخی فی الدنیا والآخرۃ" (۳) دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ جس وقت یہ بھائی چارہ قائم کیا گیا اس وقت حضرت جعفر طیار حبشہ میں تھے پس کیونکر ممکن ہے کہ ان کے اور معاذ بن جبل کے درمیان اخوت برقرار کی گئی ہو۔ استاد جعفر مرتضیٰ عاملی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے پہلے سال یہ عہد و پیمان برقرار کیا تھا لیکن جیسے جیسے لوگ مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے مدینہ آتے گئے پیغمبرؐ ان کے اور انصار میں سے کسی ایک کے درمیان بھائی چارہ قائم کرتے گئے اس حقیقت پر متعدد شواہد موجود ہیں۔ (۴)

حدیث اخوت اپنے ساتھ کچھ دلچسپ واقعات بھی لئے ہوئے ہے۔ صحیح بخاری میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ جب انصار نے مہاجرین کو کھجور کے درختوں میں حصہ دار بننے کی پیشکش کی اور انہوں نے مسترد کر دی تو انصار نے درختوں سے حاصل ہونے والی کھجوروں کو

اپنے اور مہاجرین کے درمیان برابر سے تقسیم کیا۔ اس پر مہاجرین نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ لوگ کتنے اچھے ہیں خود مشقت اٹھاتے ہیں لیکن محصول کو برابر سے تقسیم کرتے ہیں۔ (۵) نیز ایک واقعہ مشہور صحابی عبدالرحمٰن بن عوف سے منسوب ہے جسے صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں نقل کیا گیا ہے۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ پہنچے تو جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے سعد بن ربیع کا بھائی بنایا۔ سعد بن ربیع نے مجھ سے کہا کہ میں انصار کے درمیان سب سے زیادہ مالدار ہوں۔ میں اپنی آدھی دولت تمہارے حوالے کرتا ہوں نیز میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس سے شادی کرنا چاہو میں اسے طلاق دینے کے لئے تیار ہوں۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تاہم بازار کا راستہ دکھاؤ۔ عبدالرحمٰن نے سعد بن دیناو کی مدد سے تجارت شروع کی اور چند ہی دنوں میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ (۶)

سیرت النبیؐ پر قلم اٹھانے والوں نے آنحضرتؐ کے اس اقدام کو بہت سراہا ہے۔ استاد حسین ہیکل "حیات محمدؐ" میں لکھتے ہیں کہ حضور مقبولؐ کی سیاسی حکمت عملی اتنی صحیح اور نپی تلی ہوتی ہے اور آپؐ اتنی مہارت سے اسے عملی جامہ پہناتے ہیں کہ اہل نظر آپؐ کی عظمت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ (۷) علامہ شبلی نعمانی نے بھی حدیث مواخاۃ کو خاصی تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔ یوں تو برادری و برابری برقرار کرنے کے اس نبویؐ فیصلے میں بہت سی حکمتیں شامل ہیں لیکن جو چیز زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ مدینہ ہجرت کے بعد مہاجرین اپنا گھر بار، مال و دولت غرض سب کچھ مکہ چھوڑ آئے تھے حضرت عثمان غنیؓ کو استثناء کر کے عام طور پر دیکھا جائے تو ہجرت کے اس نئے شہر میں نہ ان کا کوئی گھر تھا اور نہ ہی مناسب پیشہ جس سے وہ اپنی ناداری کو دور کر سکتے۔ چنانچہ وہ غربت و اجنبیت کا احساس کرنے لگے تھے۔ تاہم اسلامی اخوت برقرار کئے جانے کے بعد جو ان کے اور انصار کے درمیان قائم ہوئی تھی، ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کی بہ نسبت احساس ذمہ داری کرنے لگا تھا جس کے پاس ایک وقت کا کھانا بھی نہ تھا۔ چنانچہ جب انصار نے ایثار کا مظاہرہ کیا اور اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کی تو وہ مختصر عرصے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ بہرصورت جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ان اقدامات کے ذریعے یعنی اسلامی اخوت برقرار کر کے مدینہ منورہ میں ایک نئے اسلامی اور فلاحی معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ یہ معاشرہ محبت والفت اور برادری و برابری کی بنیادوں پر قائم تھا۔ اس معاشرے میں نہ قبائلی نظام تھا نہ لسانی تعصبات (Ethnicity) اور نہ فیوڈل سسٹم۔ تمام انسانوں کو ان کے انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔ اب نہ غلام بنائے جانے کا خطرہ تھا اور نہ ہی دوسرے مضبوط

قبائل کی جاہ طلبی کا اندیشہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسان دوستی (Love for Mankind) حقوق انسانی کا احترام (Respect for Human rights) اور قیام امن کی اس سے بہتر مثال پیش کرنا ممکن نہیں جو اس مدینہ فاضلہ میں دکھائی دیتی ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

قرآن کریم نے بھی اسلام کی اس مثالی اخوت کا ذکر کیا ہے۔ سورہ حجرات آیت نمبر (۱۰) میں ارشاد ہوتا ہے کہ "انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم" اہل ایمان سب (آپس میں) بھائی ہیں پس (اگر اپنے دو بھائیوں کو لڑتے دیکھو تو) ان کے درمیان صلح صفائی برقرار کرو۔ قرآن کریم اہل ایمان کے درمیان صرف اخوت برقرار نہیں کرتا بلکہ ان پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ اگر وہ مسلمانوں کو چاہے گروہ ہوں یا فرد' آپس میں لڑتے دیکھیں تو ان کے درمیان صلح صفائی کریں ان کی مخاصمت کو ختم کریں اس لئے کہ یہ دو متحارب گروہ نہ صرف آپس میں بھائی ہیں بلکہ خود ان کے برادر ایمانی بھی ہیں۔

اگر اسلامی اخوت کو معیار بنایا جائے اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کا قیام اسلامی نظریہ کے تحت وجود میں آیا تھا۔ برصغیر کے پچاس کروڑ مسلمان اس مذہبی آزادی سے برخوردار نہ تھے جس کے سائے میں رہ کر سعادت کے راستے پر چل سکتے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل وہ معاندانہ رویہ ہے جو آج تک ہندوستان کے مسلمانوں کیساتھ روا رکھا گیا ہے۔ انہیں ایک طرف سے اردو زبان سے الگ کر کے اپنے عظیم ادبی' مذہبی اور قومی ورثہ سے محروم کر دیا گیا اور دوسری طرف سے مذہبی آزادی کا حق بھی چھین لیا گیا۔ (۸) مکہ کے مسلمانوں کو نمونہ عمل بناتے ہوئے اور ہجرت کے اسلامی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دور کے مسلمانوں نے ایک ایسے فلاحی معاشرے کی جدوجہد شروع کی تھی جہاں آزادی سے اسلامی اصولوں پر عملدرآمد کیا جا سکے۔ اسی اصول کی بنا پر دو قومیاتی نظریہ (Two Nation Theory) وجود میں آیا اور مسلمانوں نے کچھ شخصیات کو اپنا ترجمان بنایا۔ (۹) چنانچہ جب ایسی مملکت قائم ہو گئی تو اسے آباد کرنے کے لئے انہوں نے اپنا گھر بار' مال و دولت اور عزت و ناموس سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور پاکستان ہجرت کی۔ نیز جو لوگ ان مسلمان نشین علاقوں میں پہلے سے آباد تھے انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ اسی ایثار اور محبت کا مظاہرہ کیا جس کا بہترین نمونہ مدینہ منورہ کے انصار نے پیش کیا تھا۔ اگر ایک معاشرے کا قیام اسلامی اصولوں کے مطابق عمل میں آئے تو پھر اس کے بعد اگر ہزار مولوی بھی اس کی اسلامی

بنیادوں میں شک کرتے رہیں تو ان کا یہ شک ناقابل قبول سمجھا جائے گا۔ اسی طرح اگر کچھ دانشور پاکستان کے قیام اور اس کی جغرافیائی حدود کو نیشنلزم سے تعبیر کرنے لگیں تو یہ ان کی انتہائی غلطی ہو گی۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر کلیم صدیقی (لندن) بھی سر فہرست ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد دوسروں سے نفرت اور تفریق پر نہیں بلکہ اسلامی نظریئے پر ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں تمام مسلمانوں سے محبت کی جاتی ہے۔ پس **پاکستانی اخوت در حقیقت اسلامی اخوت** ہے۔ اگر علمائے کرام اور مذہبی تنظیمیں پاکستان کے وجود میں شک کرنے کے بجائے اپنا صحیح کردار پیش کرتیں اور لوگوں کو قرآن کی واضح تعلیمات اور سنت و سیرت کے مسلمہ حقائق سے آگاہ کرتیں تو ایک مثالی معاشرہ کا قیام اور صحیح اسلامی مملکت کی تعمیر عمل میں آسکتی تھی لیکن جب علما نے اپنی ذمہ داریوں سے غفلت کی اور صحیح قیادت کی جگہ مفاد پرست اور وڈیرہ شاہی طبقے نے لے لی اور جب لائق کے بجائے نالائق لوگ اقتدار کے ایوانوں میں بٹھادیئے گئے تو اتحاد کی جگہ اختلاف اور اخوت کی جگہ دشمنی نے لے لی۔ یہ دشمنی کہیں مذہبی دشمنی کی صورت میں سامنے آئی اور فرقہ پرستی کی بنیاد پر آگے بڑھی اور کہیں لسانی اور قومی نعروں کی گونج میں پھیلادی گئی۔

امت مسلمہ کے زوال و عروج کی داستان بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ جب انہوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل کیا اور اتحاد و اخوت کو برقرار رکھا تھا تو فرانس سے لے کر چین تک کرہ ارض کے وسیع و عریض حصے پر اسلام کا پرچم لہرادیا تھا اور توحید کا پیغام عام کردیا تھا۔ لیکن جب اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی خلاف ورزی کی، علم و صنعت کی طرف توجہ نہ کی اور مذہب کے قوانین بھول گئے تو مغربی اقوام کے غلام بن گئے جنہوں نے ان کے خزانوں کو لوٹا اور ان کے ممالک اور سلطنتوں کو تاراج۔ ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے اس وقت دو تحریکیں پاکستان کی سالمیت اور اس کے وجود کے لئے خطرہ ہیں۔

۱۔ وہ تحریکیں جن کی بنیاد قومیت یا لسانی تعصبات پر ہے۔

۲۔ وہ تنظیمیں جو فرقہ پرستی اور مذہبی اختلافات کو ہوا دے رہی ہیں (Sectarianism)

دونوں اسلامی نظریات اور اسلامی اصولوں کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم میں نہ لسانیت اور علاقائی تعصبات کی گنجائش ہے اور نہ ہی فرقہ پرستی اور مسلمانوں میں انتشار پھیلانے کی اجازت۔ علمائے اسلام کو چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کو ایک نکتہ اور مرکز پر جمع کریں جو قرآن و سنت ہے اور جسے "حبل اللہ" یعنی اللہ کی رسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح قومیت کا نعرہ لگانے والوں کو سوچنا چاہیئے کہ کیا یہ نعرہ لگا کر دوبارہ اسی جاہلیت اور قبائلی نظام کی طرف واپس

نہیں جارہے جو اسلام سے پہلے تھا اور جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم کردیا تھا؟ اگر وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہتے ہیں اور انصاف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ یقین پیدا کرنا چاہئے کہ صرف اسلامی اخوت اور اسلامی تعلیمات کے سائے میں رہ کر ہی وہ اپنے حقوق حاصل کرسکتے ہیں اور صرف ایک اسلامی وانسانی معاشرہ ہی ان کی بقاء کا ضامن ہو سکتا ہے لہذا لوگوں کو لسانی اور علاقائی تحریکوں کا دھوکہ نہیں کھانا چاہئے اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتے تو پھر ہرگز مسلمان ہونے کے دعویدار نہیں بن سکتے۔

البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ طاقت کے بل بوتے پر ان تحریکوں کو ختم نہیں کیا جاسکتا بلکہ بات چیت اور اسلامی اخلاق پر کاربند رہتے ہوئے لوگوں کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے اور ان کے حقوق دیئے جاسکتے ہیں۔

مدارک

۱۔ حسین دیار بکری، تاریخ الخمیس، بیروت: موسسۂ شعبان، جلد اول؛ ابن عربی عارضۃ الاحوذی بشرح صحیح الترمذی، بیروت: دار العلوم للجمع، جز ۱۳، ابواب المناقب؛ ہاشم المعروف، سیرۃ الائمہ اثنی عشر، بیروت: دار التعارف، ۱۹۹۰، جلد اول، ص ۲۶۴ جعفر مرتضیٰ، الصحیح من سیرۃ النبی، بیروت: دار الہادی، ۱۹۹۵ جلد چہارم، ص ۲۳۴

۲۔ صحیح مسلم بشرح النووی، بیروت: دار احیاء القرآن، ۱۹۷۲، جلد ۱۶، صفحہ ۸۱

۳۔ ابن حبان، کتاب الثقات، بیروت: دار الفکر، جلد اول صفحہ ۱۳۸؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، بیروت: دار المعرفہ، القسم الاول صفحہ ۵۰۴؛ ابن کثیر، البدایہ والنھایہ، بیروت: مکتبۃ المعارف، ۱۹۶۶ء، جلد سوم، صفحہ ۲۲۷؛ ابن عربی، عارضۃ الاحوذی بشرح ترمذی، جلد ۱۳۔ ابواب المناقب؛ ہاشم المعروف، سیرۃ المصطفیٰ، بیروت: دار التعارف، ۱۹۹۰، صفحہ ۲۶۴ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، جلد اول، صفحہ ۱۷۲

۴۔ الصحیح من سیرۃ النبی ۵۔ بخاری، صحیح البخاری، بیروت دار المعرفہ، جلد سوم، کتاب مناقب الانصار صفحہ ۱۳۱۰ شبلی نعمانی، سیرت النبی جلد اول۔ صفحہ ۱۷۱

۶۔ صحیح بخاری، جلد دوم کتاب البیع صفحہ ۲؛ شبلی نعمانی سیرت النبی، کراچی دار الاشاعت، صفحہ ۱۷۰

۷۔ محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد، قاہرہ: مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ، ۱۹۶۸ء صفحہ ۲۲۳

۸۔ الطاف حسین قریشی، اردو ڈائجسٹ، لاہور: مارچ ۱۹۹۴ صفحہ ۶۳ (ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیانات ماخوذ از زندہ رود) ص ۲۱۲ (ایس ایم ظفر۔ سابق وزیر قانون کے بیانات)

۹۔ الطاف حسن قریشی، اردو ڈائجسٹ لاہور: مارچ ۱۹۹۳ء، جلد ۳۳ شمارہ ۳، ص ۱۴۷۔۱۴۵ (سید انور احمد بلگرامی کے بیانات)

اتحاد اور اقتدار۔ سید جمالؒ کے قلم سے

مومن مومن کے لئے اس دیوار کی مانند ہے جس کی ایک اینٹ دوسری کو مضبوط کرتی ہے اتحادواقتدار ان دو بنیادی اور اہم مسائل میں سے ہیں جو وقت کی آواز بھی ہیں اور دین کی پکار بھی۔ یہ دو کمالات صحیح ترتیب اور خاص آدب واطوار کی مسلسل رعایت سے حاصل ہوتے ہیں۔ قیادت اتحاد کے نتیجہ میں ابھرتی ہے اور اتحاد صحیح قیادت کے زیراثر حاصل ہوتا ہے پس دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔ انہی دواوصاف سے قومیں تشکیل پاتی ہیں اور اپنی عزت و عظمت اور ترقی وتکامل کے مدارج طے کرتی ہیں۔ وحدت یعنی اتحاد و یکجہتی کا جذبہ اور ایسی قیادت کا ولولہ جو حقیر وپست نہ ہو اور جب خداوند عالم چاہتا ہے کہ کسی قوم کی بنیادوں کو ثابت و مستحکم کردے تو اس قوم کی جڑوں میں ان پسندیدہ صفات کو ودیعت کردیتا ہے پھر اس وقت تک اس قوم کو باقی رکھتا ہے جب تک یہ دو صفتیں اس کے درمیان پائی جائیں یہاں تک کہ وہ قوم اپنی طبعی عمر پوری کرلے۔

جو قوم بھی دوسری اقوام پر غلبہ وبرتری حاصل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ نہیں اٹھاتی تاکہ اس غلبہ کے نتیجہ میں اس کی جڑیں مضبوط ہوں اس کی بنیادیں مستحکم ہوں تو خواہ نخواہ وہ دوسری قوموں کے لئے ایک لقمہ بن جاتی ہے جو اسے ہڑپ کرجائیں اور یوں اس قوم کا وجود مضمحل ہوجاتا ہے اور زمین سے نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے۔ قوموں پر غلبہ حاصل کرجانا اور انہیں ہڑپ کرنا انسانی زندگی میں کھانا کھانے کے مترادف ہے۔ اگر انسانی جسم کو مناسب غذا

نہیں ملے گی تو اس کی نشو و نما رک جائے گی پھر رفتہ رفتہ جسم کمزور اور نحیف ہونے لگے گا بیماریاں حملہ آور ہوں گی یہاں تک کہ موت آجائے گی اور کسی قوم کے لئے یہ ہر گز ممکن نہیں کہ وہ اپنی بنیادوں کو مستحکم کر سکے اور شکستہ و مغلوب اقوام سے اپنی ضروریات و بقا کا سامان نکال سکے مگر یہ کہ وہ اپنی ان ضروریات (Necesseties) کو حاصل کرنے میں ایک دل اور ایک زبان ہو۔ اگر آپ محسوس کریں کہ کوئی قوم اتحاد و اتفاق کی جانب تمایل رکھتی ہے تو اسے بشارت دیں اور نوید سنائیں کہ اللہ سبحانہ و تعالی نے اس کی سرشت میں کتنی عظیم صلاحتیں ودیعت کی ہیں یعنی اعلی اقتدار و دوسری قوموں پر غلبہ حاصل کرنے کا جذبہ۔ اگر ہم کسی قوم کی تاریخ کا جائزہ لیں گے اور اس قوم کی زندگی و موت کے تناظر میں اس قوم کے حالات کا گہرا مطالعہ کریں گے تو ہمیں انسانی قوموں کے بارے میں اللہ تعالی کا قانون معلوم ہو سکے گا اور وہ قانون یہ ہے کہ جتنا کہ ایک قوم میں یکجہتی و ہمدلی ہو گی اتنا ہی وہ اپنی موجودیت و بقا کی ضامن ہو گی۔ جس قدر وہ دوسری قوموں کو مغلوب کرنے میں ید طولی رکھے گی اتنا ہی وہ عزت و عظمت حاصل کرے گی۔ نیز کسی قوم کا شیرازہ نہیں بکھرتا اور نہ ہی وہ اپنا مقام و منزلت کھوتی ہے مگر یہ کہ اپنی صلاحیتوں سے غفلت کرتی ہے اور جو کچھ اسے میسر ہوتا ہے اس پر قناعت کرنے لگتی ہے۔ اپنے گھروں کے دروازوں اور سرحدوں تک محدود رہتی ہے اور جو ان سے باہر نکلنا چاہتا ہے اسے بری نگاہوں سے دیکھتی ہے اور خداوند عالم نے کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان میں انتشار پھیل چکا تھا اور وہ تفرقہ و پھوٹ کا مزا چکھ چکے تھے جس کے نتائج ختم نہ ہونے والی ذلت' بدترین عذاب اور ہمیشہ ہمیشہ کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے۔

اتحاد یہ ہے کہ مفادات و نقصانات کی بہ نسبت کسی قوم کے فرد کے احساسات میں ایک طرح کی ہماہنگی اور توافق پیدا ہونے لگے۔ اور تمام طبقوں کے ہر ہر شخص میں عزت و عظمت حاصل کرنے کا شعور ابھرنے لگے۔ وہ اس کا اتنا ہی دلدادہ ہو جتنا کہ لذیذ ترین کھانوں کا اور اگر یہ شعور مٹ جائے تو اتنا ہی مغموم و رنجیدہ خاطر ہو جتنا اپنی پسندیدہ ترین چیز کے کھونے پر غمگین ہوتا ہو اور دراصل یہ جذبہ ہوتا ہے جو ہر ہر فرد کو قوم کے حالات پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دیتا ہے لہذا وہ اپنی عمر کا ایک حصہ ان اسباب و عوامل کی چھان بیان میں صرف کر دیتا ہے جن سے وہ قوم ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا عزت و وقار دوبارہ حاصل کر لے اور اپنے خلاف ہونے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال کو توڑ دے۔ ان مسائل میں ایسے شخص کا ہم و غم کسی طرح اپنے ذاتی و فردی معاملات سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے فکر کو خیالات و تصورات کی تنگ و تاریک وادیوں میں کھونے نہیں دیتا کہ یہ زبانوں تک محدود رہیں بلکہ بصیرت کے ساتھ سوچتا ہے' ایک

لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے اور آہنی عزم وارادوں سے اس پر عملدرآمد کرتا ہے اور یوں وہ اپنے ممکنہ ذرائع اور موجودہ صلاحیتوں کو اپنی قوم کو کمال کی طرف لے جانے میں بروئے کار لاتا ہے جس طرح سے کہ معیشت کے حصول اور ضروریات زندگی فراہم کرنے میں تگ ودو کرتا ہے بلکہ نیک طینت وصاف دل اشخاص اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ اجتماعی معاملات اور قومی مسائل کو فردی و شخصی مسائل پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ لوگ صرف موجودہ اور تیار کئے ہوئے ذرائع پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان میں سے عاقل وہوشیار لوگ سوچنے اور سمجھنے کے راستے نکالتے ہیں' عزم وہمت کی تلواریں تراشتے ہیں اور اپنی مسلسل کوشش ولگاتار جدوجہد سے چھپی ہوئی توانائیاں' دفن کئے ہوئے خزانے اور متفرق صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لے آتے ہیں اور انہیں اپنی قوم وملت کے لئے ذخیرہ کرتے ہیں تاکہ اس قوم کی طبعی عمر اور اس کی زندگی کی حفاظت کرسکیں اسی طرح جس طرح کہ ایک فرد اپنی معاشی زندگی کے اسباب ولوازمات فراہم کرتا ہے اور اس حد تک انہیں جمع کرتا ہے کہ اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے بقیہ اوقات کی ضروریات بھی فراہم کرچکا ہے۔ نہیں بلکہ (اس سے بھی ایک قدم آگے) اس شخص کی مانند جو اپنی آئندہ نسلوں کے لئے بھی ذخیرہ کرتا ہو۔ بلاشبہ قوموں کے سن وسال کا پہلا اور ابتدائی دور پانچ صدیوں پر محیط ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسرے ادوار شروع ہو جاتے ہیں۔ ان ادوار میں سے پہلا دور جو سب سے مختصر عرصے پر محیط ہے عہد طفولیت کا دور ہے۔ اور کمال اس کے بعد کے ادوار میں جاکر حاصل ہوتا ہے۔ پس سوچنے کا مقام ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے سنجیدہ و باہوش انسان کتنے بلند ہمت وعالی حوصلہ ہوں گے۔!

جب کسی قوم کے افراد کے احساسات وجذبات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جسے بیان کیا جاچکا ہے تو تم دیکھو گے کہ اس قوم کے ذہین وذکی (Genius) افراد اور خواص کی ہمتیں بلند ہو رہی ہیں' اخلاق سنور رہے ہیں' کاموں میں قیادت کے آثار جھلک رہے ہیں اور جذبے جوان ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی قوم کی آقائی وسیادت اور عزت وعظمت کا خواہاں ہے۔ پس ان کمالات کو حاصل کرنے کے لئے ان کی ہمتیں ایک ہونے لگیں گی' ارادوں میں فرق نہ رہے گا اور وہ اس سیلاب کی مانند جو بلندی سے نشیبی زمینوں کی طرف سرازیر ہوتا ہے دوسری اقوام پر برتری وغلبہ حاصل کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ ان لوگوں کا یہ زور وشور اور ولولہ کسی صورت تھمنے نہ پائے گا اور اقوام عالم کو ایک مرتبہ مغلوب کرنے کے بعد دوسری مرتبہ شکار کرنا ان کی سرشت کا حصہ بن چکا ہوگا اور ان کے فطری میلانات کا ریلہ انہیں غیر ارادی طور پر اس طرف بہالئے چلا جائے گا۔ صرف ان کی سوچیں غلبہ حاصل کرنے کے ذرائع اور کامیابی کے

اسباب پر مرکوز ہوں گی۔

یہ دو صفات یعنی یکجہتی اور اقوام عالم پر برتری و عظمت حاصل کرنا اسلامی دیانتداری کے دو مستحکم ستون اور ایمان کے دواہم ارکان میں سے ہیں۔ یہ دوان مسلمہ فرائض و واجبات میں سے ہیں جن کا انجام دینا ضروری ہے اور اگر کوئی ان کے بارے میں اللہ تعالی کی نافرمانی کرے گا تو وہ اللہ تعالی کی دشمنی مول لے گا اور اس سب کا نتیجہ دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب کی صورت میں برآمد ہوگا۔ نبی کریمؐ کی حدیث ہے کہ "مومن مومن کے لئے ایک ایسی دیوار کی مانند ہے جس کی ایک اینٹ دوسری کو مضبوط کرتی ہو" ایک مومن دوسرے مومن کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو جسم کا ایک عضو دوسرے عضو کی بہ نسبت رکھتا ہے کہ اگر اعضاء میں سے کسی ایک کو درد لاحق ہو جائے تو دوسرے تک اس کا اثر پہنچے۔ اور جن چیزوں سے آنحضرتؐ نے روکا ہے اس ضمن میں وارد ہوا ہے کہ "ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو ایک دوسرے سے پشت نہ کرو (سرد مہری اختیار نہ کرو) اور ایک دوسرے کے خلاف حسد نہ کرو اور اللہ کے وہ نیک بندے بن جاؤ جو ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں معاشرے سے علیحدگی و گوشہ نشینی اختیار کرنے سے خبردار کیا اور فرمایا کہ اس صورت میں تم گھاٹے میں رہو گے اور تمہارے لئے اس بھیڑ کی مثال دی ہے جو گلے سے الگ ہو جائے تو بھیڑیئے کے ہتے چڑھ جاتی ہے۔

اس سب سے پہلے ہی اللہ سبحانہ و تعالی اپنے بندوں کو اپنی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دے چکا تھا وہ اپنے بندوں کو تفرقہ اور ایک دوسرے کو دھوکہ دینے سے سختی سے منع کرتا ہے اور اخوت و بھائی چارے کی نعمت کا ان پر احسان جتلاتا ہے جس سے پہلے وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ بہرحال آسمانی کتاب یہ آواز دے رہی ہے کہ "انما المومنون اخوۃ" تمام اہل ایمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور یہ آیات اپنے مخاطبین سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ مخاصمت کے وقت طرفین کے درمیان صلاح صفائی کرانے میں دیر نہ کریں۔ پھر اس صلح برقرار کرنے کے فرض ہونے پر مزید تاکید کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ طرفین کے درمیان دوستی برقرار کرو چاہے تمہیں اس راہ میں باغی (اللہ کے حکم سے تجاوز کرنے والے) کے خلاف تلوار اٹھانا پڑے۔ ارشاد باری تعالی ہے۔ "اگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں جنگ چھڑ جائے تو ان کے درمیان صلح صفائی برقرار کرو۔ پس اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے (کے حقوق) پر تجاوز کرے تو اس کے خلاف جنگ کرو جو باغی ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پلٹ آئے" اور بلاشبہ مسلمانوں کے متفقہ امور میں شامل ہونا اور ان کے اتحاد و یکجہتی کو برقرار رکھنا ہی اللہ تعالی کا حکم اور اس کا امر

ہے۔

ولا تکونو اکالذین تفرقو ا واختلفو امن بعد ماجاء تھم البینات

"اور ان لوگوں کی مانند نہ ہونا جنہوں نے واضح نشانیاں آنے کے بعد بھی تفرقہ پھیلایا اور اختلاف کیا" پس اللہ کی یہ مقدس کتاب ان تمام لوگوں کو دردناک عذاب سے ڈراتی ہے اور یہ فیصلہ سناتی ہے کہ جو کوئی اہل ایمان کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے پر چلے گا تو اللہ تعالی اس سے پیٹھ پھیر لے گا (اپنی رحمت منقطع کردے گا) اور اسے دوزخ میں ڈال دے گا جو بدترین ٹھکانہ ہے۔ اللہ تعالی کے صریح احکامات میں سے یہ حکم وارد ہوا ہے کہ تقوی اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا فرض ہے اور حق کی بالادستی اور امت محمدیہ کی سربلندی سے بڑھ کر کون سی نیکی ہو سکتی ہے جو باہمی تعاون کی سزاوار ہو۔! اور اس صادق القول نبی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے خبر دی کہ " ان ید اللہ مع الجماعہ" بے شک اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔ اور اگر صرف جماعت صحیح سے تشکیل پاجائے اور سچی الفت برقرار ہو جائے تو اللہ تعالی کی قدرت وعظمت کا ہاتھ ہی مدد کے لئے کافی ہوگا۔ اسلامی قوانین اور دائرہ شریعت میں اتفاق واتحاد کو اتنا بلند مقام حاصل ہے کہ اگر امت کسی مسئلے میں اجماع کرے اور اتفاق نظر حاصل ہو جائے تو یہ اتفاق اللہ تعالی کے حکم کو بیان کرتا ہے اور اس کے علم کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلامی شریعت نے اس کی رعایت کو تمام مسلمانوں پر فرض ٹھہرایا ہے اور اس کا انکار دین سے خارج ہونے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اسلامی نظام میں اتحاد کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس حدیث نبویؐ سے ہوتا ہے کہ "اگر مجھے حلف الفضول میں شمولیت کی دعوت دی جاتی تو میں اسے قبول کر لیتا" (حلف الفضول وہ عہد نامہ تھا جسے قبیلہ بنی ہاشم، بنی زہرہ اور بنی تیم نے عبداللہ بن جذعان سے مل کر منعقد کیا تھا اور یہ عہد و پیمان یاد کیا تھا کہ ظالم کا مقابلہ کریں گے اور حق کو ستمگر سے لے کر رہیں گے) پس یہ زمانہ جاہلیت کا ایک عہد تھا اس کے باوجود صاحب شریعت اسے کھلے الفاظ میں قبول کرنے کا عزم بالجزم ظاہر کرتے ہیں بشرطیکہ انہیں اس کی دعوت دی جائے۔ یہ ان دلائل کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے کہ اتحاد و اتفاق برقرار رکھنا فرض ہے اور مسلمانوں کے درمیان تفریق اور اختلاف کا بیج بونا حرام ہے بلکہ مسلمانوں اور ان غیر مسلم اقلیتوں میں تفرقہ ایجاد کرنا بھی ناجائز و حرام ہے جو مسلمانوں کے قرب وجوار میں امن وسکون سے رہتے ہیں اور اسلامی حکومت نے جو ان کے لئے دائرہ معین کیا ہے اس سے تجاوز نہیں کرتے (زمی کافر)

جہاں تک کلمۂ حق کو سربلند کرنے 'اقتدار کو وسعت دینے اور سیادت و آقائی کو عام کرنے کا تعلق ہے تو آپ کو قرآن کریم کی کوئی آیہ کریمہ نہیں ملے گی مگر یہ کہ وہ اس کی دعوت عام دیتی

ہے اور کھلے عام مسلمانوں سے اس میں سنجیدگی سے کام لینے کا مطالبہ کرتی ہے اور ان کے لئے حرام و ناجائز ٹھہراتی ہے کہ وہ اپنے پر عائد کئے گئے اس فرض کی ادائیگی میں ذرا بھی کوتاہی دکھائیں۔ اور یہ شریعت کے واضح احکامات میں سے ہے کہ مسلمان اپنی قوم اور اپنی امت کی ترقی کا کام ترک نہ کریں یہاں تک کہ زمین سے فتنہ و فساد ختم ہو جائے اور پوری دنیا میں صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی حکمرانی برقرار ہو جائے اور سنت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیرت نبویؐ میں اتنی کثرت سے قرآنی آیات ملتی ہیں جنہیں علمائے کرام نے جمع کیا ہے اور اگر انہیں ذکر کیا جائے تو طویل جلدیں درکار ہوں گی۔ یہ ہمارے دین کا ایک ایسا حکم ہے جس میں اس دین پر ایمان لانے والے اور اس کی تعلیمات پر کاربند رہنے والے رتی برابر بھی کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رکھتے۔

کیا ان اختلافات اور حق تلفیوں کے بعد بھی ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے دین کے فرائض و واجبات کو انجام دیتے ہیں؟ ایسا کیونکر ممکن ہے جبکہ دین کے زیادہ تر احکام اسلامی نظام کے مقتدر ہونے پر موقوف ہیں پس اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ اتحاد و اقتدار اور غلبہ پانے کے رجحانات ذاتاً اور خود سے فرائض میں شامل نہیں تو کیا اس سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے فرائض کی ادائیگی ان پر موقوف ہے۔۔؟

حالانکہ ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ دو صفات ان دو ستونوں کی مانند ہیں جن پر اسلامی نظام کی عمارت کھڑی ہے۔ کیا ان دو ستونوں کو مسمار کر کے بھی ہم حساب کتاب کے دن کوئی بہانہ لا سکیں گے جس دن نہ دوستی کام دے گی نہ سفارش کارساز ہو گی اب جبکہ ہماری تعداد چار ارب (چار سو ملین ٤٠٠٠،٠٠٠،٠٠٠) ہے تو ہماری نجات کا تنہا راستہ یہ ہے کہ شریعت کے ان دو ارکان کو ثابت و استوار رکھیں۔ اگر ہم خود سے تھوڑی دیر کیلئے خلوت کریں اور ہمارے ضمیر ہمیں ملامت کر رہے ہوں گے تو کیا اس کے بعد بھی ہم اسی بدحالی پر مطمئن اور قانع ہو کر بیٹھے رہیں گے۔؟

وہ تمام بحران اور ناسور جنہوں نے ہماری عزت گھٹا دی ہے اور ہماری طاقت و شوکت کو ناچیز بنا دیا ہے جن کے مصائب و مشکلات کا تلخ گھونٹ ہم ابھی تک پی رہے ہیں اور جن کی آگ میں جل رہے ہیں یہ سب کچھ صرف اور صرف ہمارے انتشار اور تفرقہ کا نتیجہ ہے اور ایک دوسرے سے قطع تعلق کرنے اور ایک دوسرے کی مدد و حمایت سے ہاتھ اٹھانے کا انجام ہے کہ جس سے اللہ و رسولؐ نے ہمیں روکا تھا۔ اگر ہم صرف ان حقوق کو ادا کر سکتے جن کا وہ کلمہ ہم سے متقاضی ہے جو ہمارے ورد زبان رہتا ہے اور جس کی یاد سے ہمارے دلوں کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا

ہے اور وہ کلمہ ''اللہ'' جل جلالہ ہے تو کیا پھر بھی اجنبی اقوام ہمارے پورے پورے ملکوں کو ہڑپ کر سکتی تھیں اور کیا اس کے بعد بھی دشمن کی تلواریں ہمارے چہروں پر چمک سکتی تھیں؟ نیز اگر ہمارے قدم دشمن کے قلعوں میں ہوتے اور ہمارے ہاتھ اس کی پیشانی پر پڑتے تو کیا پھر بھی اس کی سازشوں کا سیاہ دھبہ ہمارے جسموں میں لگ سکتا تھا؟

مسلمان قوم کے بیٹے شریعت کی طرف سے عائد کئے گئے احکامات پر عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن کیا اس پر بھی دین و ایمان رکھتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد کئے گئے فرائض کی انجام دہی کے لئے اٹھ کھڑے ہونا چاہئے؟

''کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے یعنی یہ کہ وہ زبان سے کہیں کہ ایمان لے آئے ہیں اور ان سے کوئی امتحان نہ لیا جائے گا۔ اور بے شک ہم ان سے پہلے بھی لوگوں کو کڑی آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔ اور خداوند عالم ان لوگوں سے اچھی طرح واقف ہے جنہوں نے سچ کر دکھایا اور ان سے بھی جو کہ جھوٹے تھے''

اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مومن کی کامیابی اس میں ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اسے سچوں کی حیثیت سے پہچانتا ہو نہ جھوٹوں کی فہرست میں اور کون سی سچائی جو کہ امتحان کے بعد ظاہر ہو اور جس کے توسط سے سچے جھوٹوں سے الگ ہو جائیں کردار کی سچائی سے بڑھ کر ہو سکتی ہے۔ !کیا کوئی مسلمان یہ آرزو کر سکتا ہے کہ ہزار سال ذلت و خواری میں زندگی گزار دے جبکہ وہ جانتا ہو کہ دنیاوی زندگی کو حقیر و پست سمجھنا ہی ایمان کی نشانی ہے کیا ہم مومن ہونے اور کلمہ توحید سے سربلند ہونے کے بعد بھی ذلت و خواری اور فقر و ناداری میں سر جھکانے پر دل خوش کر سکتے ہیں؟ اور اس پر کہ دوسرے مذاہب کے لوگ آئیں اور ہمارے گھروں اور اموال و دولت کو تاراج کریں جو نہ ہمارے ہم مذہب ہیں نہ خور و خوراک میں ہم سے مشابہ ہیں اور نہ ہمارے دین کا احترام کرتے ہیں نہ ہمارے بارے میں حق و حرمت کی رعایت کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ ان کی تمام ہمتیں اس پر مرکوز رہتی ہیں کہ کسی طرح وہ لشکر بھیج دیں جو ہمیں تباہ و برباد کر دے ہمارے ملکوں کو ویران کر دے اور ہمارے بعد ان ملکوں میں اپنی قوم کے جلاد اور بدترین لوگوں کی نسلیں مسلط کر دے۔

نہیں! ہرگز نہیں!! جو لوگ اپنے ایمان میں کسی ملاوٹ کے قائل نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی مدد کرے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کا ناصر و مددگار ہو گا۔ وہی وعدہ جو اس نے اپنی کتاب میں دیا ہے اور یہ اس پر ثابت قدم ہیں کہ

''ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم'' اگر تم اللہ تعالیٰ کی مدد کرو گے تو وہ بھی

تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم بنادے گا۔

ایسے لوگ اپنی مال و دولت نچھاور کرنے اور جانیں نثار کرنے میں پل بھر کی سستی نہ کریں گے۔ حق انہیں اس کی دعوت دے رہا ہے اللہ تعالیٰ اس کا حکم صادر کر رہا ہے اور وقت اس کی آواز دے رہا ہے۔ پس کیونکر اس سے فرار کیا جا سکتا ہے!

صاحب فہم و فراست اور اللہ تعالیٰ کے نور سے ضیا پانے والے جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور دین کی عزت و شوکت اتفاق اور اہل صدق و صفا کے باہمی تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ کیا ہمارے لئے روا ہے کہ اپنی عظیم شخصیات کو رسوا ہوتے اور ملکوں کو ہڑپ ہوتے دیکھیں۔ ہمیں نظر آئے کہ جو کچھ ان ممالک میں باقی رہ گیا ہے اس پر بیرونی اقوام کے درمیان لاٹری ڈل رہی ہو اور پھر بھی کسی طرح کی حرکت و جنبش ہم سے دیکھنے میں نہ آئے۔ نہ ایک مرکز پر جمع ہو سکیں اور اس سب کے باوجود بھی اللہ و رسولؐ پر لائے گئے احکامات پر ایمان رکھنے کا عزم و جزم ظاہر کرتے رہیں۔ اگر ہم ان امور پر توجہ دیں اور انہیں خاطر میں لائیں تو ہمارے لئے کس قدر شرم کا مقام ہے۔ اور میں گمان نہیں کرتا کہ زبانی کلامی شہادتیں زبان پر جاری کرنے والے مسلمان ان امور کی جانب توجہ رکھتے ہوں۔

اتحاد کا رجحان اور آقائی و سرداری کی امنگ اور اسلامی نظام کی حفاظت کے سچے جذبے یہ خصوصیات و صفات تمام مسلمانوں کے دلوں میں ایک چھپے ہوئے خزانے کی طرح پائی جاتی ہیں تاہم گذشتہ صدیوں میں کچھ ایسے اسباب و عوامل سامنے آئے جن کی وجہ سے وہ ان صفات سے غافل ہو گئے۔ اور غافل بھی ایسے ہوئے کہ اب ان کے ضمیر دین کا پیغام قبول کرنے سے عاجز ہو گئے۔ ایک طویل عرصے سے وہ حق کی آواز نہ سن سکے جو ان کے ضمیروں کو اپنی دردناک آواز سے جھنجوڑ تا رہا لیکن وہ غفلت کی گہری نیند سو چکے تھے اور گمراہی کی وادیوں میں سرگرداں ہو گئے اس لئے کہ راستہ کھو چکے تھے۔ اس اثنا میں خوف اور دہشت ان کے وجود پر طاری ہو گیا۔ ان کی مثال ان بھٹکے ہوئے لوگوں کی مانند ہے جو اندھیری راتوں میں ویران و سنسان وادیوں میں بھٹک رہے ہوں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکار رہا ہو جبکہ مددگار اس کے ہمراہ ہو لیکن وہ اس کے وجود سے غافل ہو اور باعمل علماء اگر اپنی توجہ اس جانب مبذول کرتے کہ کچھ مسلمانوں کی آواز کچھ دوسرے مسلمانوں تک پہنچا دیں تو وہ بہت مختصر سے عرصہ میں مسلمانوں کے مختلف رجحانات اور متفرق معاملات کو ایک مرکز پر جمع کر سکتے تھے اور ایک سمت میں ہدایت کر سکتے تھے اور یہ کام ان کے لئے ہرگز مشکل نہ تھا کیونکہ اس سے پہلے ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے زمین کے ایک ٹکڑے کو غیر معمولی احترام سے نوازا تھا۔ اور ہر صاحب استطاعت مسلمان پر

فرض کیا تھا کہ وہ اس کا حج کرے۔ اسی حصہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تمام مسلمان مرد و عورت جن کا تعلق مختلف قوموں سے ہوتا ہے' یہاں جمع ہوتے ہیں۔ پس بیت الحرام کلمہ ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں بے حد عزت و احترام سے برخوردار ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے لئے زمین کے گوشہ و کنار تڑپتے ہیں اور پرسکون دلوں میں بھی اس کی بہ نسبت ایک ولولہ و اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صورتحال ہے جو مسلمانوں کے دینی عقائد کی طرف سے مہیا کی گئی ہے پس اگر تم اس میں ایک چیز کا اضافہ کر دو یعنی مسلمانوں کی توجہ ان اسباب کی طرف مبذول کر دو جن کی وجہ سے ان کے دل خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ وہ بیرونی طاقتوں کی یلغار اور ظلم و ستم سے غیر محفوظ ہیں اور مغربی اقوام نے ان کے ممالک میں جو تاخت و تاراج کی ہے اس سے عاجز آگئے ہیں یہاں تک کہ ان کے کلیجے منہ کو آگئے ہیں تو تم احساس کرو گے اور اس نتیجہ تک پہنچو گے کہ مسلمانوں کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ظہور میں آسکتی ہیں اور خود یہ احساس اس مقصد میں کوشاں افراد کی مزید حمایت و تائید کرے گا اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی اس امداد کے سائے میں جس نے اس کی نصرت کی طرف بڑھانے والے ہاتھ کو کبھی مایوس نہ کیا ہو کامیابی و کامرانی کو ان کے لئے فراہم کرے گا اور وہی میرا پروردگار ہے۔ اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا انجام ہوگا۔

مدارک

سید جمال الدین افغانی و شیخ محمد عبدہ' العروۃ الوثقیٰ' مصر: مکتبہ العرب۔ ۱۹۷۵ء
ص ۹۷۔ ۴۷۔

(یہ مقالہ سید جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد عزیز شیخ محمد عبدہ کے مجموعہ مقالات العروۃ الوثقیٰ سے لے کر ترجمہ کیا گیا ہے جو پیرس سے عربی زبان میں نشر کیا جاتا تھا۔ سید جمال کی شہادت کے بعد اس جریدے کے تمام حصوں کو جمع کر کے شائع کیا گیا اور ۱۹۷۵ء میں یہ کام استاد صلاح البستانی اور استاد عبدالباقی سرور نے کیا چنانچہ ان دونوں کے مقدموں کے ساتھ عروۃ الوثقیٰ کے شماروں کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں مختلف مقالات ہیں جن میں مذکورہ مقالہ "الوحدۃ و السیادۃ" کے عنوان سے مذکور ہے۔)

اسلامی فوج

کچھ قومیں اپنی عزت و شوکت' فرمانروائی اور کشور کشائی کے لئے افواج تشکیل دیتی ہیں اور کچھ اپنی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت اور انہیں دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لئے افواج کے وجود کو ضروری سمجھتی ہیں۔ اسلامی فوج ان سب سے ایک الگ تشخص رکھتی ہے اسلامی فوج اقتدار کی خواہش میں انسانیت کا خون نہیں کرتی اور نہ ہی اسے جنگ و جدال کی دلدل میں دھکیلتی ہے۔ تاہم حق و حقیقت اور عدل و انصاف کا پیغام پہنچانا اور مظلوموں اور محروموں کا دفاع کرنا اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔ اسلامی فوج اسلامی ممالک کی جغرافیائی سرحدوں کی پہریداری پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات کا پرچار کرتی ہے' اللہ کے قانون کی بالادستی قائم رکھتی ہے اور اسلامی و انسانی اقدار کی حفاظت کرتی ہے۔ انسانیت کی محافظ یہ فوج صرف دنیا کی ظالم و جابر طاقتوں اور فرعون وقت کے خلاف نبرد نہیں کرتی بلکہ اپنے ہر ہر سپاہی کو نفسانی خواہشات کے خلاف جنگ کرنے اور اقتدار کی ہوس' مال و زر کی لالچ' بزدلی' خوف اور اس جیسی دوسری بری صفات سے نپٹنے کا ایک جامع پروگرام تشکیل دیتی ہے۔ ابدی زندگی پر یقین رکھنے والا سپاہی جب حق و انصاف کے لئے اپنی بندوق اٹھاتا ہے اور اپنے کردار کی تعمیر کر کے خود سازی کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر سوچنے لگتا ہے تو محروم و ستم رسیدہ انسانوں کے حقوق کی حفاظت اور حق کی بالادستی کے لئے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیتا ہے۔ وہ نقصان میں نہیں رہتا اس لئے کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی اور حیات جاوید جیسی عظیم نعمت سے نوازا جاتا ہے وہ قوموں اور معاشروں میں بھی عزت و افتخار کے ساتھ زندہ رہتا

ہے اور قربانی وایثار اور شجاعت و شہامت کی مثال بن جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم اس قسم کے سپاہیوں سے تشکیل شدہ جماعت کے بارے میں فرماتا ہے۔

"الا ان حزب اللہ هم المفلحون" (مجادلہ۔۲۲)

یادرکھو کہ صرف اللہ کی جماعت ہی ہمیشہ کامیاب رہے گی

جنگ میں میدان جیت لینا ہی کامیابی نہیں ہوتی بلکہ سچی کامیابی نفس پر غالب آنے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح نفس کے سامنے ہتھیار ڈال دینا حقیقی شکست ہے۔ ہمیشہ کامیابی 'فلاح کا تصور اور ابدی زندگی کے قدسی انفاس کی تشریح اسلام نے فلسفۂ شہادت میں تفصیل سے کی ہے اور بقول علامہ اقبال : ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یوں تو سورۂ مجادلہ میں اسلامی فوج اور اللہ کی اس پسندیدہ جماعت کی اور بھی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں لیکن اس فوج کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اللہ کے سامنے سربسجود ہونے والی یہ فوج دنیا کی ان مقتدر عسکری طاقتوں کے سامنے نہیں جھکتی جو قرآن وسنت کی مخالف ہیں۔ پس جو افواج اسلامی دنیا کے خلاف سرگرم سپرپاوز پر اعتماد کرتی ہیں انہیں اسلامی افواج نہیں کہا جاسکتا اسلامی فوج کا تعلق کسی خاص خطے یا ملک و قوم سے نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی تشکیل میں نیشنلزم اور قومیت کی آمیزش شامل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جغرافیائی اور قبائلی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر یہ فوج ایک عالمی طاقت کا کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی آفاقیت کی بنیاد جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈالی تھی۔ جب آنحضورؐ حق وانصاف کے دشمنوں کے خلاف جنگ و جہاد کرتے تو مختلف قوموں کے مسلح دستے اور قبائل کی افواج ان میں ضم ہو کر اسلامی فوج کے مختلف بریگیڈ تشکیل دیتی تھیں۔ یہی کام آج اسلامی دنیا بھی کرسکتی ہے۔ اسلام کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اسلامی ممالک اپنی افواج کو ایک دوسرے میں شامل کر کے ایک نئی اسلامی فوج تشکیل دے سکتے ہیں۔ اس فوج میں ہر ملک کی فوج کو ایک بریگیڈ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ ہر بریگیڈ کی سربراہی اس ملک کی فوج کا سربراہ کرے گا اور فوج کی مرکزی قیادت کے لئے انہی میں سے کسی ایک بریگیڈ کو انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ امن وامان برقرار کرنے والی دوسری بین الاقوامی افواج کی طرح اسلامی فوج بھی صلح وآشتی کا کردار ادا کرنا چاہتی ہے لہذا عالمی برادری کو اس کی تشکیل پر کسی قسم کی تشویش نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ مسلمانان عالم کو یہ حق حاصل ہے کہ اسلامی نظریات اور اسلامی اقدار کی حفاظت کے لئے اس

قسم کی ایک فوج تشکیل دیں۔ اسلامی فوج کے عزائم جارحانہ نہیں ہوتے۔ اس کا اندازہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے اس قول سے ہوتا ہے:

"ان خاف علی بیضة الاسلام و المسلمین قاتل فیکون قتاله لنفسه لیس للسطان"

اگر اسلام اور اہل اسلام کے متعلق خطرہ ہو تو جنگ کرے یہ جنگ در حقیقت اپنی حفاظت و خود اختیاری کے لئے ہوگی نہ فرمانروائی کے لئے۔

دنیا کی دوسری کامیاب افواج کی طرح اسلامی فوج بھی اتحاد (Unity) اور تنظیم (Discipline) کے سائے میں جواں ہوتی ہے اور ان تمام تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے جو آج کی افواج کو درکار ہوتے ہیں۔ ان مشترکہ صفات کے علاوہ بھی اسلامی فوج میں کچھ ایسی صفات ہوتی ہیں جو اسے دوسری افواج سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان منفرد صفات میں سے ہم تین کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ

۲۔ انسانیت سے محبت

۳۔ دعا و مناجات

۱۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ

اسلامی فوج کے اس نمایاں وصف کو قرآن کریم نے بڑے خوبصورت پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ۳ ہجری میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات پر عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں مسلمانوں کو احد کی جنگ میں ناقابل تلافی نقصانات اٹھانا پڑے۔ ان کی خاصی تعداد کام میں آگئی۔ کچھ لوگ زخمی ہوئے اور باقی فرار کر گئے۔ لیکن اگلے دن جب دشمن نے دوبارہ حملے کا پروگرام بنایا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو دوبارہ سے جمع ہونے اور حمراء الاسد نامی مقام تک پہنچ جانے کا حکم ملا تو اسلامی فوج کے یہ سپاہی ایک بار پھر جمع ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تعداد بہت کم تھی لیکن وہ اس کے باوجود دشمن کی کثیر تعداد سے خوفزدہ نہ تھے بلکہ آخری سانس تک اپنے عقیدے کی سچائی پر جان دینے کے لئے تیار تھے۔ یہی وہ سپاہی تھے جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے تھے:

"جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو۔ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ (آل عمران۔ ۱۷۳)

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے انہی سپاہیوں کی زبان سے قرآن یہ کلیہ نقل کرتا ہے کہ:
"لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے انہوں نے کہا: بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ جائے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔"

اس حقیقت کو اسلامی فوج نے بارہا سچا کر دکھایا ہے اور اگر آج بھی مسلمان اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کریں تو وہ ہر دور کی مقتدر طاقتوں کو تجاوز سے روک سکتے ہیں اس لئے کہ مذکورہ آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ دیا ہے کہ وہ ہر دور کی اس طاقت کے ساتھ ہوگا جو حق پر ڈٹی رہے گی اور صبر و استقامت سے کام لے گی جو دشمن سے مرعوب ہونے اور مشکلات سے فرار کرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرتی ہو۔ اسلامی فوج نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ صرف آٹھویں صدی عیسوی یا پہلی صدی ہجری میں نہیں کیا بلکہ ہر دور اور ہر معاشرے میں یہ اپنی صلاحیتوں کا مکمل ثبوت فراہم کر چکی ہے۔ اسلامی فوج کے ایک نمایاں سپاہی اور جرنیل طارق بن زیاد بارہ ہزار کی ٹوٹی پھوٹی فوج کو دوڑاتے ہوئے اسپین تک لے گئے تھے اور اسپین اور اس سے ملحقہ ریاستوں کی ایک لاکھ کی مسلح افواج ان کے سامنے شکست کھا چکی تھیں۔ اس دور کے خلیفہ طارق کو مزید رسد نہیں بھیج سکتے تھے اس لئے کہ وہ اس سے پہلے ہی محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ کی جانب اسلامی فوج کا ایک حصہ روانہ کر چکے تھے تاکہ راجہ داہر اور اس کی سرپرستی میں موجود شر پسند عناصر کا حساب صاف کر سکیں لیکن خلیفہ کی طرف سے منفی جواب ملنے کے باوجود طارق نے اپنی مہم جاری رکھی۔ اگر حسد و رقابت کا ہاتھ انہیں مزید پیش قدمی سے نہ روکتا تو وہ بڑھتے ہی چلے جاتے۔ جنگ میں میدان تو دنیا کے بہت سے جرنلز بھی جیتتے رہے ہیں۔ فرانس کے نپولین بوناپارٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اس نے اٹلی پر حملہ کیا تو اس کی آرمی کے بہت سے سپاہیوں کے پاس پہننے کا مناسب سامان اور جوتے تک نہ تھے لیکن جو چیز مورد توجہ ہے وہ طارق کا ایمان اور اللہ پر بھروسہ ہے۔ انہوں نے اس نئے معرکے کو سر کرنے اور اتنی کثیر تعداد میں موجود مسلح افواج سے محاذ آرائی سے قبل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور اس کے بعد اپنے سپاہیوں سے ایک زبردست خطاب کیا۔ یہ خطاب ان کی جرات، ایمان، اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور صبر و استقامت کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے کہا:

"اے بھائیو! دشمن کی کثیر تعداد کو دیکھ کر خوفزدہ اور مایوس نہ ہو اس لئے کہ ہم اسلام کے ناصر و مددگار اور اللہ تعالیٰ کے سپاہی ہیں۔ ہمیں صرف اللہ کے نام پر جینا اور اسی کے نام پر مرنا

ہے۔ اگر دشمن تعداد اور اسلحہ و مہمات میں ہم پر برتری رکھتا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے اللہ تو ہماری مدد کرنے والا ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ اپنے سپاہیوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑا کرتا۔" اس ضمن میں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسلامی فوج جنگ کے ہتھیار اور عسکری ٹیکنالوجی کی جانب توجہ نہ دے۔ اس لئے کہ جہاں تک قرآن و سنت کا تعلق ہے تو ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام جنگ کے آلات اور عسکری فنون میں مہارت حاصل کرنے کی غیر معمولی اہمیت کا قائل ہے۔ قرآن کریم مسلمان سپاہیوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ وہ جنگ کے ایام میں دوران نماز بھی اپنے اسلحہ کو زمین پر نہ رکھیں اس لئے کہ یہ ان کے دشمنوں کی دیرینہ خواہش ہے کہ جس لمحہ بھی وہ اپنے اسلحہ سے رتی برابر غفلت برتیں تو یہ لوگ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں اور ان پر اچانک حملہ کر دیں۔ سورۂ انفال آیت نمبر ۶۰ میں مندرجہ ذیل احکامات دیئے گئے ہیں :

"اور جہاں تک تمہارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت (اسلحہ) اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوفزدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے"

اس آیہ کریمہ میں دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لئے ہر ممکن اسلحہ جمع کرنے اور جنگی حربوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے کہا گیا ہے اور مثال کے طور پر گھوڑے کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ جنگ کے لئے تیار و فراہم گھوڑے وہی حیثیت رکھتے تھے جو کم و بیش آج جنگی طیاروں کو حاصل ہے۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس مشکل ترین لمحوں میں وافر مقدار میں اسلحہ ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ جنگ احد میں آپؐ نے اس نازک لمحہ میں جبکہ مسلمانوں کی تلواریں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کا اسلحہ ختم ہو چکا تھا' ان میں سے تین نمایاں افراد کو تلواریں عطا کیں۔ ان تلواروں میں سے ایک تلوار حضرت علیؑ کو دی گئی تھی۔ کچھ جنگوں میں آپؐ نے کفار سے بھی زرہ اور اسلحہ عاریہ کے طور پر لیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسلحہ اور جنگی فنون میں مہارت حاصل کرنے کی جانب توجہ نہ دی جائے۔ تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلحہ کی پیداوار' دیکھ بھال اور تعمیر نو میں مسلمانوں کو خود کفیل ہونا چاہیے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ جنگی ٹیکنالوجی اور دنیاوی علوم میں شایان شان ترقی حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسہ کا اظہار علامہ اقبال کے اس شعر سے بھی ہوتا ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اگر چہ بظاہر اس شعر میں مومن کو بے تیغ فرض کیا گیا ہے لیکن اس سے بھی اسلحہ اور جنگی ہتھیار میں برتری حاصل کرنے کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس شعر کا بھی مرکزی خیال یہ ہے کہ اسلحہ مومن اور کافروں دونوں کے پاس ہوتا ہے اس کے باوجود مومن اپنے حریف کو اسلحہ میں برتر پا کر اس سے مرعوب ہونے اور میدان چھوڑنے کے بجائے مقابلہ کرتا ہے اور مشکلات سے نہیں گھبراتا۔ کچھ دانشوروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں جنگیں اسلحہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ خیالات و نظریات کی قوت (Power of Ideas) پر جیتی تھیں اگر چہ جزوی طور پر یہ بات صحیح ہے لیکن مسلمانوں نے صرف خالی پیلی نظریات کی طاقت پر جنگیں نہیں جیتیں بلکہ اپنی ہمت، شجاعت، جرات، ایمان کی حرارت اور ایثار کے ذریعے ان نظریات کو عملی صورت بخشی اور اللہ تعالی کی نصرت و حمایت کے سائے میں رہ کر انہوں نے دشمن سے میدان جیتا۔ اس جیت میں ان کے جذبے، سچا ایمان جدوجہد اور صبر و استقامت کو بڑا دخل حاصل ہے۔

۲۔ انسانیت سے محبت

انسانیت سے محبت اور اخلاقی اقدار کا احترام اسلامی فوج کا ایک نمایاں امتیاز ہے۔ اسلامی فوج نہ اپنے لوگوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بناتی ہے اور نہ ہی دنیا کی دوسری طاقتوں کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ انسانوں پر ظلم ڈھائیں۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں رسالت سے پہلے اور اس کے بعد بھی انسانی ہمدردی کا اعلی کردار پیش کیا۔ اس کی نمایاں مثال فتح مکہ اور دوسرے موقعوں پر سامنے آتی ہے جب آپؐ نے اپنے حریفوں اور بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ انسانی ہمدردی کی جو مثالیں آنحضرتؐ قائم کر گئے تھے اس کا خیال خاصی حد تک خلفائے راشدین کے دور میں رکھا جاتا تھا۔ مسلمان روم اور فارس کی حکومتوں کو فتح کرنے نہ گئے تھے بلکہ وہاں کے محروم و ستم رسیدہ لوگوں کو ظالمانہ طاقتوں کے شکنجے سے نکالنے آئے تھے۔ اس حقیقت کا اظہار اسلامی فوج کے ترجمان سعد بن ابی وقاص نے فارس کے سپہ سالار سے گفتگو کے دوران کیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے سپاہیوں کو سخت ہدایات جاری کرتے تھے جن میں انہیں پابند کیا جاتا تھا کہ وہ انسانی حقوق کا احترام کریں۔ بھاگتے کا پیچھا نہ کریں، کمزور پر ہاتھ نہ اٹھائیں، بچوں اور عورتوں سے بدسلوکی نہ کریں یہاں تک کہ درختوں، فصلوں اور زرخیز علاقے کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچائیں۔ اس طرح آپ نے انہیں انسانیت کے احترام کے ساتھ ساتھ فطرت (Nature) کا احترام بھی سکھایا۔ مالک اشتر کو تاریخی

فرمان میں حضرت علیؑ نے اسلامی فوج کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا تھا کہ صرف اسلامی فوج کے یہ سپاہی امن وامان کو بحال رکھتے ہیں اور نظم ونسق بر قرار کرتے ہیں۔ اس فوج کے سپہ سالار کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ اسے کمزور کے سامنے رحمدل اور مہربان ہونا چاہئے۔ خلفائے راشدین کے بعد مال غنیمت اور کشور کشائی کی لالچ میں بہت سی جنگیں لڑی گئیں جن میں اسلامی اصولوں اور انسانی حقوق کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ان جنگوں کو اسلامی فتوحات کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

۳۔ دعا اور مناجات

اسلام میں دعا کا ایک فلسفہ ہے جو اپنی جگہ اور مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ قوانین فطرت کا اعتراف اور اسباب ومسببات (Cause and Effect) کی دنیا کو قبول کرتے ہوئے دعا ایک ایسی عظیم طاقت کے ساتھ لو لگانے اور رابطہ قائم کرنے کا نام ہے جو ان کا خالق ہے اور کائنات اور اس کی ہر چیز پر برتری رکھتا ہے۔ پس بنیادی طور پر دعا اسباب و عوامل سے تضاد نہیں رکھتی بلکہ عقیدۂ توحید کا اظہار اور اللہ تعالی کی حاکمیت اعلی کا اعلان ہے۔ اللہ تعالی کو نہ ماننے والے ملحد اور مادہ پرست لوگ قوانین فطرت کو تو قبول کرتے ہیں لیکن اس ذات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس نے یہ قوانین بنائے اور جس کے قبضہ قدرت میں ان کی باگ ڈور ہے۔ ان کے بر خلاف بندہ مومن دونوں حقائق کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم دعا کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان لوگوں کو مغرور اور متکبر قرار دیتا ہے جو دعا نہیں کرتے۔

- "اپنے پروردگار سے تضرع وزاری سے دعا کرو۔ بلا شبہ وہ اہل نخوت کو پسند نہیں کرتا" (الاعراف۔ ۵۵)

قرآن مجید نے اس امر کی وضاحت کرنے میں بھی کوئی کمی نہ کی کہ اگر لوگ دعا کو نظر انداز کر دیتے تو اللہ تعالی بھی ان کی جانب کوئی توجہ نہ کرتا۔

"میرا پروردگار تمہاری جانب توجہ نہ کرتا اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں" (۷۷۔ ۶۵)

سنت میں بھی دعا کی اہمیت وافادیت پر مستقل ابواب مختص کئے گئے ہیں۔ ترمذی شریف میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث ہے کہ "دعا عبادت کا نچوڑ ہے"

دوسری افواج کی طرح اسلامی فوج بھی اسلحہ اور جنگی ہتھیار کو خاصی اہمیت دیتی ہے لیکن ان ہتھیاروں کے علاوہ بھی مسلمان سپاہی ایک ہتھیار رکھتا ہے جو اس کی دعا اور خالق کائنات کے حضور اس کی مناجات ہے۔ وہ جس طرح دوران نماز بھی ہتھیار نہیں ڈالتا اسی طرح خالق ارض

سما سے رازو نیاز کرنے میں کمی نہیں آنے دیتا۔ اس کا جسم تو اس دنیا میں ہوتا ہے لیکن اس کی روح خالق کی عبادت میں سر بسجود رہتی ہے اور اس ذات سے اپنی نجات کا راستہ اور اسباب و عوامل کی فراہمی کا عاجزانہ تقاضا کرتی ہے۔ نواسہ رسولؐ امام حسینؑ کے فرزند علی بن حسینؑ نے جب معاشرے میں مادی و دنیاوی رجحانات کو تیزی سے بڑھتے دیکھا تو معنوی اور روحانی اقدار کو زندہ کرنے کے لئے عبادت اور دعاؤں کی جانب خاص توجہ دی۔ ان کی دعاؤں کا مجموعہ "صحیفہ سجادیہ" کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی اس مجموعے میں موجود دعائیں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے اور اردو زبان میں مفتی جعفر حسین صاحب نے اس کا ترجمہ "صحیفہ کاملہ" کے نام سے اور انگریزی زبان میں ولیم سی چٹک (William.C.Chittik) صاحب نے Pslams of Islam کے نام سے اسے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں موجود دعاؤں میں صرف مرسوم عبادات اور اخلاقی اقدار کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ معاشرتی ذمہ داریاں اور انسانی حقوق اور اس جیسے دوسرے امور کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ان دعاؤں میں سے ایک دعا اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے جفاکش اور دیانتدار سپاہیوں کیلئے ہے یہ دعا ایک مسلمان سپاہی کے مقاصد اور اس کی نیک تمناؤں کو بیان کرتی ہے اور ایک سچے سپاہی کے اوصاف پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس دعا کو ہضم کر لینے کے بعد سرحدوں کی پہریداری کرنے والے سپاہی یا رینجرز (Rangers) اللہ تعالی کی عظمت و جبروت اور اس کی ختم نہ ہونے والی سلطنت پر سچے دل سے ایمان لے آئیں گے اور پھر وہ دنیا کی کسی بھی مقتدر طاقت سے نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ اس سے مقابلہ کرنے میں میدان چھوڑ بھاگیں گے۔ اس دعا کے ذریعے سے امام سجاد اسلامی معاشرے کو بھی یہ احساس دلا رہے ہیں کہ جو سپاہی اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں انہیں کس قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اس دعا کے اہم اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

سرحدوں کی حفاظت کرنے والوں کے لئے امام سجادؑ کی دعا

۱۔ بار الہا محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما اور اپنے غلبہ و اقتدار سے مسلمانوں کی سرحدوں کی حفاظت اور اپنی قوت و توانائی سے ان کی حراست کے فرائض انجام دینے والوں کو قوت عطا فرما اور اپنے خزانہء بے پایاں سے انہیں مالامال کر دے۔

۲۔ اے اللہ محمدؐ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور ان (سپاہیوں) کی تعداد بڑھا دے ' ان کے ہتھیاروں کو تیز کر دے اور ان کے حدود و اطراف اور مرکزی مقامات کی حفاظت و پاسداری

کر۔ ان کی جمعیت میں انس و یکجہتی پیدا کر' ان کے امور کی درستی فرما' رسد رسانی کے ذرائع مسلسل قائم رکھ' ان کی مشکلات کو حل کرنے کا خود ذمہ لے' ان کے بازو قوی کر' صبر کے ذریعے ان کی اعانت فرما اور دشمن سے چھپی تدبیروں میں انہیں باریک بینی سے نواز دے۔

۳۔ اے اللہ محمدؐ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور جس چیز کو وہ نہیں پہچانتے وہ انہیں پہچنوا دے اور جس بات کا علم نہیں رکھتے وہ انہیں بتا دے اور جس چیز کی بصیرت سے فاقد ہیں اس سے برخوردار کر دے۔

۴۔ اے اللہ! محمدؐ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور دشمن سے مدمقابل ہوتے وقت غدار اور فریب کار دنیا کی یاد ان کے ذہنوں سے مٹا دے' گمراہ کرنے والے مال کے اندیشے ان کے دلوں سے دور کر دے اور جنت ان کی نگاہوں کے سامنے کر دے اور جو دائمی قیام گاہیں' عزت و شرف کی منزلیں' خوبصورت حوریں' انواع واقسام (دودھ' شہد اور شربت) کی نہریں اور طرح طرح کے پھلوں سے لدے ہوئے درخت وہاں فراہم کئے گئے ہیں ان کی نظروں کے سامنے کر دے تاکہ ان میں سے کوئی دشمن کے سامنے نہ پسپائی اختیار کرے اور نہ فرار کا خیال دل میں لائے۔

۵۔ اے اللہ اس ذریعہ سے ان کے دشمنوں کے حربے کند اور انہیں بے دست وپا کر دے تاکہ وہ ہتھیار چھوڑ بھاگیں اور جن چیزوں پر ان کا سہارا ہے انہیں توڑ دے۔ انہیں ان کے سازو سامان اور آذوقے سے دور کر دے تاکہ وہ راستوں میں (اس کے حصول کے لئے) بھٹکتے پھریں اور اپنے مقصد سے دور ہو جائیں۔ ان کے دلوں کو دہشت سے بھر دے ان کی دست درازیوں کو کوتاہ کر دے اور ان کی زبانوں میں گرہ لگا دے تاکہ بولنے سے قاصر رہیں۔ ایسا کر کے تو ان کے پس پردہ موجود لوگوں کو منتشر کر دے اور ان کے انتشار سے ان کے بھی پس پشت موجود عناصر کی امیدوں پر پانی پھیر دے۔

۶۔ اے اللہ تو مسلمانوں کو ان کے ہر ہر علاقے میں برسرپیکار ہونے والے مشرکوں سے مقابلے کے لئے بھیج دے اور سپاہیوں کے ساتھ صف بستہ فرشتوں کے ذریعے سے ان کی امداد فرما تاکہ زمین کے اس خطے میں وہ اتنے مغلوب ہو جائیں کہ یا قتل کر دیئے جائیں یا قیدی بنا لئے جائیں اور یا یہ اقرار کر لیں کہ تو ہی وہ خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور تیرا کوئی شریک نہیں۔

۷۔ اے اللہ مشرکوں کو مشرکوں سے الجھا کر مسلمان ممالک کی سرحدوں پر دست درازی سے باز رکھ اور ان میں کمی واقع کر کے مسلمانوں میں نقص حاصل ہونے سے ممانعت کر۔ اور ان

میں پھوٹ ڈال دے تا کہ وہ اہل اسلام کے مقابلے میں صف آرائی نہ کر سکیں۔

۸۔ بار الہا تیرے دین و ملت والوں میں سے اگر کوئی ان کے خلاف نبرد کرے یا تیرے قانون پر چلنے والوں میں سے کوئی ان کے خلاف جنگ کرے تا کہ تیرا دین بلند، تیری جماعت مضبوط اور تیرا حصہ و نصیب کامل ہو تو اس کے لئے آسانیوں کا سامان کر، اسباب و عوامل فراہم کر اور خود سے اس کی کامیابی کی ضمانت لے۔ اس کے لئے بہترین ساتھی کا انتخاب اور تنومند اور مضبوط سواری کا انتظام کر۔ نیز اسے دل جمعی و نشاط خاطر سے بہرہ مند فرما، وطن کے اشتیاق کا ولولہ ٹھنڈا کر دے اور تنہائی کے احساس اور بیوی بچوں کی یاد میں اس کا مونس و ہمدم بن جا۔ اسے نیک نیتی عطا فرما، اس کی عافیت کا ذمہ لے اور سلامتی کو اس کا ساتھی قرار دے۔ بزدلی کو اس سے دور کر دے، جرات اس کے دل میں ڈال دے اور طاقت سے اسے نواز دے اور اپنی خاص نصرت و مدد سے اس کی تائید فرما۔ اسے (جہاد کی) رسم و راہ اور (کامیابی کے) قوانین تعلیم دے تا کہ اس کے فیصلہ میں استحکام حاصل ہو۔ دکھاوا اس سے دور ہو، شہرت کا اس میں شائبہ نہ ہو اور اس کے ذکر و فکر اور قیام و سفر کو صرف اپنے راستے میں اور اپنے لئے مخصوص کر دے۔ اور جب وہ تیرے اور اپنے دشمنوں کے مد مقابل ہو تو اس کی نظروں میں دشمن کی تعداد گرا دے اور اس کی شان و شوکت گھٹا دے۔ اسے دشمن پر غالب کر دے نہ یہ کہ دشمن کو اس پر غلبہ حاصل ہو۔ اور اگر تو نے اس کے مقدر میں شہادت ہی لکھ دی ہے تو یہ شہادت تیرے دشمنوں کو قتل کر کے کیفر کردار تک پہنچانے، انہیں گرفتار کر کے بے حال کر دینے، مسلمان ممالک کے گرد و اطراف میں امن و امان برقرار کئے جانے اور دشمن کے ان علاقوں سے انخلاء کے بعد واقع ہو!

(ترجمہ مفتی جعفر حسین، صحیفہ کاملہ، لاہور: امامیہ کتب خانہ دعا نمبر ۲۷)

اسماعیلیت

دوسری صدی ہجری آٹھویں صدی عیسوی کی بات ہے۔ بنو عباس نے خاندان بنو امیہ سے خلافت چھین لی تھی اور خود اس پر قابض ہو گئے تھے۔ یوں تو اس منصب کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اہل بیت یا خاندان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مظلومیت کا پرچار کیا تھا لیکن کرسی خلافت پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے اس خاندان پر وہ تمام مظالم ڈھائے جس کیلئے وہ بنو امیہ کی سخت مذمت کرتے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ خطرہ خاندان رسالت کے ان نمایاں افراد سے تھا جنہیں شیعہ امام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یوں تو اس سلسلے کے چھٹے امام امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنا حلقہ درس قائم کیا ہوا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان دانشوران کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے تھے جن میں حنفی فقہ کے امام امام ابو حنیفہ بھی شامل ہیں۔ لیکن مذکورہ سیاسی حالات کی وجہ سے امام صادق نے اپنے آئندہ جانشین کی امامت کا اعلان کھلے عام نہ کیا تھا۔ صرف چند خاص اور مخلص اصحاب کو معلوم تھا کہ ان کا جانشین کون ہوگا۔ اس مسئلے کی نزاکت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۴۸ھ ق. / 764 A.D. میں امام جعفر صادقؑ کی شہادت ہوئی تو منصور دوانیقی نے مدینہ میں موجود اپنے گورنر کو ہدایت دی تھی کہ جعفر بن محمد کے جانشین کی گردن اڑا دینا۔ بہر صورت اس مسئلے کو فاش نہ کیا گیا۔ امام جعفر صادقؑ کے کئی فرزند تھے جن میں اسماعیل اور عبداللہ زیادہ نمایاں تھے۔ امام صادقؑ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور زہد و تقویٰ اور عبادت میں بھی اسماعیل نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ ان اوصاف کو دیکھ کر امام صادقؑ کے بہت سے چاہنے والے یہ گمان کرنے لگے تھے کہ اسماعیل آئندہ امام بنیں گے۔ یہ ان

لوگوں کی ظاہر بینی تھی۔ بہر صورت ۱۳۶ھ میں یعنی امام صادقؑ کی زندگی ہی میں اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اسماعیل وفات پا گئے۔ یہ مسئلہ اتنا اہم تھا کہ معتبر تاریخی ذرائع کے مطابق امام نے اپنے قریبی اصحاب اور چاہنے والوں اور علماء کو جمع کیا اور اسماعیل کے چہرے پر سے کفن ہٹا کر ان تمام لوگوں سے یہ گواہی لی کہ اسماعیل وفات پا چکے ہیں۔ یہ کام اس لئے کیا گیا تاکہ مبادا لوگ اسماعیل کے بارے میں طرح طرح کے نظریئے ایجاد کرلیں۔ صادق آل محمدؐ کے شاگردوں اور چاہنے والوں کی اکثریت نے اس حقیقت کی تصدیق کی اور وہ سمجھ گئے کہ آئندہ امام کے بارے میں وہ سخت غلطی پر تھے۔ لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود بھی کچھ لوگ اسماعیل کی امامت پر مصر رہے۔ ان میں بھی دو فرقے ہو گئے۔ ایک فرقے نے یہ دعوی کیا کہ اسماعیل زندہ ہیں اور واپس پلٹ کر آئیں گے۔ جبکہ دوسرے فرقے نے اسماعیل کے چھوٹے فرزند محمد بن اسماعیل کو آئندہ امام تصور کرلیا۔ یہ لوگ دعویدار ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے اسماعیل کو اپنی زندگی میں امام بنایا تھا۔ اس دعوی کیلئے اسماعیلیت کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ بڑی وضاحت سے امام جعفر صادق کے نمایاں اقدامات کی نشاندہی کرتی ہے لیکن اس ضمن میں ایسی کوئی بات نقل نہیں کی گئی۔ مزید یہ کہ خاندان اہلبیت اور ان کے چاہنے والے اس ضمن میں تواتر سے نقل کرتے ہیں اور اس پر مکمل اتفاق رکھتے ہیں کہ امام صادق اپنے فرزند موسی کاظم کو امام معین کر گئے تھے۔ اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ اسماعیل کو امام بنایا تھا تب بھی یہ امر امامت کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ امام جس کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے اسے اپنے بعد امامت کا عہدہ سنبھالنے کی تاکید کرتا ہے۔ پس کیسے ممکن ہے کہ امام اپنی زندگی کے دوران ہی اسماعیل کو امام بنا دیتے جبکہ آپ کی حیات ہی میں اسماعیل فوت کر گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امامت کو سطحی طور پر بھی نہیں سمجھے۔ اس لئے ان کا یہ دعوی بھی ہرگز قابل قبول نہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں حضرت علی علیہ السلام کو امام معین کیا تھا۔ اس لئے کہ اس مسئلے میں شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کے بعد حضرت علیؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا کیونکہ جب تک حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیات تھے وہ خود مسلمانوں کے سربراہ اور اللہ کی حجت تھے۔ پس جب تک امام صادق حیات تھے خود امام تھے اور امامت کے طریقہ کار کے مطابق انہیں اپنے بعد کے لئے امام معین کرنا تھا۔ لہذا جب اسماعیل ان کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تو ان کی امامت کا امکان ہی سرے سے باطل ہو گیا۔ اسی طرح جب امام حسنؑ حیات تھے تو امام حسینؑ مکمل طور سے ان کی اطاعت کرتے تھے اور ان کے تابع تھے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک وقت میں دو امام نہیں

ہو سکتے اور یہ کہ جن چیزوں پر اسماعیلیت کی بنیاد رکھی گئی وہ ہی سرے سے بے بنیاد اور غلط ہیں اور اگر کوئی انصاف سے کام لے اور تاریخ و سیرت کا مطالعہ کرے اور عقیدہ امامت پر غور کرے تو وہ اس کے باطل ہونے میں ذرہ برابر بھی شک نہ کرے گا۔

شیعہ مسلک میں امامت کا فلسفہ یہ ہے کہ امام بدعتوں اور خرافات سے اللہ کے دین کو محفوظ رکھے' اسلامی تعلیمات اور اسلامی قوانین کی حفاظت کرے اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور تنازعات میں اسے حکم اور منصف اعلیٰ کا درجہ حاصل ہے۔ امام کوئی نیا دین یا شریعت نہیں لاتا بلکہ قرآن و سنت کے اصولوں کا نفاذ کرتا ہے۔ امام کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور امام صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کو بیان کرنے پر پابند ہوتا ہے اور آئندہ امام کی امامت کا اعلان کرتا ہے۔ پس ایسا نہیں کہ اسے مکمل اختیار ہو کہ جسے چاہے امام بنا دے۔ اسی طرح امام کی اور بھی بہت سی صفات ہیں جو اپنی جگہ پر بیان کی گئی ہیں۔ بہر صورت شروع سے معین کر دیا گیا تھا کہ امام بارہ ہوں گے۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے بارہ جانشین تھے جنہیں قرآن کریم نے نقیب کے نام سے یاد کیا (مائدہ۔ ۱۲) حضرت عیسیٰؑ کے بھی بارہ جانشین تھے جنہیں قرآن حواری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بھی بارہ جانشین ہیں اور اس کا اعتراف اہلسنت نے بھی کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ان سب کا تعلق قریش سے ہوگا۔ قرآن اور سنت میں امامت کے بارے میں اور بہت سے حقائق کی وضاحت کی گئی ہے جو اس مقالے کی حد سے باہر ہے۔ پس شیعہ مسلک میں امر امامت پر کبھی اختلاف اور جھگڑے نہیں ہوئے۔ اور کیونکہ امر امامت اور اس سے متعلق مسائل کو واضح کر دیا گیا تھا لہذا شیعہ اپنے اماموں کی تعداد اور ان کی شخصیت کے بارے میں کسی اختلاف کا شکار نہیں ہوئے۔ البتہ کیونکہ خلافت ان کے پاس نہ تھی لہذا ان کے حریفوں کی یہ کوشش رہتی تھی کہ ان کے درمیان اختلافات پیدا کئے جائیں یا ان میں سے کسی ایک فرد کو بھی کسی طرح بہلا پھسلا کر امام بنا دیا جائے۔ لیکن کیونکہ امام موجود ہوتے تھے لہذا ان کی یہ کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی تھیں۔ پس جس طول و تفصیل سے شہرستانی یا علامہ ابن خلدون اور ان سے متاثر ہو کر دوسرے دانشوروں نے ان میں مختلف فرقوں اور نظریات کی زائد تفصیلات بیان کی ہیں وہ افسانوی ہیں اور حقیقت سے دور ہیں۔ صرف ساتویں امام امام موسیٰ کاظمؑ کی جانشینی کے موقع پر حالات کی نزاکت کی وجہ سے شروع میں امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کا کھلے عام اعلان نہ کیا گیا اگرچہ بعد میں یہ بات واضح ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہیں سے اسماعیلیت نے اپنا راستہ الگ کر لیا اور اس کی پوری تاریخ اختلافات' باہمی جھگڑوں سے

بھری ہوئی ہے اور انجام کار یہاں تک پہنچا کہ اس دور میں امامت کا دعوی کرنے والے اسماعیلی امام آج پرنس اور شہزادے کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ بہر صورت ان تمام قوانین اور ضابطوں کے باوجود اگر امامت مشتبہ ہو جائے یعنی معلوم نہ ہو کہ امام کون ہے تو پھر اس کا فیصلہ امام میں موجود بیان کردہ صفات کے ذریعے سے کیا جاسکتا ہے۔ امام خدا کی حجت ہوتا ہے۔ اللہ کی کتاب اور سنت نبوی کا تمام موجودہ لوگوں سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ امام نئی شریعت نہیں لاتا بلکہ شریعت محمدیؐ یعنی اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کو بیان کرتا ہے۔ امام قرآن و سنت سے رتی برابر بھی انحراف نہیں کرتا۔ اگر ہم اس آخری اصول کو امامت کا معیار بنالیں تو باآسانی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کون حق پر ہے۔ کیا اسماعیلی اپنے اماموں کے بارے میں یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ انہوں نے قرآن و سنت سے انحراف نہ کیا حالانکہ ان کی تاریخ خود گواہ ہے کہ ان کی زندگیاں قرآن و سنت کی مخالفت اور اس سے انحراف میں گزر گئیں۔ حالانکہ شیعہ اثنی عشری اماموں کے بارے میں کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے قرآن و سنت سے انحراف کیا ہو بلکہ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کی حفاظت میں انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم اسماعیلیت کی تاریخ کی جانب اشارہ کریں۔ یہ تاریخ ہم نے خود اسماعیلیت کے طرفداروں کی تاریخ اور انتہائی معتبر ذرائع سے اخذ کی ہے تاکہ انصاف پسند آغاخانی اور بوہری اسے دیکھ کر خود فیصلہ کریں کہ کیا وہ حق پر ہیں؟۔ کیا وہ صحیح اسلام کے ترجمان ہیں؟ کیا اس تاریخ کے بعد بھی وہ اسماعیلیت کے اماموں کو حقیقی اور واقعی امام تسلیم کرسکتے ہیں؟ کیا وہ وقت نہیں آگیا کہ وہ اپنے عقیدے پر تجدید نظر کریں اور اسلام میں موجود نمایاں مکاتب فکر کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد مذہب حقہ کا انتخاب کریں کیونکہ یہ اندھی تقلید کہیں انہیں دوزخ میں نہ لے جائے!

قرامطہ

جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اسماعیل کی وفات کے بعد اکثریت نے راہ ہدایت کو پالیا تھا۔ صرف چند محدود لوگ تھے جو اسماعیل کی امامت پر مصر رہے۔ یہ لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک نے اسماعیل کو آخری امام تصور کرلیا اور دوسرے نے ان کے فرزند محمد بن اسماعیل کو آٹھواں امام بنالیا۔ یہ اختلافات اسماعیلیت کی تاریخ میں ہمیشہ دکھائی دیتے ہیں چنانچہ محمد بن اسماعیل کی وفات کے بعد بھی اسماعیلیوں میں مزید دو ٹکڑے ہوئے۔ ایک محمد بن اسماعیل کو آخری امام اور قائم سمجھنے لگے جو زندہ ہیں اور دوسرے گروہ نے ان کے فرزند

عبد اللہ کو اپنا امام تصور کر لیا۔ محمد بن اسماعیل کو قائم اور مہدی کا لقب دینے والا اسماعیلی گروہ قرامطہ کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے اسماعیلیت کی ابتدائی تاریخ کو تشکیل دیا۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں محمد بن اسماعیل نے ایران کے شہر دماوند میں جا کر پناہ حاصل کی جو شہر ”رے“ کے قریب ہے ان کے فرزندوں نے اس کے بعد خراسان کو اپنا مرکز بنایا۔ پانچویں صدی ہجری میں نزاری اسماعیلیت بھی ایران ہی میں ساکن ہوئی اور آپس کی کشمکش سے بچنے کے لئے انہوں نے ایران ہی کو اپنی پناہ گاہ اور وطن قرار دیا۔

اسماعیلی دانشور فرہاد دفتری کیمبرج کی شائع کردہ کتاب Ismailies:History & Doctrines میں لکھتے ہیں کہ قرامطہ محمد بن اسماعیل کو آخری پیغمبر سمجھتے تھے۔ ان کے زعم میں اولوالعزم انبیاء کی تعداد سات تھی۔ اس حوالے سے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی شک نہیں رہتا کہ قرامطہ مرتد اور کافر تھے اس لئے کہ مسلمان جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت پر اتفاق واجماع رکھتے ہیں اور یہ عقیدہ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ فرہاد دفتری اس تفصیل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسماعیلیت کے مقدس اور خفیہ مدارک و دستاویزات میں ام الکتاب شامل ہے جس کے آخری باب میں اولوالعزم انبیاء کی ترتیب یوں ذکر کی گئی ہے؛ آدم' نوح' ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ' حضرت محمدؐ اور قائم۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان اولوالعزم انبیاء (یعنی جو شریعت لے کر آئے) کی تعداد پانچ ذکر کرتے ہیں جیسا کہ اس مسئلے کو ہم ”خاتم الانبیاء“ میں بیان کر چکے ہیں۔:

(۱) حضرت نوح (۲) حضرت ابراہیم (۳) حضرت موسیٰ (۴) حضرت عیسیٰ (۵) حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ یہ تفصیل خود قرآن کریم کی ذکر کردہ ہے۔ (شوریٰ۔ ۱۳)

فاطمی خلافت

اسماعیلیت کی وہ دوسری شاخ جو محمد بن اسماعیل کے فرزند عبد اللہ کو اپنا امام تصور کرتی تھی اپنے تاریخی سفر کا آغاز کرتی ہے۔ یہ اسماعیلی اس وقت ایک نئے مرحلے میں قدم رکھتے ہیں جب ۲۹۷ھ / ۹۰۹ عیسوی میں عبید اللہ (المھدی باللہ) اپنے مریدوں کی مدد سے شمالی افریقہ میں فاطمی خلافت کا سنگ بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں گیارہواں امام بتایا جاتا ہے۔ وہ اپنے بعد اپنے جانشین کو ابوالقاسم کی کنیت اور القائم کا خطاب دیتے ہیں تاکہ اس طرح یہ ظاہر کر سکیں کہ جس مہدی کے ظہور کی پیشگوئی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی تھی وہ یہی ہیں۔ بہر حال اب اسماعیلیت کے یہ امام صرف امام نہیں بلکہ انہیں خلیفہ کے نام سے بھی

یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اس دوران مصر پر کئی حملے کرتے ہیں یہاں تک کہ سن ۳۵۸ھ / ۹۶۹ء میں مصر ان کے ہاتھوں فتح ہو جاتا ہے۔ ان کوششوں سے مسلمانوں کی یکجہتی تار تار ہو جاتی ہے اور ظاہری خلافت کے بھی کئی ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اسلامی خلافت کا زیادہ تر حصہ بنی عباس کے قبضے میں ہوتا ہے اور کچھ حصے مروان اور بنو امیہ کے خاندان کے زیر نظر ہوتے ہیں اور کچھ علاقے اور ریاستیں اسماعیلیوں کے قبضے میں آجاتے ہیں جن کی خلافت فاطمی خلافت کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔ اور ایک سو بیس سال یعنی ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء تک قائم و دائم رہتی ہے۔

یہ بات اسماعیلیوں کے لئے باعث تعجب ہوگی کہ وہ فاطمی خلفاء کو اپنا امام سمجھتے ہیں حالانکہ ان خلفاء کا اسماعیلی اماموں سے سلسلہ ملنے میں کافی شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ فرہاد دفتری نے اسماعیلیت کے انتہائی معتبر ذرائع سے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اسماعیلی نہ صرف پہلے فاطمی خلیفہ عبید اللہ المہدی کا سابقہ اسماعیلی آئمہ سے سلسلے قائم کرنے میں اختلافات کا شکار ہیں بلکہ عبید اللہ سے پہلے کے اماموں کی تعداد، اسماء اور حسب نسب میں بھی ان کے درمیان خاصے مسائل ہیں۔ یہ اختلافات اور شکوک عبید اللہ کے زمانے ہی میں پائے جاتے تھے لہذا جب عبید اللہ سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ اپنا سلسلہ امامت واضح کریں اور اپنا نسب بیان کریں تو انہوں نے موجود مسائل کو مزید الجھا دیا اس لئے کہ انہوں نے اسماعیلیت کے بانی امام اسماعیل سے اپنا سلسلہ نسب قائم کرنے کے بجائے ان کے بھائی عبد اللہ کو اپنا والد بتایا؛ علی بن حسین بن احمد بن عبد اللہ بن عبد اللہ جعفر الصادق' اس حوالے سے فاطمی خلفاء اسماعیلیت کے امام نہیں بلکہ افطحی ہیں۔ یہ مشکل دوسرے فاطمی خلیفہ محمد القائم کے بارے میں بھی ہے جن کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ وہ خود عبید اللہ کے فرزند تھے یا کسی اور سلسلہ نسب سے ان کا تعلق تھا۔ ان حقائق کا اعتراف فرہاد دفتری نے بھی کیا ہے جو خود اسماعیلی بھی ہیں اور اسماعیلیت کے انتہائی معتبر اور قیمتی دفاتر اور دستاویزات ان کے زیر نظر ہیں۔

طیبی بوہرہ جماعت

المستنصر باللہ کے زمانہ تک فاطمی خلافت مصر میں مستحکم رہتی ہے۔ ۴۸۷ھ / ۱۰۹۷ء میں جب اسماعیلی سلسلہ کے اٹھارہویں امام اور ساتویں فاطمی خلیفہ وفات پا جاتے ہیں تو ایک بار پھر اسماعیلیت میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ اندرونی و بیرونی اختلافات ابھر کر سامنے آتے ہیں المستنصر کے کچھ معتقدین ان کے بیٹے المستعالی باللہ کو ان کا جانشین اور خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ یہ لوگ المستعالی کے بعد العامر بن الحکم کو امام مانتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے

مطابق ۵۲۴ھ / ۱۱۳۰ء میں العامر بن الحکم کو مار دیا گیا تھا لہٰذا ان کے دودھ پیتے بچے اور جانشین کے وجود کے بارے میں تاریخ میں خاصے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ بہر صورت یہ حضرات ان کے بچے طیب کو آخری امام تسلیم کر لیتے ہیں۔ یعنی ان کے بارے میں یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ پردہ غیبت میں چلے گئے۔ امامت کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد ان کی جگہ داعی لے لیتے ہیں جو اسماعیلی نظریے اور دعوت کو باقی رکھنے اور اس جماعت کے امور کو چلانے کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔ اب نہ خلافت باقی رہی ہوتی ہے اور نہ امامت۔ لیکن اس جماعت کے پیرو کار دنیا کے مختلف حصوں میں اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں اور یمن، شام اور برصغیر ہند و پاک میں اس دعوت کو پھیلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ۴۶۰ھ میں داعی عبداللہ گجرات کے سرکردہ لوگوں خصوصاً وہاں کے مہاراجہ کو مستعالی اسماعیلی بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعد میں یہی اسماعیلی طیبی بوہرہ جماعت کے نام سے پہچانے جاتے ہے۔ ۹۹۹ھ میں جب اس جماعت کے ۲۶ ویں داعی مطلق اس دنیا سے رخت سفر باندھتے ہیں تو یہ جماعت بھی حسب معمول دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک سلیمانی بوہرہ جماعت اور دوسری داؤدی بوہرہ جماعت۔ تعداد، نظم و ضبط اور مذہبی اقدار پر عمل کرنے کے حوالے سے داؤدی بوہرہ جماعت زیادہ کامیاب ہے یہ لوگ امام حسینؑ کی مجالس میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ محمد برہان الدین داؤدی بوہرہ جماعت کے ۵۲ ویں داعی مطلق ہیں۔ اسماعیلیوں کے دوسرے گروہوں کے اماموں کی طرح انہوں نے بھی لندن کو اپنا مرکز قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود گجرات اس جماعت کا اہم مرکز سمجھا جاتا ہے جہاں اب بھی ان کی بڑی تعداد ہے۔ کراچی میں بھی ان کے مراکز ہیں جن میں ایک حیدری کے علاقے میں بھی ہے۔

نزاری اسماعیلی یا آغا خانی

فاطمی خلفاء جو کہ اسماعیلیت سے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوششوں میں مصروف تھے انہیں کیا معلوم تھا کہ اندرونی و بیرونی اختلافات اور باہمی رقابت ان کے زوال کا سبب بنے گی۔ چنانچہ جب المستنصر کے بعد آٹھویں فاطمی خلافت پر اختلاف ہوا تو کچھ طرفداروں نے المستعالی کو خلیفہ اور المستنصر کا جانشین بنا دیا اور ان کے لئے بیعت لے لی جبکہ باقی معتقدین نے المستنصر کے دوسرے فرزند نزار کو اپنا امام منتخب کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ انتخاب المستعالی کے طرفداروں کے لئے خوشایند نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے نزار اور ان کے فرزند الہادی کو مصر کے قید خانے میں ڈال دیا اور بعد میں قتل کر دیا۔ یہ صورتحال دیکھ کر نزار کے چند وفادار پیروکار ان کے

میں آغاخان سوم نے دنیا میں موجود اپنے تمام معتقدین سے برطانیہ کی حمایت میں لڑنے اور اس کی اعانت کرنے کے لئے کہا۔ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں ایڈورڈ سیون (Edward VII) کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے یورپ بلایا گیا۔ نیز ۱۹۱۶ء میں انہیں بمبئی کی مجلس صدارت میں پہلے درجے کا شہزادہ تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۰۷ء کے بعد سے ہی آغاخان سوم ہر سال یورپ کا دورہ کرنے لگے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے قاہرہ کی ایک نمایاں خاتون مل تھریسا میگ لیانو (Mlle Theresa Magliano) سے شادی کر لی۔ اس شادی کے نتیجے میں علی خان وجود میں آئے جو پرنس کریم کے والد تھے۔ آغاخان سوم نے اپنے بیٹے کے بجائے پوتے کو اپنا جانشین اور آئندہ امام منتخب کیا۔ پرنس کریم خان یا آغاخان چہارم (Aga Khan -IV) قاسم شاہی سلسلہ کے حاضر اور ۴۹ ویں امام ہیں۔ اپنے دادا کی طرح انہیں بھی گھڑ دوڑ' گھڑ سواری اور اس جیسے دوسرے امور سے خاصی دلچسپی ہے۔ آغاخان سوم نے اس کے علاوہ بھی بہت سی رسوم و روایات قائم کیں کہ جن کی پیروی پرنس کریم خان بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۶ء میں جب آغاخان سوم کی امامت کو ساٹھ سال گزر چکے تھے تو انہوں نے اپنے مریدوں کی طرف سے بمبئی میں برقرار کئے جانے والے جشن میں شرکت کی جس میں انہیں ہیروں میں تولا گیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آغاخانی جماعت میں ٹیکس وصول کرنے' آغاخانی نظریے کی تبلیغ کرنے اور اس نظریے کے پرچار کرنے والے داعیوں کی تربیت' ترسیل اور تقرر کا ایک منظم نظام موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ جماعت اپنے پیروکاروں کے تعلیمی اور معاشی امور کی جانب بھی خاصی توجہ دیتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فاطمی خلافت نے تعلیم اور تہذیب و تمدن کو خاطر خواہ ترقی دی لیکن کیا اسماعیلی اپنے موجودہ آغاخان کو جنہیں ہیرے جواہرات میں تولا جاتا ہے ان اماموں کی صف میں کھڑا کر سکتے ہیں جو تقوی' عدالت' انسان دوستی اور انسانیت کی خدمت کو اپنا کمال قرار دیتے تھے۔ جب ان مذکورہ اماموں پر ایران کے شاہی دربار نے ہاتھ ڈالا تو انہیں امام سے آغاخان بنا دیا اور جب انگریزوں نے ہاتھ ڈالا تو آغاخان سے پرنس اور شہزادہ بنا دیا اور اب معلوم نہیں کہ ان میں مزید کون سا گل کھلایا جائے گا اور کیا یہ امامت اب آغاخان کی بیٹیوں میں تو تقسیم نہیں ہو جائے گی۔۔۔۔؟

اسلام علم کی بات کرتا ہے ہر چیز کو دلیل اور حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی تاکید کرتا ہے تحقیق و جستجو اور غور و فکر کے بعد یقین حاصل کرنے کو ہدایت سے قریب سمجھتا ہے۔ لیکن بے چارے آغاخانیوں اور اسماعیلیوں کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے کسی گروہ یا فرقے سے مذہب پر گفتگو اور بحث و نظر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس

طرح آغاخان انہیں اپنی امامت پر باقی رکھنے' اپنی اندھی تقلید کروانے اور اپنے تمام اقدامات کو شرعی و قانونی حیثیت دینے میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔ جو شخص اس بند نظام میں کہ جس میں عقل و شعور کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اگر آواز نکالنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اسے نکال باہر کیا جاتا ہے اور وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کے سگے پرائے ہو جاتے ہیں اور کسی سے اسے ملنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ اسماعیلیت اعتراف کرتی ہے اور اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے ان تمام تاریخی اختلافات کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتی جس کے نتیجہ میں ہر دور میں اس کے اندر ٹکڑے ہوتے رہے اور مختلف فرقے اور گروہ معرض وجود میں آئے۔ نہ بوہری جماعت بتا سکتی ہے کہ کن بنیادوں پر وہ مستعال باللہ کو اپنا امام سمجھتی ہے جس نے اپنے بھائی نزار اور اس کے بچے کو مروا دیا اور نہ قاسم شاہی لوگ اس کی وضاحت کر سکتے ہیں کہ قاسم شاہی اور مومن شاہی کے جھگڑے میں کون حق پر تھا۔ اور نہ ہی یہ لوگ باہمی رقابتوں اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی محاذ آرائیوں میں انگریزوں کی حمایت کا جواز پیش کر سکتے ہیں۔!

اسماعیلیت نے ہر دور میں ایک نیا رنگ اپنایا ہے اور ایک نیا بھیس بدلا ہے۔ انھوں نے اسلام کے زندہ قوانین کو منسوخ کیا ہے اور اسلام کی عبادات کی حقیقت و طریقے کار میں عجیب و غریب طرح کی تبدیلیاں کی ہیں حالانکہ وہ پابند تھے کہ اسی طرح ان عبادات کو انجام دیتے جس طرح کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تعلیم دیا تھا۔ ان کے امام نے بہ یک جنبش قلم پردے کو منسوخ کر دیا اور قرآن مجید میں باطن اور تاویل کے نام پر ہر چیز کو جائز قرار دے دیا۔ اسی طرح تقیہ کے نام پر اپنی ہوا و ہوس اور اپنے مفادات کا خوب تحفظ کیا ہے۔ حالانکہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقولہ روایات کے مطابق اگر کوئی قرآن کریم کی آیات کو اپنی رائے کے مطابق تراشنے کی کوشش کرے اور آیہ کریمہ کے معنی اور مدعا سمجھنے کے بجائے اپنے ذہن میں موجود معانی سے مطابقت کے لئے اس کی توجیہ و تاویل کرے گا اور بہ اصطلاح تفسیر بالرائے کرے گا تو متفقہ احادیث اور مسلمانوں کے اجماع کے مطابق ایسے شخص کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اگر امامت کے یہ دعویدار سچے ہوتے تو قرآن و سنت کی حفاظت کرتے نہ یہ کہ توجیہہ و تاویل کا دروازہ کھول کر اسلامی قوانین کی تضحیک کرتے اور انہیں منسوخ کرتے۔

قال رسول اللہ من فسر القرآن برایه فقد افتری علی الله الکذب

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن میں تفسیر بالرائے کی اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ "من فسر القرآن برایه ان اصاب لم یوجرو ان اخطأ کان اثمه علیه" جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو

دودھ پیتے بچے المہتدی کو کسی طرح بچا کر ایران کے شہر الموت (Almut) لے گئے۔ یہ لوگ نزاری اسماعیلی کہلائے اور ایران میں مقیم رہے۔ ان میں بھی مزید دو فرقے ہوئے ایک قاسم شاہی اور دوسرا مومن شاہی کہلایا۔ موجودہ اسماعیلی یا آغاخانی اسی قاسم شاہی شاخ کا تسلسل ہیں۔ مومن شاہی جو کہ نزاری اسماعیلیت کی دوسری شاخ ہے دو صدیاں قبل منقرض ہو چکی ہے۔ اسے کمزور کرنے میں قاسم شاہی گروپ کی خاص خدمات قابل ذکر ہیں۔ امیر محمد بن حیدر مومن شاہی سلسلے کے چالیسویں اور آخری امام تھے۔ وہ ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء میں امام منتخب کئے گئے تھے اور ابھی بھی ان کے کچھ پیروکاروں کو شام میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بر خلاف نزاری اسماعیلیوں کی دوسری شاخ یعنی قاسم شاہی اپنا تاریخی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ لوگ ایران کو اپنا مرکز قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی برصغیر اور دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اپنی دعوت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انہیں برصغیر میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں مستعالی اسماعیلیت کئی صدیاں پیشتر اپنے قدم جما چکی تھی۔ یہ واضح نہیں کہ برصغیر میں کب ان کی دعوت کا آغاز ہوا لیکن قرائن کے مطابق ہندوستان کے شمالی علاقہ جات میں چودھویں صدی عیسوی میں ان کی دعوت پھیلی۔ اپنے وجود کو بچانے اور مستعالی اسماعیلیت کی مخالفت کے ڈر سے اس نظریئے نے صوفی ازم کا لبادہ اوڑھ لیا اور داعیوں نے خود کو مرشد اور عام لوگوں کو مرید کا لقب دیا۔ یہ لوگ صوفیت میں اس حد تک آگے بڑھے کہ بعد میں ان کے عقائد اور صوفی نظریات مخلوط و مشتبہ ہو گئے اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نزاری اسماعیلیت کے عقائد تھے یا صوفی ازم کے۔ جہاں تک خود مرکز کا تعلق ہے قاسم شاہی امام ایران میں خاصے پھیل چکے تھے۔ وہ شاہان قاجار کے دربار میں بھی نفوذ کر چکے تھے۔ ان کی اپنی ذاتی بٹالین اور دستے تھے اور وہ ایران کے ایک شہر محلات کے قلعوں میں رہتے تھے۔ ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء میں فتح علی شاہ قاجار نے قاسم شاہی سلسلے کے ۴۶ ویں امام حسن علی شاہ کو محلات میں بہت سی زمینیں دیں اور قم کا گورنر معین کیا۔ اپنی بیٹی ان کے عقد میں دی اور انہیں ''آقاخان'' کا خطاب دیا۔ اس خطاب کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اس کے بعد سے اس سلسلے کے اماموں کو آغا خان کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ ۱۲۳۵ھ / ۱۸۳۵ء میں فتح علی شاہ قاجار کے بیٹے محمد شاہ نے انہیں کرمان کا گورنر معین کیا۔ لیکن اس فرقے کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں ایران کے شاہی دربار کیلئے خوشایند نہ تھیں لہٰذا حسن علی شاہ یا آغا خان اول کے دربار سے تعلقات خراب ہو گئے اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ آغا خان اپنی ذاتی تشکیل دی ہوئی فوج اور اپنے مریدوں کی مدد سے شاہی فوج کے خلاف جنگیں لڑنے لگے۔ ان جنگوں میں انہیں سلطنت برطانیہ کی بھی مکمل پشت پناہی حاصل

رہی لیکن ایران کی افواج نے انہیں ایران ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے افغانستان کے ان علاقوں میں پناہ حاصل کی جو برطانیہ کے زیر نظر تھے۔ ابھی افغانستان مکمل طور پر برطانیہ کے قبضے میں نہ آیا تھا اور افغان حریت وشجاعت کے مظاہرے کر رہے تھے اور انگریزوں کو سبق دے رہے تھے۔ برطانیہ اور افغانیوں کے درمیان ہونے والے تمام معرکوں میں آغا خان اور ان کے پیروکاروں نے انگریزوں کا مکمل ساتھ دیا اور ان کے شانہ بشانہ مسلمانوں سے جنگیں لڑیں۔ وہ انگریزوں کی بہت حمایت اور اطاعت کرتے تھے اس امید میں کہ ایک دن انگریز انہیں مکمل حفاظت کے ساتھ ایران واپس لے جائیں گے جسے صدیوں سے ان کے آباء و اجداد نے اپنا وطن قرار دیا تھا۔ ایک سال گزارنے کے بعد آغا خان کو سندھ بھیج دیا جاتا ہے لیکن ان کے بھائی افغانستان ہی میں انگریزوں کی خدمت میں رہتے ہیں۔ سندھ میں میانی کی جنگ میں انگریزوں کے حق میں ان کی خدمات جو کہ مسلمانوں کے لئے نا قابل معافی خیانت کے مترادف تھیں' قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے نہ صرف مسلمان جرنیل ناصر خان کا ساتھ نہ دیا بلکہ رات کو سوئی ہوئی انگریز افواج کو ناصر خان کے حملے سے باخبر کر کے چوکنا کر دیا۔ اس کے بعد سندھ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ان کی انہی خدمات کے عوض سلطنت برطانیہ نے جرنیل چارلس نیپئر (Gen.Charles Napier) کی جانب سے انہیں سالانہ دو ہزار پونڈز (2000) کی پنشن جاری کی۔ اسی طرح بلوچستان کی فتح میں بھی انہوں نے اپنا خاص کردار ادا کیا۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن وسنت کا کونسا اصول یا اسلام کا کون سا قانون اور کونسا اجتہاد اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ قاسم شاہی سلسلہ کے مذکورہ امام مسلمانوں کا خون کریں اور مسلمانوں کو غلام بنانے 'ان کے مال' دولت اور عزت وناموس کو خاک میں ملانے والی انگریز قوموں کا ساتھ دیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی اسلام کے خلاف غداری اور خیانت کرنے کی مثالیں قائم کی جاسکتی ہیں؟ کیا اللہ کے قانون میں کوئی جرم اس سے بڑھ کر بھی ہو سکتا ہے۔؟

آغا خان اول زیادہ عرصے سندھ میں نہ رہے۔ وہاں سے بمبئی چلے گئے۔ اس دوران انگریزوں نے ان کی ایران میں واپسی کی کوششیں بھی کیں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ اسماعیلیت کا مرکز کچھ عرصے کیلئے بمبئی اور پھر سوئٹزرلینڈ قرار پایا۔ جو روایات آغا خان اول قائم کر گئے تھے اس کی پیروی آغا خان دوم اور سوم نے بھی کی۔ یہ لوگ بھی بڑھ چڑھ کر سلطنت برطانیہ کے لئے عظیم خدمات انجام دیتے رہے اور انعامات وصول کرتے رہے۔ لیکن اس سے خود ان اماموں کے اندر مغربیت کے اثرات کس حد تک رسوخ کرتے گئے اور ان باہمی روابط سے مسلمانوں کو کن نا قابل تلافی نقصانات کا بوجھ اٹھانا پڑا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پہلی عالمی جنگ

قرآن میں تفسیر بالرائے کرے گا اگر اس کی رائے (اتفاقاً) حقیقت کے مطابق ہوئی تو اسے کوئی اجر نہ ملے گا لیکن اگر حقیقت کے خلاف ہوئی تو اس کا گناہ اس کی گردن پر ہو گا۔

اسماعیلیت کے ذمہ دار افراد سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو اتنی آزادی دیں کہ ان کی جماعت کے لوگ کھلے ذہنوں سے دوسرے باقی مسلمانوں کے ساتھ مل کر قرآن و سنت کا مطالعہ کر سکیں۔ اسماعیلیت کے پیروکاروں سے یہ تقاضا ہے کہ اللہ تعالی کی نازل کردہ کتاب اور سنت کو محور بنا کر اس کے تناظر میں امام کی شخصیت کو معیار بنائیں۔ اس لئے کہ امام قرآن و سنت کا محافظ ہوتا ہے۔ اگر وہ پیغمبرؐ کی سیرت طیبہ اور مسلمانوں کے درمیان موجود اتفاقی قوانین کو معیار بنائیں گے تو وہ خود فیصلہ کر سکیں گے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں!

مدارک

اربلی، کشف الغمہ مطبوعہ قم

باقر قرشی، حیاۃ الامام موسی بن جعفر، نجف : مطبعۃ لآداب، جلد دوم صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۹

باقر مجلسی، بحار الانوار، بیروت : دار احیاء التراث، ۱۹۸۳، جلد ۸۹، صفحہ ۲۲۷، جلد ۳۶، صفحہ ۱۱۰

ثابت الفندی و احمد شنتناوی، دائرۃ المعارف الاسلامیہ تہران : انتشارات جہان، جلد دوم

ہاشم معروف، سیرۃ الآئمہ اثنی عشر، بیروت : دار التعارف، ۱۹۷۷، جلد دوم، صفحہ ۳۱۴

Farhad Daftary, The Ismailies: Their History& Doctrines, Cambridge Press, 1992

H.A.R Gibb & Kramers, Shorter Encyclopedia of Islam, Leiden : E.J.Bril, 1974, pp.179-181

جمع بین الصلاتین۔۔ سنت یا بدعت؟

(اہلسنت کی دیدگاہ سے)

جمع بین الصلاتین یعنی دو خاص نمازوں کو اس طرح پڑھنا کہ ان کے درمیان مختصر سا فاصلہ ہو' ایک ایسا مسئلہ ہے جو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ کچھ لوگ اسے سنت سمجھتے ہیں جبکہ کچھ اسے بدعت گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب اللہ تعالی نے مسلمانوں پر پانچ نمازیں فرض کیں اور ان کے الگ الگ اوقات معین کئے تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ قانون الٰہی اور سنت نبوی ﷺ میں تبدیلی کرے اور نماز کو ان کے مقررہ اوقات میں ادا نہ کرے۔ بظاہر ایک عام مسلمان استدلال کے اس طریقے کو پسند کرے گا لیکن اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ سنت ہے تو بات کچھ اور ہو جائے گی۔ اہلسنت کے ان علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد کہ جنہیں حدیث میں امام کا رتبہ حاصل ہے اس نتیجہ سے متفق نہیں۔ یہ لوگ دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ جمع بین الصلاتین سنت ہے اور صحابہ کرامؓ و تابعین پیغمبر اکرم ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے حسب ضرورت ظہر و عصر کی نماز اور اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کو ملا کر یعنی مختصر سے فاصلے سے پڑھتے تھے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سنت میں اس طرح کی ایک گنجائش موجود ہے کہ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد عصر کی نماز ادا کی جاسکتی ہے اور مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد عشاء کی نماز ادا کی جاسکتی ہے تو آج کے انسان کو اسی میں الجھائے رکھنا اور ہر طرح کے حالات میں پانچ

نمازوں کو ان کے الگ الگ اوقات میں ادا کرنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جس طرح خداوند عالم پسند کرتا ہے کہ اس کے عائد کردہ فرائض پر عمل کیا جائے اسی طرح یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی دی گئی چھوٹ یا رخصتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایسا کرنے سے ان لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نماز پڑھنے لگے گی جو نوکری یا کاروباری الجھنوں کی وجہ سے پانچ وقت نماز پڑھنے میں تنگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ علماء اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ لوگوں پر اسی حد تک پابندیاں عائد کریں جتنی کہ قانون الٰہی اور سنت رسول ﷺ میں موجود ہیں۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔ ہماری فلاح و کامیابی کا راز اسی میں ہے لیکن اس کامیابی تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم سنت نبوی ﷺ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس مقالہ میں ہم پہلے اہلسنت کی حدیث کے بنیادی اور اولین مآخذ کی روشنی میں اس مسئلے میں وارد ہونے والی روایات کا تفصیلی جائزہ لیں گے پھر ان کے (چاروں فقہی مذاہب کے) علماء و مشائخ کے فتووں اور آراء و افکار کا مطالعہ کریں گے اور پھر نتیجہ گیری کریں گے۔ ہم نے ان احادیث کو بے حد سنجیدگی اور دیانتداری سے نقل کیا ہے اور ان کے علماء و آئمہ کے فتاوی کو بھی حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام نووی جیسے بزرگان کے قلم سے منعکس کیا ہے۔ لیکن اگر پھر بھی کسی قاری کو ان حقائق کی صحت میں تردد ہو تو وہ دیئے گئے حوالہ جات کی روشنی میں ان کی تصدیق کر سکتا ہے۔

اس لحاظ سے ہم اس مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(ا) جمع بین الصلاتین سے متعلق احادیث و روایات

(ب) جمع بین الصلاتین کے بارے میں علماء و آئمہ دین کے فتاوی و افکار

(ج) نتیجہ گیری۔

(الف) جمع بین الصلاتین سے متعلق احادیث و روایات

(i) سفر میں جمع بین الصلاتین کا جواز

ابن عباس کی روایت

عن ابن عباس رضی الله عنهما قال كان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم، يجمع بين صلاة الظهر و العصر اذا كان على ظهر سير و يجمع بين المغرب و العشاء

صحیح بخاری سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ سفر میں ظہر و عصر کی نمازیں جمع کرتے تھے اور مغرب و عشاء کی نمازیں بھی ایک ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ روایت سنن ابن ماجہ میں بھی نقل کی گئی ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ آنحضرت ﷺ کو اس طرح کے سفر میں نہ کوئی جلدی درکار ہوتی تھی' نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہوتا تھا اور نہ ہی دشمن آپؐ کے تعاقب میں ہوتا تھا۔ ابن ماجہ اسے متعدد طریقوں سے روایت کرتے ہیں۔(۱)

عبداللہ بن عمرؓ کی روایات

پہلی روایت

صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمرؓ سے ذیل میں دی گئی روایت نقل کی گئی ہے۔

عن ابن عمر قال کان رسول الله صلی الله علیه و سلم اذا عجل به السیر جمع بین المغرب و العشاء

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول کریم ﷺ کو جب بھی سفر میں عجلت ہوتی تو آپؐ مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ ادا کرتے۔

یہ روایت سنن نسائی اور سنن داؤد میں بھی مروی ہے۔(۲)

دوسری روایت

صحیح بخاری میں ابن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسالتمآب ﷺ کو دیکھا کہ جب انہیں سفر میں عجلت ہوتی تو وہ مغرب کی نماز کو تاخیر میں ڈال دیتے یہاں تک کہ اسے اور عشاء کی نماز کو جمع کرتے۔ سالم کہتا ہے کہ عبداللہ بھی ایسا ہی کرتے تھے جب انہیں سفر کی جلدی ہوتی تو مغرب کی تین رکعت نماز ادا کرتے سلام پھیرتے اور ابھی زیادہ دیر نہ گزرتی کہ عشاء کی نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے۔

صحیح بخاری کے علاوہ یہ روایت سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں بھی نقل کی گئی ہے۔(۳)

تیسری روایت

سنن ابی داؤد سے مروی ہے کہ

ان ابن عمر استصرخ علی صفیه وهو بمکة حتی غربت الشمس و بدت النجوم فقال ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا عجل به امر فی سفر جمع بین هاتین الصلاتین فسار حتی غاب الشفق فنزل فجمع بینهما

"ابن عمر (اپنی زوجہ) صفیہ پر پہنچے جبکہ وہ مکہ کے سفر میں تھے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے (آسمان پر) دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے کہا کہ بے شک جناب ختمی مرتبت ﷺ جب بھی انہیں دوران سفر کسی کام کی جلدی ہوتی تو ان دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے پس وہ (ابن عمر) سفر کرتے رہے یہاں تک کہ شفق نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر رکے اور دونوں نمازوں کو ایک ساتھ ادا کیا۔ (۴)

انس بن مالکؓ کی روایات

صحیح بخاری کے مطابق: عن انس بن مالك رضی الله عنه قال كان النبی صلی الله عليه و سلم اذا ارتحل قبل ان تزيغ الشمس اخر الظهر الی العصر ثم يجمع بينهما و اذا زاغت صلی الظهر ثم ركب

انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ جب بھی زوال سے قبل سفر کے لئے روانہ ہوتے تو ظہر کی نماز میں عصر کے وقت تک تاخیر کرتے تھے پھر ان دونوں کو ملا کر پڑھ لیتے اور اگر (روانگی سے قبل) زوال کا وقت ہو جاتا تو ظہر کی نماز پڑھتے پھر سوار ہوتے"

یہ روایت صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں مکمل سند کے ساتھ مرقوم ہے۔ (۵)

انس بن مالک سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سفر میں عجلت کے دوران نہ صرف ظہر و عصر بلکہ مغرب و عشاء کی نمازوں میں بھی جمع کرتے تھے اور انہیں عشاء کے وقت ادا کرتے تھے۔ یہ روایات صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں بھی مروی ہیں (۶)

حدیث سالم بن عبداللہ

صحیح بخاری سے منقول ہے کہ: عن سالم عن ابيه قال كان النبی صلی الله عليه و سلم يجمع بين المغرب و العشاء اذا جدّبه السير

"سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سفر میں عجلت کے دوران مغرب و عشاء کی نمازوں کو ملا کر پڑھتے تھے۔

مسلم نے انسؓ سے دو مختلف روایات نقل کی ہیں اور اسی طرح نسائی نے بھی۔ نسائی اس کے علاوہ بھی سالم بن عبداللہ سے ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے دوران سفر نہ صرف مغرب و عشاء کی نمازوں کو بلکہ ظہر و عصر کی نمازوں کو بھی ملا کر پڑھا۔

امام مالک "الموطا" میں سالم سے نقل کرتے ہیں کہ جب ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا سفر

میں ظہر و عصر کی نمازوں کو ملا کر پڑھنا صحیح ہے تو انہوں نے جواب دیا ہاں کیا نہیں دیکھتے کہ لوگ عرفہ میں کس طرح نماز پڑھتے ہیں۔(۷)

(ii) غزوہ تبوک کے دوران جمع بین الصلاتین

معاذ بن جبلؓ کی روایات

صحیح مسلم سے روایت ہے کہ :عن معاذ بن جبل قال خرجنامع رسول الله صلی الله علیه و سلم فی غزوة تبوك فكان یصلی الظهر و العصر جمیعاً و المغرب و العشاء جمیعاً
"معاذ بن جبل کہتے ہیں کہ ہم پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ غزوہ تبوک کے سفر پر نکلے تو آنحضرتؐ ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ پڑھتے تھے اسی طرح مغرب و عشاء کی نماز ایک ساتھ ادا کیا کرتے تھے"

یہ حدیث سنن نسائی' سنن ابی داؤد' سنن ابن ماجہ اور موطا امام مالک میں بھی مروی ہے۔
صحیح مسلم میں اس کے علاوہ بھی معاذ نے ایک اور روایت نقل کی گئی ہے جس میں یہ اضافہ بھی موجود ہے کہ جب معاذ سے پوچھا گیا کہ آنحضور ﷺ کیوں ایسا کرتے تھے تو انہوں نے کہا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی امت حرج یا تنگی کا شکار ہو۔(۸)

۸۔ ابوہریرہؓ کی روایت

امام مالک موطا میں ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ غزوۂ تبوک میں ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کرتے تھے۔(۹)
غزوہ تبوک کے دوران جمع بین الصلاتین پر دوسرے صحابہ کرام سے بھی روایات نقل کی گئی ہیں لیکن ہم اب تک نقل کی گئی روایات پر اکتفا کرتے ہیں۔

(iii) مناسک حج کے دوران جمع بین الصلاتین

(الف) سرف میں

سنن ابی داؤد میں ہے کہ :عن جابران رسول صلی الله علیه و سلم غابت له الشمس بمكه فجمع بینهما بسرف
حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم مکہ میں تھے کہ زوال کا وقت ہو گیا (تاہم) آپ نے سرف کے مقام پر جمع بین الصلاتین کیا۔(سرف مکہ سے دس میل کے فاصلے پر ہے) اس

روایت کو سنن نسائی میں بھی نقل کیا گیا ہے۔(۱۰)

(ب) عرفہ میں

سنن نسائی میں نقل کیا گیا ہے کہ: جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے اپنے سفر کو عرفہ کے مقام تک جاری رکھا پھر قیام کیا یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا۔ پھر بلال نے اذان دی آنحضرت ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور آنحضورؐ نے عصر کی نماز ادا کی بغیر اس کے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی اور نماز پڑھی ہو۔"

"جمع بین الظہر والعصر" سے متعلق اس حدیث کو صحیح بخاری اور الموطا امام مالک میں سالم سے نقل کیا گیا ہے جبکہ سنن نسائی میں عبداللہ سے روایت کیا گیا ہے۔(۱۱)

(ج) مزدلفہ میں

ابو ایوب انصاریؓ کی روایت

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ: حدثنی ابوایوب الانصاری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمع فی حجتہ الوداع المغرب و العشاء بالمزدلفہ

"ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضور کونین ﷺ نے حجۃ الوداع میں مزدلفہ کے مقام پر مغرب و عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ ادا کیا۔" یہ روایت سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور الموطا امام مالک میں بھی مروی ہے۔(۱۲)

ابن عمرؓ کی روایت

سنن ابی داؤد میں مروی ہے کہ: عن عبداللہ بن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی المغرب و العشاء بالمزدلفہ جمیعاً

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ "پیغمبر اکرم ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب و عشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ ادا کیا۔

ابو داؤد اپنی مشہور سنن میں اس معنی کی ایک اور روایت ذکر کرتے ہیں جس میں یہ اضافہ ہے کہ ان دو نمازوں کو صرف ایک اقامت سے پڑھا گیا۔ ابو داؤد ابن عمر سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ ابن عمر نے حج کے دوران مزدلفہ میں ایسا کر کے دکھایا اور جب لوگوں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ آنحضرتؐ نے اس موقع اور مقام پر اسی طرح نماز

پڑھی تھی۔ یہی چیز سعید بن جبیر سے بھی روایت کی گئی ہے اور مجموعاً اس موضوع پر آٹھ راویتیں نقل کی گئی ہیں۔ ان روایات کو سنن نسائی، سنن ترمذی، صحیح بخاری اور الموطا امام مالک میں نقل کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ ترمذی نے انہیں صحیح اور نافذ العمل قرار دیا ہے۔ (۱۳)

اسامہ بن زید کی روایت

امام مالک کی الموطا میں ہے کہ :عن اسامه بن زيد انه سمعه يقول فلما جاء رسول الله المزدلفه نزل ثم اقيمت الصلاة فصلى المغرب ثم اناخ كل انسان بعيره فى منزله ثم اقيمت العشاء فصلاها ولم يصل بينهما شيئاً

اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ جب پیغمبرؐ نے مزدلفہ میں قیام کیا اور نماز اقامہ ہوئی تو آپؐ نے مغرب کی نماز پڑھی پھر سب نے اپنے جانوروں کو بٹھایا (باندھا) اور پھر عشاء (کی نماز) اقامہ ہوئی اور آپؐ نے اسے ادا کیا بغیر اس کے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی اور نماز پڑھتے۔

یہ روایت صحیح بخاری میں بھی مروی ہے البتہ جو روایت سنن ابن ماجہ میں نقل کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب و عشاء کی نماز میں مختصر فاصلہ بھی نہ تھا یعنی سلام پھیر کر آپؐ نے دوسری نماز شروع کر دی۔ اس کے برخلاف ابن ماجہ سالم سے روایت کرتے ہیں کہ ان دو نمازوں میں اتنا فاصلہ تھا کہ ہم نے اپنے حیوانوں کو بٹھادیا۔ اور پھر ہم سے فرمایا کہ "سزاوار ہے کہ یہ نماز ایک ہی اقامت سے پڑھی جائے۔" (۱۴)

عبداللہ کی روایت

عبداللہ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نماز کو اس کے (فضیلت کے) وقت میں پڑھتے تھے مگر جمع (بین الصلاتین) کے دوران اور عرفات میں۔ (۱۵) یہ روایت سفر اور حضر دونوں کیلئے ہے۔

(iv) شہر میں مقیم لوگوں کیلئے جمع بین الصلاتین

عبداللہ بن عباسؓ سے منقولہ روایات

پہلی روایت

صحیح مسلم سے روایت ہے کہ :عن ابن عباس قال صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الظهر و العصر جميعاً و المغرب و العشاء جميعاً فى غير خوف ولا سفر

ابن عباس سے مروی ہے کہ حضور مقبول ﷺ نے ظہر و عصر (کی نماز) ایک ساتھ اور مغرب و عشاء (کی نماز) ایک ساتھ ادا کی بغیر اس کے کہ سفر میں ہوں یا انہیں کسی طرح کا خوف ہو"

یہ روایت سنن نسائی (اخبرنا قتيبه عن مالك عن ابي الزبير عن سعيد ابن جبير عن ابن عباس مثله) الموطا امام مالک (حدثنی عن مالك عن ابی الزبير الملكي عن سعيد بن جبير عن ابن عباس مثله) اور سنن ابی داؤد (حدثنا القعبنی عن مالك عن ابی الزبير عن سعيد بن جبير عن ابن عباس مثله) (قال ابو داؤد رواه حماد بن سلمه نحوه عن ابی الزبير و رواه قرة بن خالد عن ابی زبير) میں متعدد اسناد کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔

صحیح مسلم میں اسی مضمون کی ایک اور روایت مندرجہ ذیل اضافے کیساتھ مروی ہے۔ ابو زبیر کہتا ہے کہ میں نے سعید سے پوچھا کہ پیغمبرؐ نے کیوں ایسا کیا۔ سعید کہتا ہے کہ یہی سوال میں نے ابن عباس سے کیا تھا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ آنحضور ﷺ چاہتے تھے کہ ان کی امت کا ایک فرد بھی حرج میں نہ پڑے۔ (۱۰)

ابن عباس کی دوسری روایت

صحیح بخاری سے روایت ہے: عن ابن عباس صلى النبي صلى الله عليه و سلم بالمدينه سبعاً و ثمانياً بالظهر و العصر و المغرب و العشاء۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے مدینہ میں ظہر و عصر کے وقت آٹھ رکعت اور مغرب و عشاء کے وقت سات رکعت نماز ایک ساتھ پڑھی۔

"بخاری شریف میں اس کی ایک اور سند ذکر کی گئی ہے (حدثنا آدم قال حدثنا شعبه قال حدثنا عمرو بن دينار قال سمعت جابر بن زيد عن ابن عباس مثله)

یہ روایت صحیح مسلم (حدثنا ابوبكر بن ابی شيبه حدثنا سفيان بن عيينه عن عمرو عن جابر زيد عن ابن عباس مثله) (و حدثنا ابو الربيع الزهرانی عن حماد عن عمرو بن دينار عن جابر بن زيد عن ابن عباس مثله) سنن نسائی (اخبرنا قتيبه قال حدثنا سفيان عن عمرو عن جابر بن زيد) اور سنن ابی داؤد (حدثنا سليمان بن حرب و مسدد......) میں مروی ہے۔

سنن نسائی میں اس کے علاوہ بھی ابن عباس سے دو مزید روایتیں نقل کی گئی ہیں جن کے

مطابق ابن عباس نے کہا کہ ہم نے پیغمبرؐ کے پیچھے مدینہ میں آٹھ رکعت نماز ایک ساتھ ادا کی۔ ان دو نمازوں کے درمیان کوئی اور (نافلہ) نماز نہ تھی۔(اخبر نا محمد بن عبدالاعلی قال حدثنا خالدقال حدثنا ابن جریج عن عمروبن دینار عن ابی الشعثاء عن ابن عباس مثلہ)

تیسری روایت

صحیح مسلم سے روایت ہے

"عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال جمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین الظھر و العصر و المغرب و العشاء بالمدینہ فی غیر خوف ولا مطر ۔ فی حدیث وکیع قال قلت لا بن عباس لم فعل ذلک قال کی لا یحرج امتہ و فی حدیث ابی معاویہ قیل لا بن عباس ما اراد الی ذلک قال اراد ان لا یحرج امتہ"

"ابن عباس سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ظہر و عصر کی نماز اور مغرب و عشاء کی نماز کو ملا کر پڑھا بغیر کسی خوف یا بارش کے۔وکیع کی روایت میں ہے کہ میں نے ابن عباس سے پوچھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا تاکہ اپنی امت کو پریشانی میں مبتلا نہ کریں۔ جبکہ ابو معاویہ کی روایت کے مطابق راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا کہ آنحضرتؐ ایسا کرنے سے کیا ارادہ رکھتے تھے۔ابن عباس نے جواب دیا کہ آنحضورؐ اپنی امت کو حرج اور تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

ابن عباس کی اس روایت اور ان کے جواب کو امام نسائی (اخبر نا محمد بن عبدالعزیزبن ابی رزمہ و اسمہ غزوان ' قال حدثنا الفضل بن موسی عن الاعمش عن حبیب بن ابی ثابت عن سعید بن جبیر عن ابن عباس) اور امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں (حدثنا عثمان بن ابی شیبہ ثنا ابو معاویہ ثنا الاعمش عن حبیب بن ابی ثابت عن سعید بن جبیر عن ابن عباس مثلہ) ذکر کیا ہے۔ابن عباس کی اصل روایت کو ابو داؤد نے توامہ کے غلام صالح سے بھی روایت کیا ہے۔امام ترمذی اس روایت اور جمع بین الصلاتین کے مذکورہ سبب کو نہ صرف ابن عباس بلکہ ابو ہریرہؓ سے بھی روایت کرتے ہیں (فی الباب عن ابی ھریرہ) وہ صحیح ترمذی مین لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو کئی سلسلوں سے نقل کیا گیا ہے۔ان راویوں میں سعید بن جبیر جابر بن زید اور عبد اللہ شقیق عقلی کا نام ذکر کرتے ہیں۔(۱۸)

ابن عباس کی چوتھی روایت

صحیح مسلم میں عبد اللہ بن شقیق عقلی سے مروی ہے کہ

”عبداللہ بن عباس نے ایک دن عصر کے بعد خطبہ دیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور (آسمان پر) تارے دکھائی دینے لگے اور لوگ کہنے لگے نماز نماز!! وہ کہتا ہے کہ ان کے پاس بنی تمیم کا ایک کھرا انسان آیا اور آکر نماز! نماز!! کہنے لگا ابن عباس اس کی سرزنش کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے: کیا مجھے سنت سکھاؤ گے۔ پھر کہنے لگے کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کو ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھتے دیکھا ہے۔ عبداللہ بن شقیق کہتا ہے کہ میرے دل میں اس کے بارے میں تردد تھا لہذا میں ابوہریرہ کے پاس گیا اور انہوں نے ابن عباس کے قول کی تصدیق کی۔

صحیح مسلم میں تقریباً اسی مضمون کی ایک اور روایت (حدثنا ابن ابی عمر حدثنا وکیع حدثنا عمران بن جریر عن عبداللہ بن شقیق) وارد ہوئی ہے جس میں ابن عباس کا جواب یوں ذکر کیا گیا ہے۔ کیا ہمیں سنت سکھاؤ گے جبکہ ہم عہد نبوی میں جمع بین الصلاتین کرتے تھے۔

سنن نسائی سے مروی ہے (اخبرنا ابو عاصم خیش بن اصرم قال حدثنا حبان بن هلال حدثنا حبیب هو ابن ابی حبیب عن عمرو بن هرم عن جابر بن زید عن ابن عباس) کہ ابن عباس نے بصرہ میں جمع بین ظہر و عصر اور مغرب عشاء کیا اور یہ کسی ضروری کام کی وجہ سے تھا اور ابن عباس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ انہوں نے مدینہ میں ظہر و عصر کی آٹھ رکعت نماز اسطرح پڑھی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی اور نماز نہ تھی۔(۱۹)

ابن عمرؓ کی روایت

صحیح بخاری میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ جب وہ امام کے ساتھ نماز پڑھنے سے رہ جاتے تھے تو جمع بین الصلاتین کرتے تھے۔(۲۰)

انس کی روایت

صحیح بخاری میں نقل کیا گیا ہے

حدثنا ابن مقاتل قال اخبرناعبدالله قال اخبرنا ابوبكر بن عثمان بن سهل بن حنيف قال سمعت ابا امامه يقول صلينا مع عمر بن عبدالعزيز الظهر ثم خرجنا حتى دخلنا على انس بن مالك فوجدناه يصلى العصر فقلت ياعم ماهذه الصلاة التى صليت قال العصر وهذه صلاة رسول الله ﷺ التى كنا نصلى معه۔

”سہل بن حنیف کہتا ہے کہ میں نے ابا امامہ کو یہ کہتے سنا کہ ہم نے عمر بن عبدالعزیز کیساتھ ظہر کی نماز ادا کی پھر ہم باہر نکل گئے اور انس کے پاس چلے گئے تو انہیں عصر کی نماز پڑھتے

دیکھا۔ میں نے ان سے پوچھا اے چچا یہ آپ نے کون سی نماز پڑھی۔ انہوں نے کہا عصر کی نماز اور یہ حضور اکرمؐ کی (تعلیم کردہ) وہ نماز ہے جو ہم ان کے عہد میں پڑھتے تھے۔"

ابن حجر عسقلانی اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابو امامہ نے شک کیا کہ جو نماز انس بن مالک نے پڑھی وہ کون سی نماز ہے پس یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ ان دو نمازوں کو بغیر طویل فاصلے کے پڑھا جا سکتا ہے۔

حضرت عائشہ کی روایت

صحیح بخاری سے روایت ہے کہ

حدثنا ابو نعیم قال اخبرنا ابن عیینہ عن الزھری عن عروۃ عن عائشہ قالت کان النبیؐ یصلی صلاۃ العصر والشمس طالعۃ فی حجرتی لم یظھر الفئی بعد

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نماز عصر پڑھتے تھے جبکہ سورج میرے حجرے کے اوپر چمک رہا ہوتا تھا اور ابھی اس کے سایہ کا وجود نہ ہوتا تھا۔

صحیح بخاری میں اسی طرح کی دو اور روایات ذکر کی گئی ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نماز عصر کو ظہر کے وقت میں ادا کر لیتے تھے۔ یہ روایات دوسری صحاح میں بھی نقل کی گئی ہیں جن میں سنن ابن ماجہ کا نام لیا جا سکتا ہے اور جمع بین الصلاتین کا بھی یہی مفہوم ہے (۲۲)

(ب) جمع بین الصلاتین کے بارے میں علماء کے افکار و نظریات

یوں تو ہم قارئین کرام کے لئے اس مسئلہ کی نسبت سے سنت نبویؐ کے تفصیلی مطالعہ کا انتظام کر چکے ہیں اور عقل و شعور اور ایمان و آگہی رکھنے والا ہر قاری اگر اس مسئلہ میں وارد ہونے والی روایات پر تھوڑا سا غور و فکر کرے تو با آسانی فیصلہ کر سکتا ہے کہ سنت کیا ہے لیکن ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں علماء کے نظریات اور ان کی آراء کو بھی نقل کریں۔ ہماری نظر میں علماء کی رائے محترم ضرور ہے لیکن اختلاف کی صورت میں حجت نہیں۔ ایسے میں صرف قرآن و سنت نبویؐ ہے جسے حجت اور دلیل کا درجہ حاصل ہے۔ علماء کی آراء اس لئے محترم ہیں کہ ان سے ہمیں قرآن و سنت کو سمجھنے میں ایک رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ لہذا اس سے خاص فرق نہیں پڑتا کہ وہ کیا فتوی دیتے ہیں اور ان کا کیا نظریہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کا نظریہ کن چیزوں پر قائم ہے، کن چیزوں کو سامنے رکھ کر انہوں نے فتوی دیا ہے اور کیا اس میں تجدید نظر اور مزید غور و فکر کی گنجائش نہیں۔۔۔؟

بہر صورت احتیاط کے پیش نظر از خود ان علماء کے نظریات نقل کرنے کے بجائے ہم

اہلسنت کے تین بڑے مشائخ حافظ ابن عربی المالکی، امام نووی اور ابن حجر عسقلانی کے بیانات اور خود ان کی عبارت کے توسط سے اس مسئلہ پر بحث کریں گے کیونکہ بلاشبہ یہ لوگ اہلسنت کے آئمہ اور فقہا کی آراء کو بہتر طور پر سمجھتے اور نقل کر سکتے ہیں۔

(۱) حافظ ابن عربی المالکی کے بیانات

حافظ ابن عربی المالکی صحیح ترمذی کی شرح "عارضتہ الاحوذی فی شرح صحیح الترمذی" میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے علماء کا یہ کہنا ہے کہ بارش اور بیماری میں جمع بین الصلاتین کی اجازت (چھوٹ) ہے اور ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے۔ گناہ کبیرہ کے ابواب میں سے ایک باب ہے اور ایسا کرنا نماز کو اس کے مقررہ اوقات سے خارج کرنے کے مترادف ہے جو تواتر سے ثابت ہو چکے ہیں جہاں تک عرفہ میں جمع کرنے (نماز کو ملا کر پڑھنے) کا تعلق ہے تو وہ تواتر کے ساتھ نقل کیا جا چکا ہے۔ لہذا کسی چیز کا نسخ بھی اسی درجہ کی چیز سے ہونا چاہئے نہ اس چیز سے جو کمتر ہو۔ ابو حنیفہ کا یہ نظریہ باطل ہے بلکہ جمع بین الصلاتین سنت ہے۔ ابن عباس نے بغیر خوف یا سفر کے جمع بین الصلاتین پر حدیث نقل کی ہے اور یہ صحیح حدیث ہے۔ نیز ان سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو جمع کیا۔ پھر ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو جب بھی دوران سفر عجلت ہوتی تو آپ ظہر کو عصر کے وقت تک اور مغرب کو عشاء کے وقت تک تاخیر میں ڈال دیتے اور پھر انہیں ملا کر پڑھتے۔ نیز انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضور مقبول ﷺ سفر میں دوران عجلت اگر زوال کا وقت ہو جاتا تو ظہر کی نماز پڑھتے پھر سوار ہو جاتے۔۔۔۔ یہ جمع بین الصلاتین کے بارے میں منقولہ احادیث ہیں اور ہماری نظر یہ ہے کہ مسافر سفر میں دوران عجلت ظہر کی نماز کو عصر کے وقت تک ملتوی کر کے جمع بین الصلاتین کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مریض بھی جمع بین الصلاتین کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی عقل کے بارے میں ڈرنے لگے۔ اور اس میں فرق نہیں کہ عصر کی نماز کو مقدم کر لے یا ظہر کی نماز کو تاخیر میں ڈالے۔ اسی طرح بارش میں کئے جانے والے جمع بین الصلاتین کو سفر کی صورت میں قیاس کیا گیا ہے کیونکہ دونوں میں مشقت اور سختی ہے تاہم خوف کی صورت میں اس کا کوئی جواز نہیں۔ البتہ شافعی کے نزدیک دوران سفر ظہر و عصر اور مغرب و عشاء میں جمع کیا جا سکتا ہے چاہے سفر کی جلدی ہو یا نہ ہو۔ یہ ایک ایسی چھوٹ ہے جو سفر میں مشقت کی وجہ سے دی گئی ہے۔ (۲۳)۔

(۲) امام نووی کی آراء

امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں جمع بین الصلاتین کے بارے میں علماء کے افکار و خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں

"شافعی اور زیادہ تر علماء کا قول ہے کہ جمع بین الصلاتین ظہر و عصر کی نمازوں میں صحیح ہے چاہے انہیں ان میں سے کسی کے وقت میں بھی ادا کیا جائے۔ البتہ مغرب و عشاء کی نماز میں جمع کرنا صرف طویل سفر میں جائز ہے۔ مختصر سفر میں شافعی کے نزدیک دو قول ہیں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ جائز نہیں۔ بارش کے دوران جمع بین الصلاتین صرف پہلی نماز کے وقت میں صحیح ہے اور زیادہ معتبر اقوال کی بنا پر دوسری کے وقت میں روا نہیں کیونکہ اطمینان حاصل نہیں ہوتا کہ بارش دوسری نماز کے وقت تک جاری رہے گی اور (پہلی کے وقت میں بھی) اس وقت نماز صحیح ہے کہ پہلی نماز کی نیت کرنے' سلام پھیرنے اور دوسری نماز شروع کرنے تک بارش جاری رہے۔ بارش میں جمع بین الصلاتین کی بہ نسبت یہی ہمارا نظریہ ہے اور اسی کو ظہر و عصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں میں اکثر علماء نے اختیار کیا ہے سوائے مالکؒ کے جو اسے مغرب و عشاء سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک بیمار و علیل لوگوں کا تعلق ہے تو شافعی اور زیادہ تر علماء اس کے لئے جمع بین الصلاتین کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن احمد اور شافعی کے اصحاب کی ایک جماعت اسے جائز قرار دیتی ہے۔ ان لوگوں کی دلیل مستحکم ہے۔ ہم ابن عباس کی روایت کی شرح کے ذیل میں اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ اور ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ جمع بین الصلاتین سفر' بیماری' بارش اور ان جیسے دوسرے اسباب میں روا نہیں سوائے عرفات میں ظہر و عصر اور مزدلفہ میں مغرب و عشاء کی نماز کے جو مناسک حج کی وجہ سے ہے اور صحیح بخاری و صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں وارد ہونے والی احادیث و روایات ان (امام ابو حنیفہ) کے خلاف دلیل اور حجت ہیں۔ ابن عمر کی حدیث صریح ہے کہ کسی ایک نماز کے وقت میں دونوں نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے اور اس حدیث سے ابو حنیفہ کی توجیہ غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ جمع سے مراد (ظاہری جمع ہے) یعنی پہلی نماز کو اس کے آخری وقت میں اور دوسری نماز کو اس کے ابتدائی وقت میں پڑھ لیا جائے۔ اسی طرح انسؓ سے منقولہ روایات صریح ہیں کہ دوسری نماز کے وقت میں جمع بین الصلاتین صحیح ہے جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ابن عمرؓ نے صرف مغرب و عشاء کے درمیان جمع کرنے کو روایت کیا ہے تو اس کی وجہ وہ حادثہ ہے جس کا انہیں سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنی زوجہ پر پہنچے تھے اور پھر تیزی سے سفر کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے مغرب و عشاء کی نمازوں کو ساتھ ادا کیا۔

یہ ذکر کر کے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کا عمل سنت کے مطابق ہے پس اس میں ہر گز یہ دلالت نہیں کہ ظہر و عصر کی نمازوں کو جمع کرنا صحیح نہیں اس لئے کہ انسؓ ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ کرام انہیں روایت کرتے ہیں۔

امام نووی اور ابن عباس کی روایات کی توجیہات

امام نووی ابن عباسؓ (اور معاذ بن جبلؓ وغیرہ) کی روایات کے بارے میں علماء کی طرف سے کی جانے والی توجیہات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"یہ روایات جو کہ (صحیح) مسلم میں وارد ہوئی ہیں آپ کے سامنے ہیں۔ البتہ علماء ان کے بارے میں مختلف توجیہات اور نظریات رکھتے ہیں یہ ترمذی اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ میری حدیث کی کتاب میں ایسی کوئی حدیث نہیں کہ امت اسے ترک کرنے میں اجماع رکھتی ہو سوائے مدینہ میں بارش و خوف کے بغیر جمع بین الصلاتین پر ابن عباس کی روایت اور شرابخور کو (حد جاری کرنے کے بعد) چوتھی مرتبہ قتل کرنے کے بارے میں حدیث۔ جہاں تک شرابخور کے بارے میں نقل کردہ حدیث کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں ترمذی کی نظر صحیح ہے۔ بلا شبہ یہ حدیث منسوخ ہو چکی ہے اور اجماع اس کے منسوخ ہونے پر دلالت کر چکا ہے لیکن جہاں تک ابن عباسؓ کی حدیث کا تعلق ہے تو علماء کے درمیان اس پر عمل ترک کرنے کے بارے میں ہر گز کوئی اجماع نہیں بلکہ وہ اس کے بارے میں مختلف اقوال رکھتے ہیں۔ امام نووی مزید لکھتے ہیں:

(پہلی توجیہ)

کچھ علماء اس حدیث کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے بارش کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کیا تھا۔ یہ ان اکابر علماء کی مشہور نظر ہے جو قدماء میں سے تھے لیکن یہ توجیہ (ابن عباس کی) اس روایت سے کمزور ہو جاتی ہے جس میں "بغیر خوف و بارش"۔۔۔۔ کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔

(دوسری توجیہ)

کچھ علماء اس حدیث کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ نے ظہر کی نماز ادا کی تو بادل چھائے ہوئے تھے۔ پھر مطلع صاف ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ عصر کا وقت ہو گیا ہے لہذا آنحضرتؐ نے عصر کی نماز پڑھی۔ یہ بھی ایک غلط توجیہ ہے کیونکہ اگر اس ضمن

میں ظہر و عصر کے بارے میں ادنیٰ احتمال دیا جاسکتا ہے تو مغرب و عشاء میں یہ احتمال ہی نہیں دیا جاسکتا۔

(تیسری توجیہ)

کچھ علماء اس حدیث کو یوں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے پہلی نماز کو اس کے آخری وقت میں ادا کیا۔ جب اس سے فارغ ہوئے تو دوسری نماز کا وقت ہو چکا تھا چنانچہ اسے بھی ادا کیا اور یوں آپ کی دو نمازیں ایک طرح کے جمع کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہ نظریہ بھی یا کمزور ہے یا سرے سے باطل ہے کیونکہ یہ توجیہ بھی ظاہر حدیث کے مخالف ہے اس طرح سے کہ اس کا احتمال بھی نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ خطبہ کے وقت ابن عباسؓ نے ایسا کر کے دکھایا جسے ذکر کیا جا چکا ہے۔ پھر اپنے اس عمل کی تائید میں ان کا پیغمبرؐ کا حوالہ دینا اور ابو ہریرہؓ کی تصدیق اور عدم انکار، صراحت کے ساتھ اس توجیہ کو غلط ثابت کر دیتا ہے۔

(چوتھی توجیہ)

کچھ اہل علم و نظر کہتے ہیں کہ جمع بین الصلاتین کو بیماری اور اس جیسے دوسرے عذروں پر حمل کیا جانا چاہئے۔ اور ہمارے اصحاب میں یہ احمد بن حنبل اور قاضی حسین کا قول ہے۔ خطابی متولی ورویانی نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے اور اس حدیث کی تاویل کے سلسلے میں بھی ہماری یہی نظر ہے اور اس کی دلیل ابن عباسؓ کا عمل اور ابو ہریرہؓ سے ان کی موافقت ہے اس لئے کہ بیماری وغیرہ میں بارش سے زیادہ مشقت ہوتی ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کچھ علماء کا یہ نظریہ ہے کہ شہر میں مقیم لوگ حسب ضرورت یا کوئی کام پڑنے پر جمع بین الصلاتین کر سکتے ہیں اگرچہ اسے اپنے لئے عادت نہ بنا لیں۔ یہ ابن سیرین اور اشہب کا قول ہے جو مالک کے طرفداروں میں سے ہیں اس قول کو خطابی نے قفال اور شاشی کبیر سے نقل کیا ہے جو کہ شافعی کے اصحاب میں سے ہیں۔ یہ لوگ اسے ابو اسحٰق مروزی سے نقل کرتے ہیں اور وہ اسے حدیث کے اہل فن کی ایک جماعت سے۔ ابن منذر نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور اس کی تائید ابن عباس کا وہ قول کرتا ہے کہ پیغمبرؐ یہ چاہتے تھے کہ ان کی امت مشکل و تنگی کا شکار نہ ہو۔ پس ابن عباس نے اس کی وجہ بیماری وغیرہ نہیں بتائی اور (باقی) خدا بہتر جانتا ہے۔" (۲۴)

۳۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کے افکار

ہم اس مسئلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے افکار کا جائزہ ان کی کتاب "فتح الباری فی شرح صحیح البخاری" سے مختلف عنوانات کے تحت لیں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

سفر میں جمع بین الصلاتین

(بخاریؒ) نے اس ضمن میں تین احادیث نقل کی ہیں۔ ابن عمر اور ابن عباس کی حدیث جو مقید ہے اور انس کی حدیث جو مطلق ہے۔ بظاہر مصنف (بخاریؒ) بھی سفر میں بطور مطلق جمع کے قائل ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ضرور قید و شرط کو ذکر کرتے۔ بہر صورت اہل علم کے لئے یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ صحابہ و تابعین کی کثیر تعداد بطور مطلق اس کی قائل ہے۔ فقہاء میں سے ثوریؒ، شافعیؒ، احمدؒ، اسحٰق اور اشہبؒ اس کے قائل ہیں۔ (اس کے برخلاف) کچھ لوگ اسے صحیح نہیں سمجھتے مگر عرفہ اور مزدلفہ میں۔ یہ حسنؒ، نخعیؒ، ابو حنیفہ اور ان کے دو شاگردوں کا نظریہ ہے۔ تاہم نووی کی نظر میں ابو حنیفہ کے دو شاگرد اس مسئلہ میں ان کے مخالف ہیں۔ یہ لوگ اس مسئلہ میں وارد ہونے والی روایات کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جو چیز واقع ہوئی وہ جمع کی ایک ظاہری صورت ہے اور وہ اس طرح سے ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مغرب کی نماز کو اس کے آخری وقت میں اور عشاء کی نماز کو اس کے ابتدائی وقت میں انجام دیا۔

ابن حجر ان لوگوں کا جواب ان جملوں میں دیتے ہیں کہ:

"آنے والے باب میں وارد شدہ احادیث میں یہ بات ثابت ہے کہ دو نمازوں میں سے ایک نماز کے وقت جمع بین الصلاتین انجام پایا اور جمع کے لفظ سے بھی یہی چیز سمجھ میں آتی ہے۔ نیز اس کے علاوہ جو چیز ظاہری جمع کو باطل کر دیتی ہے وہ آئندہ باب میں وارد ہونے والی روایات (ابن عباس و انس وغیرہ کی روایات ہیں) یہ بھی کہا گیا ہے کہ صرف وہی لوگ جمع بین الصلاتین کر سکتے ہیں جنہیں سفر کی جلدی ہو اور یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ نیز یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ جمع اس سے مخصوص ہے جو عذر رکھتا ہو اس قول کو اوزاعی سے حکایت کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جمع تاخیر (دوسری نماز کے وقت میں جمع کرنا) صحیح ہے لیکن جمع تقدیم (ظہر و مغرب کے وقت میں جمع کرنا) صحیح نہیں۔ یہ قول مالک اور احمد سے نقل کیا گیا ہے اور ابن حزم نے اسے اختیار کیا ہے۔ وہ ابن عمر کی حدیث کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس حدیث میں ان لوگوں کے خلاف واضح دلیل ہے جو جمع کی احادیث سے ظاہری جمع مراد لیتے ہیں"

امام الحرمین کی آراء

ابن حجر امام الحرمین کی آراء نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "امام الحرمین کہتے ہیں کہ ان

تمام احادیث میں وہ واضح اور صریح دلائل موجود ہیں کہ جن کے بارے میں کسی طرح کی تاویل کا کوئی امکان نہیں اور معنی (عملی) کے لحاظ سے ان کی دلیل عرفہ اور مزدلفہ کے مقام پر جمع بین الصلاتین سے کیا جانے والا استنباط ہے اس لئے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ مناسک حج کی مصروفیات کی وجہ سے ایسا کرنا حاجیوں کی عین ضرورت ہے اور یہی چیز ہر قسم کے سفر میں موجود ہے اور (اس ضمن میں دی گئی) چھوٹ یا رخصتیں صرف مناسک حج سے مخصوص نہیں مثلاً (نمازیں) قصر کرنے اور سفر کے دوران روزہ نہ رکھنا۔ یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں "انصاف کرنے والا ایک عام انسان باآسانی فیصلہ کر سکتا ہے کہ جمع بین الصلاتین کرنا (سفر میں نماز کو) قصر کرنے سے بدرجہا آسان اور قابل عمل ہے اس لئے کہ دو رکعت نماز کے لئے کھڑے ہونے والے کے لئے مزید دو رکعت کو ضمیمہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ لہذا بین الصلاتین کی آسودگی و نرمی واضح ہے کیونکہ مسافر کا سفر کو روک کر اترنا باعث دشواری ہے اور اسی نکتہ کو ان علماء نے دلیل بنایا ہے جو صرف دوران عجلت سفر میں جمع بین الصلاتین کی اجازت دیتے ہیں۔"

انس کی روایت پر ایک تحقیق

ابن حجر عسقلانی انس بن مالکؓ کی اس روایت پر کہ جب آنحضورؐ زوال سے پہلے روانہ ہوتے تو ظہر کو عصر کے وقت تک تاخیر میں ڈال دیتے اور پھر ان دونوں میں جمع کرتے اور اگر روانگی سے پہلے زوال ہو جاتا تو ظہر کی نماز پڑھتے اور سوار ہو جاتے' اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اس روایت کے مطابق جمع بین الصلاتین صرف دوسری نماز کے وقت ممکن ہے اور اسی روایت کو ان لوگوں نے دلیل بنایا ہے جو جمع تقدیم (ظہر کے وقت میں جمع بین الصلاتین) کے مخالف ہیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں لیکن اسحٰق بن راہویہ نے اس حدیث کو شبابہ سے نقل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ:

"آنحضرتؐ جب سفر میں ہوتے اور زوال کا وقت ہو جاتا تو ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کرتے اور پھر سفر کے لئے نکلتے۔"

اس روایت کو اسماعیلی اور اعلیٰ نے ذکر کیا ہے تاہم اسحٰق اسے شبابہ سے نقل کرنے میں تنہا ہیں اور فریابی بھی اس روایت کو اسحٰق سے نقل کرنے میں تنہا ہے لیکن اس سے روایت کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس جیسی ایک روایت کو حاکم نے "اربعین" میں نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ۔ "حدثنا محمد بن یعقوب الا صم حدثنا محمد بن اسحق الصغانی و هو احد

شیوخ مسلم قال حدثنامحمد بن عبدالله الواسطی فذکر الحدیث"
"ہمیں خبر دی محمد بن یعقوب اصم نے اس نے کہا ہمیں خبر دی اسحٰق صغانی نے جو کہ مسلم کے مشائخ میں سے ہیں انہوں نے کہا ہمیں خبر دی محمد بن عبداللہ واسطی نے اور پھر حدیث کو ذکر کیا۔ اربعین کے بہت سے نسخوں کی چھان بین کرنے کے بعد اس حدیث کو اس طرح پایا گیا کہ اس میں نماز عصر کا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی سند بھی اچھی ہے۔"

ابن حجر مزید لکھتے ہیں کہ : یہ اسحٰق بن راہویہ کی ایک مستحکم پیروی ہے۔

ابن حجر اور ابن عباسؓ کی روایات

ابن عباسؓ سے نقل ہونے والی روایات کے بارے میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ :

"ابن عباسؓ کی اس حدیث پر کہ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے وقت آٹھ اور سات عدد رکعات پڑھیں۔ راوی نے کہا کہ شاید ایسا بارش میں ہوا۔ مالک نے بھی اس حدیث کے ذیل میں یہ احتمال دیا ہے کہ ایسا بارش میں ہوا ہوگا۔ لیکن مسلم اور دوسرے اصحاب جو کہ صاحب صحاح و سنن ہیں' روایت کرتے ہیں کہ 'من غیر خوف ولامطر' یعنی بغیر کسی خوف اور بارش کے۔ اس سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ جمع بین الصلاتین خوف یا سفر یا بارش کے سبب انجام پایا۔

کچھ علماء کا خیال ہے کہ بیماری کی حالت میں جمع بین الصلاتین صحیح ہے لیکن ہمیں اس میں اعتراض ہے اس لئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کی وجہ سے ایسا کرتے تو وہی لوگ ان کی اقتدا کر سکتے تھے جو یہی عذر (مرض) رکھتے ہوں جبکہ بظاہر پیغمبر ﷺ نے اپنے تمام اصحاب کے ساتھ اس نماز کو ادا کیا اور اس کی صراحت ابن عباس نے بھی اپنی روایت میں کی ہے۔

ابن حجر امام نوویؒ سے جمع ظاہری کی توجیہ (تیسری توجیہ) بھی نقل کرتے ہیں کہ جسے امام نووی مسترد کر چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جس چیز کو نووی نے ضعیف قرار دے دیا اسے قرطبیؒ نے پسند کیا ہے اور اس سے پہلے امام الحرمین نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ نیز قدماء میں سے ابن ماجشون اور طحاوی اس پر یقین رکھتے ہیں اور ابن سید الناس نے اسے مضبوط قول قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے کہ ابی شعثاء حدیث کا راوی اس حدیث کو زیادہ بہتر جانتا تھا۔ لیکن میری نظر میں خود راوی بھی اس پر یقین نہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ چیز جمع ظاہری کی تقویت کا باعث ہے کہ کوئی حدیث بھی جمع بین الصلاتین کے اوقات سے متعرض نہیں ہوتی لہذا ظاہری جمع بہتر ہے اور

(باقی) خدا بہتر جانتا ہے"

وہ آگے چل کر اپنے اسی قول کو مسترد کر دیتے ہیں :

"آئمہ کی ایک جماعت یہ نظر رکھتی ہے کہ ظاہر حدیث پر عمل کرنا چاہئے لہذا یہ لوگ حضر (سفر نہ کرنے کی صورت) میں بطور مطلق جمع بین الصلاتین کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں بشرطیکہ کوئی کام یا ضرورت ہو اور اسے عادت نہ بنا لیا جائے۔ ان میں ابن سیرین' ربیعہ' اشہب' ابن منذر قفال الکبیر شامل ہیں اور خطابی نے اس قول کو حدیث کے اہل فن کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ ان لوگوں کے حق میں ابن عباس کی اس روایت (پہلی روایت) کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جسے مسلم نے سعید بن جبیر کے توسط سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ سرور کائنات ﷺ چاہتے تھے کہ ان کی امت کا کوئی فرد بھی دشواری و تنگی کا شکار نہ ہو اور ابن عباس کی وہ روایت جسے نسائی نے عمرو بن ہرم کے ذریعے سے ابو الشعثاء سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے بصرہ میں ظہر و عصر کی نماز پڑھی اور اس عمل کو نبی اکرم ﷺ سے نسبت دی۔ اور مسلم کی روایت عبداللہ بن شقیق سے کہ ابن عباس نے خطبہ دیا یہاں تک کہ ستارے دکھائی دینے لگے جس میں ابوہریرہؓ کی تصدیق بھی شامل ہے اور ابن عباس کا بطور مطلق مذکورہ سبب بیان کرنا کہ امت تنگی و دشواری کا شکار نہ ہو (اور بغیر کسی شرط کے) جمع بین الصلاتین پر واضح دلیل ہے۔ اسی جیسے سبب کو ابن مسعود سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس روایت کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور حرج کی نفی کی صورت میں روایت سے ظاہری جمع کے معنی نہیں لئے جا سکتے کیونکہ ظاہری جمع کا ارادہ کرنا' حرج اور تنگی سے خالی نہیں۔ (۲۵)

(ج) نتیجہ گیری

اب تک جمع بین الصلاتین کے بارے میں وارد ہونے والی روایات جو کہ سنت میں شامل ہیں اور علماء کے اقوال و نظریات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ حضور مقبولؐ کی یہ کوشش تھی کہ نماز کو ان کے مخصوص اوقات میں الگ الگ ادا کیا جائے جو کہ نماز کی فضیلت کے اوقات ہیں لیکن جنگ' سفر' حج اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے آپ اکثر اوقات جمع بین الصلاتین کرتے تھے تاکہ اس طرح آپؐ کی امت کسی قسم کی دشواری یا مشکل کا شکار نہ ہو۔ یہ مسئلہ اتنا واضح تھا کہ صحابہ کرام آنحضور ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے بسا اوقات جمع بین الصلاتین کرتے تھے لیکن تابعین کے دور میں یہ مشکل پیش آئی کہ پیغمبر کیوں ایسا کرتے تھے ۔۔۔؟ اور کیا ایسا کرنا صرف خاص حالات میں روا ہے اس پر ابن عباسؓ' ابن مسعودؓ اور معاذ بن

الصلاتین کرتے تھے لیکن تابعین کے دور میں یہ مشکل پیش آئی کہ پیغمبر کیوں ایسا کرتے تھے ۔۔۔؟ اور کیا ایسا کرنا صرف خاص حالات میں روا ہے اس پر ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور معاذ بن جبلؓ جیسے اکابر صحابہ نے کہ جن کا قول سند کا درجہ رکھتا ہے' یہ کہا کہ حضور اکرم ﷺ اس طرح اپنی امت کو دشواری و تنگی سے بچانا چاہتے تھے۔ اور اسی لئے اہلسنت کے علماء و فقہا کی ایک جماعت نے کہ جن کا نام ذکر کیا جا چکا ہے بغیر سفر یا بیماری یا خوف کے مطلق طور پر جمع بین الصلاتین کے جواز کا فتویٰ دیا۔ اہلسنت کے باقی علماء بھی جمع بین الصلاتین کو سنت تو مانتے ہیں لیکن خاص روایات سے استشہاد کرتے ہوئے صرف خاص شرائط میں اس کی اجازت دیتے ہیں اور ابن عباس کی حدیث کی مختلف توجیہات کرتے ہیں۔ جمع بین الصلاتین کی تائید قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے اس لئے کہ قرآن میں بھی بنیادی طور پر نماز کے تین اوقات ذکر کیے گئے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے امام فخر رازی اور ابن کثیر کی تفسیر کی جانب رجوع کیا جا سکتا ہے۔ (اسراء۔ ۷۸)

قارئین کرام اور دانشور حضرات نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس مسئلہ میں وارد ہونے والی روایات اتنی واضح اور صریح ہیں کہ کسی قسم کی توجیہ یا تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اسی لئے امام نووی اور ابن حجر عسقلانی جمع بین الصلاتین کے خلاف کی گئی توجیہات کو مسترد کر چکے ہیں اور بطور مطلق جمع بین الصلاتین کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ شروع میں محسوس ہوتا ہے کہ امام نووی بیماری یا کسی دوسرے عذر کی صورت میں جمع بین الصلاتین کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن آخر میں وہ خود اس توجیہ کو مسترد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن عباس نے جمع بین الصلاتین کا سبب بتایا لیکن اس میں کہیں بھی بیماری کا ذکر نہیں آیا اور اگر بالفرض وہ بیماری اور اس جیسی صورتوں میں کی گئی اس توجیہ کو قبول بھی کرتے ہوں تو ابن حجر اسے غلط ثابت کر چکے ہیں۔ اسی طرح ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر اس توجیہ کو اختیار کرتے ہیں جس میں جمع بین الصلاتین سے جمع کی ظاہری صورت لی گئی ہے (تیسری توجیہ) لیکن بعد میں خود اسے مسترد کر دیتے ہیں البتہ ان کا یہ دعویٰ کسی طرح صحیح نہیں کہ اس مسئلہ میں وارد ہونے والی روایات میں جمع بین الصلاتین کے اوقات کا کوئی ذکر فکر نہیں آیا اس لئے کہ جو روایت اب تک ذکر کی گئی ہیں ان میں واضح بتلایا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ جس طرح سے ظہر کے وقت میں ظہر و عصر کی نمازوں میں جمع کرتے تھے اسی طرح عصر کی نماز کے وقت میں ان دونوں نمازوں کو ملا کر پڑھتے تھے۔ نیز اسی طریقے کو وہ مغرب و عشاء کی نمازوں میں اختیار کرتے تھے۔ کیا اس سے زیادہ بھی جمع بین الصلاتین کے اوقات کی وضاحت ہو سکتی ہے۔۔۔؟ اور کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ ان دونوں کے مشترکہ اوقات ہیں۔

اور نخعی ہیں۔ ان حضرات کا یہ قول صحابہ و تابعین اور فقہاء کی اس جماعت کے خلاف ہے جو اسے سنت سمجھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور اگر نہ کہا جائے کہ یہ قول اجماع کے خلاف ہے تو کم از کم اکثریت قریب الاتفاق کے خلاف ضرور ہے لہذا اسے شاذ یا نادر کہا جائے گا۔ ان لوگوں کی دلیل بھی چنداں مستحکم نہیں اسی لئے حافظ ابن عربی المالکی' حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام نووی نے با آسانی اسے مسترد کر دیا ہے یہاں تک کہ امام نووی کے مطابق امام ابو حنیفہ کے دو شاگرد بھی اس مسئلہ میں ان کے مخالف ہیں۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کا یہ دعوی صحیح نہیں کہ جمع بین الصلاتین گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ جس روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے اس کو امام ترمذی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں اور اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ امام احمد اور حدیث کے دوسرے اہل فن نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ نیز ان کا یہ کہنا کہ نماز کے اوقات تواتر سے ثابت ہیں اور ان کو منسوخ کرنے کے لئے بھی اس جیسی چیز ہونی چاہئے اگرچہ یہ کلیہ صحیح ہے لیکن یہ کہاں سے معلوم کہ نماز کے جو اوقات تواتر سے ثابت ہوں وہ ان کے مخصوص اوقات ہیں اور مشترک اوقات نہیں؟ کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے متعدد مقامات پر نمازوں کو ملا کر پڑھا اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی نئی چیز ہوتی تو صحابہ ضرور سوال کرتے اور پوچھتے کہ آپ نے کیوں ظہر کے وقت ظہر و عصر کی نماز پڑھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں نمازوں کا مشترکہ وقت ہے ظہر یا عصر کا مخصوص وقت نہیں۔ لہذا کوئی چیز منسوخ نہیں ہوئی تاکہ اس جیسی دلیل لائی جائے۔ بلکہ پیغمبر اکرم ﷺ کا الگ الگ پڑھنا اور ایک ساتھ پڑھنا اس کی دلیل ہے کہ الگ الگ پڑھنا فرض نہیں سنت ہے اور یہ مسئلہ عبد اللہ کی اس روایت سے حل ہو گیا ہے جو مناسک حج میں روایت کی گئی ہے۔ اگر بالفرض ہم امام ابو حنیفہ کے قول کو اختیار کریں تو اس سے نہ صرف اکابر صحابہ و تابعین اور مدینہ کے فقہائے سبعہ اور اہلسنت کے تقریباً تمام علماء و فقہا کی مخالفت لازم آئے گی بلکہ اس طرح وہ تمام روایات بھی مطرود ہو جائیں گی جو اس مسئلہ میں وارد ہوئی ہیں اور یوں احادیث کے وہ ماخذ اور صحاح بھی زیر سوال آجائیں گے جن میں یہ روایات نقل ہوئی ہیں اس لئے کہ ان کی تعداد ایک یا دو نہیں بلکہ یہ کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس ایک مسئلہ میں کوئی اس حد تک امام ابو حنیفہ کے فتوے کی حمایت کرے گا؟ تاہم دوسرے مسائل میں ان کے فتاوی اپنی قوت پر باقی ہیں۔

اگر جمع بین الصلاتین سے ہٹ کر بھی اوقات نماز کے بارے میں سنت رسول کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ آنحضور ﷺ اس مسئلہ میں نرمی برتتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس موضوع سے متعلق زیادہ تر روایات کو ہم صحیح بخاری سے نقل کر رہے ہیں۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب زیادہ لوگ جمع ہو جاتے تو پیغمبرؐ نماز عشاء کو مقدم کر دیتے اور جب لوگ کم ہوتے تو آپؐ اسے تاخیر میں ڈال دیتے۔

بخاریؒ ابو برزہ سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ اکثر اوقات عشاء کی نماز کو تاخیر سے پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ پیغمبرؐ عشاء کی نماز کو رات کی پہلی ایک تہائی تک پڑھتے تھے جبکہ ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ آدھی رات تک بھی نماز عشاء پڑھتے تھے۔

صحیح بخاری اور دوسری صحاح میں کثرت سے ایسے شواہد ملتے ہیں جن کی روشنی میں با آسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ رات دیر تک بھی نماز عشاء ادا کرتے تھے۔

مثال کے طور پر صحیح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبرؐ کو کچھ کام تھا۔ ہم نے ان سے طے کر لیا تھا لہذا آپؐ نے بہت تاخیر سے نماز عشاء ادا کی اور پھر فرمایا:

""تم پر بشارت ہو کہ تمہارے علاوہ کوئی اور اس وقت نماز نہیں پڑھ سکتا" اس طرح کی عبارت دوسری روایتوں میں بھی وارد ہوئی ہے ایک اور روایت میں عبد اللہ بن عمرؓ، سالمؒ اور دوسرے صحابہ کہتے ہیں کہ ہم کئی مرتبہ سوئے اور جاگے پھر جا کر پیغمبرؐ نے عشاء کی نماز پڑھی۔ یا آنحضورؐ کی یہ حدیث کہ "اگر میں اپنی امت کو مشقت میں نہ ڈالنا چاہتا تو انہیں اس طرح نماز پڑھنے کے لئے کہتا" یا یہ قول کہ سخت گرمی میں نماز ظہر کو ٹھنڈک کے وقت تک تاخیر میں ڈال دو۔ یہ روایات کثرت سے صحیح بخاری اور سنن ابن ماجہ میں مروی ہیں اور جمعہ کی نماز کے بارے میں بھی بخاری یہی قول نقل کرتی ہے۔ نیز حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ نماز عصر ادا کرتے تھے جبکہ سورج سر کے اوپر ہوتا تھا ابھی اس کا سایہ ظاہر نہیں ہوا ہوتا تھا اور اسی طرح آنحضرتؐ کا یہ ارشاد جسے سنن نسائی میں نقل کیا گیا ہے کہ "جب بھی تمہیں کسی کام کے فوت ہو جانے کا خطرہ ہو تو (جمع بین الصلاتین کرو) اس طرح نماز پڑھو" جیسا کہ سنن نسائی میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ کو جب بھی کوئی ضروری یا سخت کام درپیش ہوتا تو آپؐ جمع بین الصلاتین کرتے۔ (۴۶)

جمع بین الصلاتین پر نقل کی گئی احادیث و روایات اور اس مسئلہ میں علماء کی آراء اور ان کے افکار کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل تشیع کی طرح اہلسنت والجماعت بھی جمع بین الصلاتین کو سنت سمجھتے ہیں اور اس مسئلہ میں ان دونوں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دی گئی چھوٹ کو عادت نہ بنایا جائے اور نہ ہی اس کی مخالفت کی جائے۔ لہذا اہلسنت کے وہ علماء جو جمع بین الصلاتین پر عمل نہیں کرتے یا اس کے مخالف ہیں انہیں چاہئے کہ یا اس مسئلہ میں کوئی ٹھوس استدلال پیش کریں ورنہ اسے سنت کی حیثیت سے

تسلیم کرلیں۔

مدارک

۱۔ بخاری' صحیح بخاری' بیروت : دارالقلم ۱۹۸۷ء' جلد دوم کتاب تقصیر الصلاۃ' باب الجمع بین المغرب والعشاء' ص ۴۸۶' حدیث نمبر (۱۰۳۳)

ابن ماجہ' سنن ابن ماجہ

۲۔ مسلم' صحیح مسلم' بیروت : داراحیاء التراث العربی' ۱۹۲۹ء جلد پنجم صفحہ ۲۱۲

ابوداؤد' سنن ابی داؤد بیروت : داراحیاء السنۃ' جلد دوم صفحہ ۷ حدیث نمبر (۱۲۱۶)

نسائی' سنن نسائی' بیروت : دارالکتب العلمیۃ' جلد اول صفحہ ۲۸۹

۳۔ بخاری' صحیح بخاری' جلد دوم صفحہ ۴۸۷ حدیث نمبر (۱۰۳۴)

نسائی' سنن نسائی' جلد اول' صفحہ ۲۸۹ ـ ۲۸۷

ابوداؤد' سنن ابی داؤد' جلد دوم صفحہ ۴ و صفحہ ۷ حدیث نمبر (۱۲۰۷ ـ ۱۲۱۶)

۴۔ وہی مصدر

۵۔ بخاری' صحیح بخاری جلد دوم کتاب تقصیر الصلاۃ باب (۱۱۷) صفحہ ۴۸۷ حدیث نمبر (۱۰۳۶)

مسلم' صحیح مسلم' جلد پنجم صفحہ ۲۱۴

نسائی' سنن نسائی' جلد اول صفحہ ۲۸۴

ابوداؤد' سنن ابی داؤد جلد دوم صفحہ ۷ حدیث نمبر (۱۲۱۸)

۶۔ بخاری' صحیح بخاری' جلد دوم باب (۷۱۰ ـ ۷۰۹ ـ ۷۰۷) صفحہ ۴۸۷ ـ ۴۸۶ حدیث نمبر (۱۰۳۵ ـ ۱۰۳۳)

مسلم' صحیح مسلم' جلد پنجم صفحہ ۲۱۵ ـ ۲۱۴

نسائی' سنن نسائی جلد اول صفحہ ۲۸۷

ابوداؤد' سنن ابی داؤد صفحہ ۷ حدیث نمبر (۱۲۱۹)

۷۔ صحیح بخاری (جلد دوم صفحہ ۴۸۶) صحیح مسلم (جلد پنجم صفحہ ۲۱۴) و سنن نسائی (جلد اول صفحہ ۲۸۷' ۲۹۰' ۲۸۶)

مالک بن انس' الموطا' بیروت : داراحیاء الکتب العربیہ ۱۹۹۵ء جلد اول صفحہ ۱۴۵

نسائی' سنن نسائی' جلد اول صفحہ ۲۸۶' ۲۸۷' ۲۹۰

مسلم، صحیح مسلم، جلد پنجم، صفحہ ۲۱۴

۸۔ بخاری، صحیح بخاری جلد دوم

مسلم صحیح مسلم، جلد پنجم صفحہ ۲۱۶

نسائی، سنن نسائی، جلد اول صفحہ ۲۸۵

ابوداؤد، سنن ابوداؤد، جلد دوم صفحہ ۴ وحدیث نمبر (۱۲۰۸۔۱۲۰۶)

مالک، الموطا، صفحہ ۱۴۳

۹۔ مالک، الموطا، بیروت ء دار احیاء الکتب ۱۹۵۹ جلد اول صفحہ ۱۴۳

۱۰۔ ابی داؤد، سنن ابی داؤد، جلد دوم صفحہ ۷ حدیث نمبر ۱۲۱۵

نسائی، سنن نسائی، جلد اول صفحہ ۲۸۷

۱۱۔ نسائی، سنن نسائی، بیروت : دار الکتب العلیۃ، جلد اول صفحہ ۲۹۱، ۲۵۴

بخاری، صحیح بخاری، کتاب الحج باب الجمع بین الصلاتین عرفہ (۱۰۵۱)

مالک، الموطا، بیروت : دار احیاء الکتاب العربیہ، ۱۹۵۱، جلد اول صفحہ ۱۴۵

۱۲۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الجمع باب من جمع بینھما ولم یتطوع (۱۰۵۸) جلد دوم صفحہ ۶۸۷

نسائی، سنن نسائی، جلد اول صفحہ ۲۸۱

ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، بیروت ؛ دار احیاء التراث العربی ۱۹۷۵، کتاب المناسک باب (۹۰، ۵۹) جلد دوم ۱۰۰۵

مالک، الموطا، کتاب الجمع باب صلاۃ المزدلفہ، حدیث نمبر (۱۹۸) صفحہ ۴۰۱

۱۳۔ ابی داؤد، سنن ابی داؤد، جلد دوم، کتاب المناسک باب الصلاۃ بجمع ۱۹۳۔۱۹۱ احدیث نمبر (۱۹۳۳، ۱۹۲۶)

سنن نسائی، جلد اول صفحہ ۲۸۱

صحیح بخاری، کتاب الحج باب الجمع بین الصلاتین بالمزدلفہ (۱۰۵۹۔۱۰۵۷) جلد دوم صفحہ ۶۸۶، ۶۸۷

الموطا کتاب الحج باب صلاۃ المزدلفہ (۶۵) صفحہ ۴۰۱۔۴۰۰

الترمذی، سنن الترمذی، کتاب الحج جلد سوم حدیث نمبر (۸۸۸، ۸۸۷) باب ماجاء فی الجمع بین المغرب والعشاء

۱۴۔ مالک، الموطا، کتاب الحج باب صلاۃ المزدلفہ (۶۵) صفحہ ۴۰۰

بخاری، صحیح بخاری، کتاب الحج (۱۰۵۷) جلد دوم صفحہ ۶۸۶

ابن ماجہ 'سنن ابن ماجہ 'کتاب المناسک باب (۶۰۔۵۹) جلد دوم صفحہ ۱۰۰۵ حدیث نمبر (۳۰۲۱'۳۰۱۹)

۱۵۔ نسائی 'سنن نسائی 'باب الجمع بین الظہر والعصر 'جلد اول صفحہ ۲۵۴

۱۶۔ مسلم 'صحیح مسلم بیروت :دار احیاء التراث '۱۹۲۹ء 'جلد پنجم 'صفحہ ۲۱۵

نسائی 'سنن نسائی 'جلد اول صفحہ ۲۹۰

ابو داؤد 'سنن ابی داؤد 'بیروت :دار احیاء السنہ جلد دوم صفحہ ۶ حدیث نمبر (۱۲۱۰)

مالک 'الموطا 'جلد اول صفحہ ۱۴۴

۱۷۔ بخاری 'صحیح بخاری 'جلد اول 'باب وقت المغرب (۳۷۰) صفحہ ۲۹۳ 'وباب تاخیر الظہر (۳۶۳) صفحہ ۲۸۶

مسلم 'صحیح مسلم 'صفحہ ۲۱۷

نسائی 'سنن نسائی 'جلد اول صفحہ ۲۸۶ '۲۹۰

ابو داؤد 'سنن ابی داؤد 'جلد دوم صفحہ ۶ حدیث نمبر (۱۲۱۴)

۱۸۔ 'مسلم 'صحیح مسلم 'جلد پنجم صفحہ ۲۱۷

نسائی 'سنن نسائی 'جلد اول 'صفحہ ۲۹۰

ابو داؤد 'سنن ابی داؤد 'جلد دوم صفحہ ۶ حدیث نمبر (۱۲۱۱)

ترمذی 'الجامع الصحیح (سنن ترمذی) قاہرہ :مطبعۃ مصطفیٰ البابی ۱۹۳۷ 'جلد اول 'صفحہ ۳۵۵ حدیث (۱۸۷)

۱۹۔ مسلم 'صحیح مسلم 'جلد پنجم 'صفحہ ۲۱۷ '۲۱۸

نسائی 'سنن نسائی 'جلد اول 'صفحہ ۲۸۶

۲۰۔ بخاری 'صحیح بخاری 'بیروت :دار القلم '۱۹۸۷ء 'کتاب الحج باب الجمع بمعرفہ (۱۰۵۱) صفحہ ۶۸۳

۲۱۔ بخاری 'صحیح بخاری 'کتاب مواقیت الصلاۃ باب وقت العصر (۳۶۴) حدیث نمبر ۵۱۶

ابن حجر 'فتح الباری فی شرح صحیح البخاری 'بیروت :دار العرفہ ؛۱۳۰۰ھ 'جلد دوم 'صفحہ ۲۳

۲۲۔ بخاری 'صحیح بخاری 'کتاب مواقیت الصلاۃ باب وقت العصر (۳۶۴) حدیث (۵۱۱۔۵۱۳) صفحہ ۲۸۷

ابن ماجہ 'سنن ابن ماجہ 'بیروت :دار احیاء التراث العربی ۱۹۷۵ء حدیث نمبر (۶۸۰ '۶۷۹ '۶۶۷) صفحہ ۳۔۲۲۲

۲۳۔ ابن عربی المالکی ' عارضتہ الا حوذی فی شرح صحیح الترمذی بیروت :
دار العلوم للجمیع جلد اول صفحہ ۳۰۵۔۳۰۳

۲۴۔ نووی ' صحیح مسلم بشرح النووی ' بیروت : دار احیاء التراث ' ۱۹۲۹ء ' جلد پنجم ' صفحہ
۲۱۸۔۲۱۲

۲۵۔ ابن حجر ' فتح الباری فی شرح صحیح البخاری بیروت : دار المعرفہ ' ۱۳۰۰ھ ' جلد دوم '
صفحہ ۲۰۔۱۹ ' ۴۸۰۔۴۷۷ و جلد سوم صفحہ ۴۱۰ (کتاب الحج)

۲۶۔ بخاری ' صحیح بخاری ' جلد اول ' کتاب مواقیت الصلاۃ باب (۷۷۳۔۷۰۳)
صفحہ ۲۹۶۔۲۹۳

نسائی ' سنن نسائی ' جلد اول صفحہ ۲۸۹۔۲۸۵

ابن ماجہ ' سنن ابن ماجہ ' جلد دوم ' صفحہ ۲۲۳۔۲۲۲ حدیث نمبر (۶۸۳ ' ۶۸۰ ' ۶۷۹ ' ۶۶۷)

رمضان کا مہینہ اور نبی کریمؐ کا خطبہ

رمضان شریف رحمت و مغفرت کا مہینہ ہے اور دوسرے مہینوں کے مقابلے میں غیر معمولی فضیلت و شرافت سے برخوردار ہے۔ اس مہینے میں شب قدر ہے جو ہزار راتوں سے بہتر ہے اور اسی میں قرآن کریم نازل ہوا۔ ان فضیلتوں پر مستزاد یہ کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک کی اہمیت و قداست پر ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف رمضان کی عظمت و شرافت کو واضح نہیں کیا بلکہ اعمال و عبادات کی اہمیت پر روشنی ڈالی' انسانی حقوق اور معاشرتی ذمہ داریاں نبھانے کی جانب توجہ دلائی اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنے کی نصیحت فرمائی۔ اس طرح آنحضورؐ نے نماز' روزہ' تلاوت' افطار و استغفار اور ان جیسے دوسرے عنوانوں کے ذریعے سے اسلامی اقدار کو زندہ کرنے اور اسلامی اخلاق اپنانے کی ترغیب دی۔

اگر ہمارے علماء اور دانشور حضرات سنت نبویؐ کو سر مشق بناتے ہوئے اس اسوۂ حسنہ پر چلتے جو آنحضورؐ نے قائم کیا تھا اور جزوی اختلافات و معمولی جھگڑوں میں الجھنے کے بجائے اسلامی اقدار کو فروغ دیتے اور دنیاوی زندگی سے نکل کر خود بھی روحانیت کی جانب مائل ہوتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تو ہماری عبادات اور نماز روزے کی روحانیت میں کمی نہ آنے پاتی اور اسے بے روح نمازوں اور بے جان روزوں کا خطاب نہ ملتا۔ اگر ہم نے اسلامی اخلاق کو صحیح معنی میں اپنالیا ہوتا تو ہمارے بہت سے اختلافات خود بخود حل ہو چکے ہوتے اور نفاق و انتشار کی

جگہ اتحاد و اخوت نے لے لی ہوتی۔ لیکن اتحاد و اتفاق کا فقدان خود اس کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہم نے اسلامی اخلاق کو نہیں اپنایا۔ ہم دوسروں کو خود سازی کی دعوت تو دیتے ہیں یا دوسروں کے احتساب (Accountability) کا نعرہ تو زور شور سے لگاتے ہیں لیکن نہ اپنی خود سازی کرتے ہیں اور نہ احتساب کا آغاز اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ مذہب کا درس دینے والوں نے ان سیدھے سادے مسلمانوں کو یا تو جزئی و فرعی مسائل میں الجھائے رکھا یا تعصبات و اختلافات کی تنگ و تاریک وادی میں دھکیل دیا۔ ان لوگوں کا سارا زور اس پر خرچ ہوتا ہے کہ روزہ جلدی افطار کیا جائے لیکن روزے کا مقصد اور اس کی روح کی جانب یہ لوگوں کی توجہ مبذول نہیں کراتے۔ حالانکہ قرآن کریم نے آواز دی "یایھا الذین آمنو کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون" "اے ایمان لانے والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا شاید کہ تم با تقویٰ ہو جاؤ۔ (بقرہ۔ ۱۸۳)

اگرچہ روزہ جلدی افطار کرنا اچھی بات ہے لیکن اس آیہ کریمہ میں تقویٰ و پرہیز گاری کے حصول کو روزے کا ہدف اور مقصد بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر روزہ رکھنے کے بعد تقویٰ، خدا ترسی اور جائز و ناجائز کی تفریق آگئی تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ روزے بارگاہ احدیت میں قبول ہو گئے لیکن اگر روزہ رکھنے کے بعد بھی کردار میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو فرض تو ادا ہو جائے گا لیکن مقصد حاصل نہ ہوگا۔ اس نکتہ کی وضاحت کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن کی ادائیگی سے تقویٰ و پرہیز گاری حاصل ہوتی ہے اور روزہ اپنے مقصد کی طرف بڑھتا ہے ؟ روزہ کو روزہ بنانے اور اس کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلامی اصولوں کی رعایت کے علاوہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ کی طرف توجہ دینا ضروری ہے جو آپؐ نے رمضان شریف کے آغاز میں دیا تھا۔ اگر خطبہ نبویؐ کے لفظ لفظ پر غور و فکر کیا جائے اور ان تمام تعلیمات کو جامۂ عمل پہنایا جائے تو شک نہیں کہ ہم حقیقی معنی میں رمضان کا تقدس بحال کرنے اور روزے کی حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس خطبہء نبویؐ کو امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے اپنے آباء و اجداد کے حوالے سے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کیا ہے۔ ہم بغیر کسی کم و کاست کے اس عربی خطبہ کا اردو ترجمہ اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ البتہ قارئین کی سہولت کیلئے اس کے مختلف حصوں کو مناسب عنوان (Heading) دے رہے ہیں۔

عیون اخبار الرضاؑ : النقاش و القطان و المعاذی و الطالقانی جمیعاً عن احمدالھمدانی عن علی بن الحسن بن فضال عن ابیه عن ابی الحسن الرضا عن ابیه

عن آبائه عن امير المومنين عليه السلام قال : ان رسول الله صلى الله عليه و آله و سلم خطبنا ذات يوم فقال : ايها الناس انه قد اقبل اليكم شهرالله بالبركة والرحمة و المغفره شهر هوعند الله افضل الشهور و ايّامه افضل الايّام ولياليه افضل الليالى و ساعاتها افضل الساعات هوشهر دعيتم فيه الى ضيافة الله و جعلتم فيه من اهل كرامة الله ' انفاسكم فيه تسبيح و نومكم فيه عبادة و عملكم فيه مقبول و دعاؤكم فيه مستجاب۔

فسلوا الله ربّكم بنيات صادقه وقلوب طاهرة ان يوفقكم لصيامه و تلاوة كتابه فان الشقى من حرم غفران الله فى هذا الشهر العظيم و اذكروا بجوعكم و عطشكم فيه جوع يوم القيامه و عطشه و تصدقوا على فقرائكم و مساكينكم و وقرو اكبار كم و ارحموا صغار كم و صلوا ارحامكم و احفظوا السنتكم و غضوا عمالايحل النظراليه ابصار كم و عمالا يحل الا ستماع اليه اسماعكم و تحننوا على ايتام الناس يتحنن على ايتا مكم و توبوا الى الله من ذنوبكم وارفعوا اليه ايديكم بالدعاء فى اوقات صلواتكم فانها افضل الساعات ينظر الله عزو جل فيها بالرحمة الى عباده يجيبهم اذا ناجوه و يلبيّم اذا نادوه و يستجيب لهم اذا دعوه۔

ايها الناس ان انفسكم مرهونه باعمالكم ففكوها باستغفار كم و ظهور كم ثقيلة من اوزار كم فخففوا عنها بطول سجود كم و اعلموا ان الله تعالى ذكره اقسم بعزته ان لا يعذب المصلين و الساجدين و ان لا يروّعهم بالنار يوم يقوم الناس لرب العالمين۔

ايها الناس من فطّر منكم صائماً مؤمنا فى هذا الشهر كانه له بذلك عندالله عتق رقبه و مغفرة لما مضى من ذنوبه قيل يا رسول الله ! وليس كلنا يقدر على ذلك فقال عليه السلام اتقوا النار ولو بشق تمرة اتقو النار ولوبشربة من ماء۔

ايهاالناس من حسّن منكم فى هذا الشهر خلقه كان له جوازاً على الصراط يوم تزل فيه الا قدام ومن حفّف فى هذا الشهر عما ملكت يمينه خفّف الله عليه حسابه ومن كفّ فيه شره كف الله عنه غضبه يوم يلقاه ومن اكرم فيه يتيما اكرمه الله يوم يلقاه و من وصل فيه رحمه وصله الله برحمته يوم يلقاه ومن قطع فيه رحمه قطع الله عنه رحمته يوم يلقاه و من تطوع فيه صلاة كتب الله له براءة من النار ومن ادى فيه فرضاً كان له ثواب من ادى سبعين فريضة فيما سواه من الشهور ومن اكثر فيه من الصلاة علّى ثقل الله ميزانه يوم تخف الموازين ومن تلا فيه آيته من القرآن كان له مثل اجرمن ختم القرآن فى غيره من الشهور۔

ایها الناس ! ان ابواب الجنان فی هذا الشهر مفتحة فسلو اربکم ان لا یغلقها علیکم و ابواب النیران مغلقه فسلوا ربکم ان لا یفتحها علیکم و الشیاطین مغلولة فسلوا ربکم ان لا یسلطها علیکم۔

قال امیر المومنین علیه السلام فقمت فقلت یا رسول الله ! ما افضل الاعمال فی هذا الشهر فقال یا ابا الحسن افضل الاعمال فی هذا الشهر الورع عن محارم الله عزوجل۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن ہم سے خطاب کیا اور فرمایا:

بہترین مہینہ

اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ کا مہینہ رحمت و مغفرت اور برکتیں لئے تمہارے پاس آیا ہے۔ ایک ایسا مہینہ جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نظر میں تمام مہینوں سے افضل ہے۔ اس کے دن بہترین دن ہیں اس کی راتیں سب سے زیادہ بافضیلت راتیں ہیں اور اس کے لحات قیمتی ترین لحات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت

"یہ وہ مہینہ ہے جس میں تمہیں باری تعالیٰ کے مہمان بننے کی دعوت دی گئی ہے اور جس مین اللہ تعالیٰ کے جود و بخشش کا سزاوار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس مہینہ میں تمہارے سانس تسبیح، تمہاری نیند عبادت، تمہارا عمل مقبول اور دعائیں مستجاب ہیں۔ پس تم اپنی سچی نیتوں اور پاک دلوں سے اپنے پالنے والے سے سوال کرو کہ وہ تمہیں اس مہینے کے روزے رکھنے اور قرآن پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے اس لئے کہ شقی (سعادت و فلاح کے راستے سے دور) ہے وہ شخص جو اس با عظمت مہینہ مین بھی اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے محروم رہ جائے۔"

قیامت کے دن کی یاد دہانی

اس مہینے میں اپنی بھوک اور پیاس کے ذریعے سے قیامت کے دن کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو۔

اخلاقی و سماجی ذمہ داریاں

ا۔ اپنے درمیان موجود تنگدست و نادار افراد کو صدقہ دو۔

۲۔ اپنے بڑوں کا احترام کرو اور چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آؤ۔
۳۔ اپنے خونی رشتہ داروں اور قرابتداروں سے اچھے تعلقات برقرار رکھو۔
۴۔ اپنی زبانوں کی حفاظت کرو۔ اپنی نظروں کو ان چیزوں سے بچا کر رکھو جن کی طرف دیکھنا جائز نہیں اور اپنے کانوں کو ان باتوں یا آوازوں سے دور رکھو جن کا سننا روا نہیں۔
۵۔ اور دوسرے لوگوں کے یتیموں سے شفقت و نرمی سے پیش آؤ تا کہ لوگ تمہارے (خاندان و قبیلہ میں موجود) یتیموں سے نرمی کا سلوک کریں۔

توبہ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرو اور اوقات نماز میں ہاتھوں کو دعا کے لئے اٹھائے رکھو۔ اس لئے کہ یہ بہترین اوقات ہیں جن میں وہ ذات اقدس اپنے بندوں پر رحمت کی نظر کرتا ہے جب بندے اس سے خلوت میں راز و نیاز کرتے ہیں تو ان کی سنتا ہے جب اسے پکارتے ہیں تو ان کی فریاد کو پہنچتا ہے اور جب اس سے مانگتے ہیں تو انہیں عطا کرتا ہے۔

استغفار

اے لوگو! تمہاری جانیں، تمہارے اعمال و کردار سے بندھی ہوئی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر اور اس کی مغفرت طلب کر کے انہیں آزاد کرا لو اور تمہاری کمریں تمہاری بد اعمالیوں اور لغزشوں سے بوجھل ہو گئی ہیں پس اپنے سجدوں کو طویل بنا کر انہیں ہلکا کر لو اور اچھی طرح جان لو کہ وہ خدا کہ جس کا بول بالا ہے اس نے اپنی عزت کی قسم کھائی ہے کہ جس دن لوگ اس کے حضور حاضر ہوں گے اس دن وہ نماز گزاروں اور سجدہ کرنے والوں کو ہرگز اپنے عذاب میں مبتلا نہ کرے گا اور نہ ہی انہیں دوزخ کی آگ سے ڈرائے گا۔

افطار دینا

اے لوگو! تم میں سے جو کوئی بھی اس مہینے میں اپنے مومن روزہ دار بھائی کا روزہ کھلوائے گا تو اس کا یہ عمل اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے یہاں ایک غلام آزاد کرانے کے برابر ہو گا اور گذشتہ گناہوں سے مغفرت کا باعث بنے گا (صحابہ کرامؓ کی جانب سے) آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے ہر کوئی ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، دوزخ کی آگ سے بچو اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا کھلا کر...!
دوزخ کی آگ سے دور رہو اگرچہ پانی کا ایک گھونٹ پلا کر...!!

خود سازی

۱۔ اے لوگو! تم میں سے جو بھی اس مہینے میں اپنے اخلاق کو نیک بنائے رہے گا تو وہ اس دن پل صراط کو عبور کر جائے گا جس دن قدم ڈگمگا جائیں گے۔

۲۔ اور جو اس مہینے میں اپنے ماتحتوں سے نرمی و عطوفت سے پیش آئے گا تو اللہ تعالی اس سے حساب لینے میں نرمی برتے گا۔

۳۔ اور جو اس مہینے میں (دوسروں سے) اپنے شر اور اپنی برائی کو بچائے رکھے گا تو اللہ تعالی اس دن اسے اپنے غضب سے محفوظ رکھے گا جس دن اسے خداوند عالم کے حضور پیش کیا جائے گا

۴۔ اور جو اس مہینے میں کسی یتیم کی عزت و تکریم کرے گا تو اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی عزت افزائی کرے گا۔

۵۔ اور جو اس مہینے میں اپنے قریبی عزیزوں اور خونی رشتہ داروں سے اچھے تعلقات برقرار رکھے گا (صلہء رحم) تو اللہ تعالی قیامت کے دن اس سے اپنا تعلق برقرار رکھے گا اور جو ان قرابتداروں سے تعلق توڑ بیٹھے گا تو اللہ تعالی قیامت کے دن اس سے اپنی رحمت منقطع رکھے گا۔

عبادات

اور اگر کوئی اس مہینہ میں ایک نافلہ نماز پڑھے گا تو اللہ تبارک و تعالی اس کے لئے دوزخ کی آگ سے رہائی لکھ دے گا اور جو اس مہینہ میں ایک فریضہ کو ادا کرے گا تو اسے ستر فرائض کی ادائیگی کا ثواب دیا جائے گا جنہیں دوسرے مہینوں میں ادا کیا گیا ہو۔

درود شریف

اور جو اس مہینہ میں مجھ پر کثرت سے درود بھیجے گا تو اللہ تعالی اس دن اس کے نامہ اعمال کو وزنی بنا دے گا جس دن یہ ہلکے ہو جائیں گے۔

قرآن کریم کا پڑھنا

اور جو اس مہینہ میں قرآن کریم کی ایک آیت پڑھے گا تو اسے کسی دوسرے مہینے میں قرآن کریم ختم کرنے کے برابر معاوضہ دیا جائے گا۔

جنت اور دوزخ کے دروازے

اے لوگو! بلاشک اس مہینے میں جنت کے دروازے پوری کشادگی کے ساتھ کھلے ہوئے ہیں

پس تم اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ انہیں تمہارے لئے بند نہ کرے اور دوزخ کے دروازے سیلڈ ہیں پس اپنے پالنے والے سے سوال کرو کہ وہ انہیں تمہارے لئے نہ کھول دے اور شیاطین غل و زنجیر میں ہیں پس اپنے پروردگار سے راز و نیاز کرو کہ کہیں وہ انہیں تمہارے اوپر مسلط نہ کر دے۔

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ ختم ہو جاتا ہے اور روایت کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اس مہینے میں با فضیلت ترین عمل کونسا ہے۔؟

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جواب دیتے ہیں کہ جن چیزوں کو اللہ سبحانہ و تعالی نے حرام و ناجائز ٹھہرایا ہے ان سے دور رہنا۔ بعد ازاں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی شہادت کے بارے میں وہ مشہور پیشگوئی فرمائی جسے اہل سنت و شیعہ حدیث کے مجموعوں میں تواتر و کثرت سے نقل کیا گیا ہے۔ جو حضرات چاہیں ان دفاتر کی جانب رجوع کر سکتے ہیں۔

ہم خالق کائنات کے حضور عاجزی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلیم کردہ ان جامع اصولوں پر پابند رہنے' اسلامی و انسانی اقدار کو اپنانے' ماہ مبارک کے فیوضات سے بہرہ مند ہونے اور تقوی و پرہیزگاری کو اپنی طبیعت و مزاج کا حصہ بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

مدارک

(ابو جعفر) شیخ صدوق' عیون اخبار الرضا' قم : میرزا محمد رضا مشہدی' چاپخانہ دار العلم' ۱۳۷۷ھ' جلد اول' صفحہ ۲۹۵

ملا باقر مجلسی' بحار الانوار' بیروت موستہ الوفاء۔ ۱۹۸۳ء جلد ۹۳ (باب وجوب شہر رمضان و فضلہ) صفحہ ۳۵۷؛ کتاب فضائل الاشہر الثلاثہ نقلاً عن البحار

(شیخ صدوق) ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بابویہ قمی؛ امالی صدوق' حاجی محمد حسن تاجر اصفہانی (امین دار الضرب)' ۱۳۵۵ھ' مجلس العشرون' صفحہ ۵۸۔۵۷۔

اسلام اور مسیح علیہ السلام ...... ایک تقابلی جائزہ

مسیحی عقائد کا ایک مرکزی سوال یہ ہے کہ عیسیٰ مسیح کون تھے؟
اس سوال کے جواب میں مسیحیوں نے خاصی طویل بحثیں کی ہیں۔ ان ابحاث کا نچوڑ مسیح علیہ السلام کے بارے میں پیدا ہونے والے تین مختلف نظریات کی صورت میں سامنے آتا ہے:

(۱) مسیح علیہ السلام کا وہ چہرہ جسے تاریخ پیش کرتی ہے۔

(۲) مسیح علیہ السلام کی وہ شخصیت جسے گرجا گھر (Church) اجاگر کرتا ہے۔

(۳) مسیح علیہ السلام کی وہ تصویر جو عہد جدید (New testament) کی کتابوں میں دکھائی گئی ہے۔

ایک عام محقق جب انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ مسیح کی عظیم شخصیت اور تعلیمات پر قلم اٹھانا چاہتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا نظریات میں سے کوئی ایک نقطہ نظر بھی مسیحؑ کی صحیح تصویر پیش کرنے اور ان کی تعلیمات کو تحریف اور تبدیلیوں کا غلاف چڑھائے بغیر انسانیت تک پہنچانے سے قاصر رہا ہے۔ مسیحؑ کی زندگی، ان کا مشن، انجام کار اور ان کے پیغام کی کامیابی کے بارے میں نہ جانے ایسے کتنے سوال اٹھتے ہیں جن کا جواب ان میں سے کسی ایک نظریے کے پاس بھی نہیں۔۔۔۔۔!

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دور میں انسان ارتقاء کی اس منزل پر نہ تھا کہ اپنی تاریخ کو من و عن محفوظ کر سکتا۔ ان کے کلمات اور تعلیمات کو اندرونی اور بیرونی عوامل کی مداخلت سے محفوظ رکھنا اور ان سے متعلق معجزوں اور مافوق الفطرت امور کی

وضاحت تاریخ کے بس کی بات نہ تھی اور نہ ہی اتنی اہم اور نازک شخصیت کو سمجھنے اور اس کی حیات طیبہ اور کارناموں کا تجزیہ کرنے کے لئے دو ہزار سال پہلے کی تاریخ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے!
رہا عہد جدید کی کتابوں کا مسئلہ تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عہد جدید (New testament) کی کتابوں میں کئی بار تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں۔ یہ کتابیں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے نہیں لکھی تھیں بلکہ دوسری صدی عیسوی میں مسیحیت کے طرفداروں کی جانب سے معرض وجود میں آنا شروع ہوئی تھیں۔ ایسا نہ تھا کہ ان کتابوں کے مصنفین نے بغیر کسی واسطے کے مسیح اور ان کی زندگی کے واقعات کو رقم کیا ہو بلکہ اس کے برخلاف انہوں نے اس وقت کے لوگوں پر اعتماد کرتے ہوئے جو کچھ مسیحؑ کے بارے میں ان سے سنا اسے لکھ دیا اور جو اس وقت کے عقائد اور خیالات تھے انہیں ایک تحریری صورت دے دی۔ جدید تحقیقات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مسیح پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب نازل ہوئی تھی جو آرامک (Aramaic) میں تھی۔ لیکن افسوس کے ساتھ اس بات کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ مسیحؑ پر لکھی گئی ایک سو سے زائد کتابوں (Apocrypha) کے ساتھ وہ بھی ناپید ہو گئیں اور ان میں سے صرف چار انجیلوں کو قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ عہد جدید کی ان چار کتابوں میں بھی بار بار ترمیمیں کی گئیں۔ یوں تو واٹیکان کا اصرار ہے کہ انجیل اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے لیکن اس کے برخلاف (Ecumencial translation of the Bible) نامی سوسائٹی نے (جو کہ سو سے زائد کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ماہرین پر مشتمل ہے) اپنے فیصلے میں بار بار ان کتابوں میں تبدیلیوں کی تصدیق کر دی ہے۔ پس ان حقائق کی روشنی میں مسیح کی حیات اور تعلیمات کو سمجھنے کے لئے یہ کتابیں بھی اتنی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔ چرچ یا گرجا گھر کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں جو کہ زیادہ تر انہی افکار و نظریات پر منحصر ہے جو بائبل میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ دوسری صدی بعد مسیح (A.D) میں اصلی مسیحیت (Judeo-Christianity) اور پال کی اختیار کی ہوئی مسیحیت (Pauline Christianity) میں طویل رقابتوں کا سلسلہ جاری رہا جس میں پال کی فتح ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کے قریبی ساتھیوں، مسیح کے پیروکاروں اور سیدھے سادے لوگوں کو نظر انداز کر دیا گیا جو مسیح کی رہ و رسم بتا سکتے تھے اور ان کی جگہ یونانی تہذیب کے ان بیرونی عوامل نے لے لی جو یونانی تہذیب و افکار سے متاثر تھے اور روشن فکر اور آزاد خیال تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ جن بنیادی اصول اور تعلیمات کو لائے تھے وہ پس پردہ چلی گئیں اور آج بھی مسیحیت کی دنیا ان سے نامانوس ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سادگی، دنیا کی چمک دمک سے دوری اور عفت و پاکدامنی کا پیغام لے کر آئے تھے

لیکن آج مسیحی برادری ہی زیادہ دنیا کی چمک دمک میں الجھی ہوئی ہے اور بے حیائی و بے راہ روی کا شکار ہے۔ مسیحؑ کے پیغام کو آج کی دنیا بھی سمجھنے سے اتنا ہی قاصر ہے جتنا کہ رہبانیت زدہ مسیحی پادری تھے جو اپنے غلط کردار اور اپنی نافہمی کے باعث لوگوں کی صحیح ہدایت نہ کر سکے اور جس کی وجہ سے لوگ مسیحؑ کی شخصیت اور ان کے کردار سے دور ہوتے گئے۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ تو گرجا گھر نہ انجیل مقدس اور نہ ہی تاریخ مسیحا (Saviour) کی شخصیت اور تعلیمات کی صحیح تصویر پیش کر سکتی ہے۔

حضرت عیسیٰ کے ارادتمندوں کے لئے یہ خوشایند امر ہونا چاہئے کہ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت اور ان کی ماں حضرت مریمؑ کے تقدس کا ذکر بڑے زور و شور سے کیا گیا ہے۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ اسلام میں مسیح علیہ السلام پر اتنا جامع نقطہ نظر ہونے کے باوجود بھی مسیحی برادری اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتی۔ مسیحی سمجھتے ہیں کہ صرف وہی حضرت عیسیٰ کو نجات دینے والے (Saviour) کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ انہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اسلام میں بھی مسیح کو انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے اور اسے غلامی کی زنجیروں سے نکالنے اور نجات دینے والے مسیحا کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اس مسئلہ میں خیالی و مثالی نقطہ نظر (Idealistic approach) کے بجائے اسلام ایک حقیقی تصور (Realistic approach) پیش کرتا ہے۔ ہم قرآن کریم کو اس لئے سامنے نہیں لا رہے کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ آخری آسمانی کتاب ہے بلکہ اس لئے کہ مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو حقائق قرآن پیش کرتا ہے وہ اتنے وزنی ہیں جو انسانی عقل کو اپیل کرتے ہیں۔ ایک دانشور چاہے اس کا تعلق کسی بھی مسلک سے ہو، انہیں پڑھنے کے بعد اپنے گذشتہ خیالات پر تجدید نظر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔!

یہ بھی ایک قابل توجہ امر ہے کہ مغرب میں آج بھی اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ غلط فہمیاں کہیں تو منفی پروپیگنڈے کے نتیجے میں اور کہیں کم علمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مسیحؑ کے بارے میں اسلام کے موقف سے متعلق ہے۔ اسلام نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کی پاک زندگی اور معجزات و خدمات کے بارے میں بہت سے حقائق پیش کرتا ہے اور ان کی ماں کی قداست کو نمایاں کرنے کے لئے ایک سورہ مخصوص کرتا ہے بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے خلوص، ایمان اور جذبوں کی تعریف بھی جگہ جگہ کرتا ہے۔ اس تحقیقی مطالعے میں مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کا نقطہ نظر پیش کرنے کے بعد ہم مسیحؑ سے متعلق مندرجہ ذیل موضوعات پر قرآن اور بائبل کا ایک تقابلی جائزہ پیش

کریں گے تاکہ اہل تحقیق بغیر جانبداری کے صحیح نقطہ نظر کو انتخاب کریں اور اس ضمن میں بہت سے نئے نتائج تک دسترس حاصل کریں۔

(۱) قرآن مجید اور مسیحؑ
(۲) مسیحؑ کی ولادت
(۳) مسیحؑ پیغمبر یا بیٹا؟
(۴) صلیب!
(۵) سلسلۂ نجات (Salvation)

(۱) قرآن کریم اور مسیح

اسلام سے حضرت عیسیٰؑ کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ دوسرے اولعزم انبیاء حضرت ابراہیم (Abraham)، حضرت نوحؑ (Noah)، حضرت موسیٰؑ (Moses) اور خاتم الانبیاء (The Holy prophet SAWW) کی طرح حضرت عیسیٰؑ اور ان کی کتاب پر ایمان لائے بغیر ایک مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم سورہ مریم، سورہ آل عمران، سورہ انبیاء اور دوسری بہت سی سوروں میں حضرت عیسیٰ مسیح کی شخصیت کا تعارف کراتا ہے، ان کے معجزات کو نقل کرتا ہے، ان کی خدمات کو بیان کرتا ہے اور ان کی ابتداء اور انتہا پر روشنی ڈالتا ہے۔ انہیں اس وقت کو یاد دلاتا ہے جب روح القدس (Holy Spirit) کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی تھی۔ ایک اچھوتے انداز میں ان کی آمد کی بشارت دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ نے کہا اے مریم! اللہ تمہیں اپنی جانب سے ایک کلمہ کی آمد کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح ہوگا جو اس دنیا میں بھی نمایاں ہوگا اور آخرت میں بھی مقربین میں سے ہوگا" (آل عمران۔ ۴۵) اس آیہ کریمہ میں مسیحیوں کے کچھ عقائد کی تصدیق کر دی گئی ہے اور مسیح کو کلمہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ بائبل میں بھی مسیح کو لفظ (Logos / Word of God) کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ لفظ یا کلمہ ہمیشہ ایک معنی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور مسیح کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات کا پرتو ہیں اس لئے انہیں کلمۃ اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یوں تو انبیائے کرام سب کے سب حق تعالیٰ کے کلمات ہیں لیکن مسیحؑ میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انہیں کلمۃ اللہ کے عنوان سے یاد کیا گیا۔ ممکن ہے کیونکہ

حضرت عیسیٰ کی ولادت مشیت الہی اور "کن فیکون" کے نتیجے میں ہوئی اور حضرت عیسیٰ "ہو جا" کے مظہر ہیں اس لئے انہیں کلمۃ اللہ کے نام سے یاد کیا گیا۔ کچھ آیات میں حضرت عیسیٰ کو روح اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ بھی گذشتہ وصف سے شباہت رکھتا ہے۔ ان لئے کہ جس مافوق الفطرت انداز سے اللہ کے حکم سے ایک روح حضرت مریم کے بطن میں ڈالی گئی اس کے بعد وہ روح خدا کہلائے یا روح القدس (Holy Spirit) کی تائید اور آمد کے سبب حضرت عیسیٰ کو اس وصف سے متعارف کرایا گیا۔

(۲) مسیحؑ کی ولادت

حضرت عیسیٰ مسیح کی ولادت بائبل کی طرح قرآن کریم میں بھی ایک مافوق الفطرت امر کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ قرآن کریم اور مقدس بائبل دونوں اس امر پر تاکید کرتے ہیں کہ یہ ولادت باسعادت ایک ایسے وقت اور ماحول میں ہوئی جب حضرت مریم کنواری تھیں اور حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہ تھا۔ اس ضمن میں انجیل میں ہے:

"چھٹے مہینے جبرئیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا۔ اس کنواری کا نام مریم تھا۔۔۔ فرشتہ نے اس سے کہا اے مریم! خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے۔ اور دیکھ تو حاملہ ہو گی اور تیرے بیٹا ہو گا۔ اس کا نام یسوع رکھنا۔ مریم نے فرشتے سے کہا کہ یہ کیونکر ہو گا جبکہ میں مرد کو نہیں جانتی اور فرشتہ نے جواب میں اس سے کہا روح القدس تجھ پر نازل ہو گا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی"۔ (لوقا کی انجیل۔ ۳۵۔۲۶:۱)

قرآن کریم میں سورۂ آل عمران (۴۷۔۴۵) اور سورۂ مریم میں ملائکہ کی حضرت مریم سے گفتگو اور ان کے رد عمل کو بیان کیا گیا ہے۔

"اس (فرشتے) نے کہا میں تو بس تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں مریم نے کہا: میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی بدکارہ ہوں۔ فرشتے نے کہا ایسا ہی ہو گا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے نشانی اور اپنی طرف سے ایک رحمت بنائیں اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔" (مریم۔ ۲۱۔۱۹)

حضرت مریم کے بارے میں اس مسئلے میں قرآن اور بائبل دونوں کا موقف خاصا ملتا جلتا ہے۔ بائبل کے مطابق حضرت مریم کی یوسف نامی شخص سے منگنی کی جا چکی تھی لیکن قرآن کریم اس امر کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ اس امر پر تاکید کرتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے کسی انسانی

مرد سے ان کا کسی طرح کا کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں کسی انسان نے چھوا تک نہ تھا اور بقول بائبل کے مذکورہ اقتباس کے مطابق وہ کسی مرد کو نہیں جانتی تھیں۔ پس حضرت عیسیٰ کی ولادت خود ایک معجزہ تھی۔ لیکن اس ضمن میں جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک باپ کے بغیر کیسے ایک انسان وجود میں آسکتا ہے۔ مادیت اور الحادیت کے اس بڑھتے ہوئے دور میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ایسے روشن فکر مسیحی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو اس معجزے کی حقانیت میں شک کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نہ تو سائنس اور نہ ہی بائبل اس مسئلے پر کوئی قانع کرنے والی دلیل (Logical statement) یا سائنسی وضاحت (Scientific explanation) پیش کر سکی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف قرآن اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔" (آل عمران : ۶۰۔۵۹)

اس آیۂ شریفہ میں حضرت عیسیٰ کی ولادت کو پہلے انسان کی طرح بتایا گیا ہے۔ جس طرح بنی نوع انسان کا پہلا فرد تولید مثل کے حیاتیاتی (Biological) قانون سے مستثنیٰ تھا اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی مستثنیٰ ہیں۔ جب بھی سائنس پہلے انسان کی پیدائش کے بارے میں مفروضوں (Theories & assumptions) سے نکل کر حقائق تک پہنچ جائے گی تو وہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کو بھی سمجھ سکے گی۔ قرآن کے مطابق حضرت عیسیٰ مسیح کی ولادت ہی ایک مافوق الفطرت امر نہ تھا بلکہ ان کا سب سے پہلا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے جھولے میں ہوتے ہوئے اپنی ماں کی پاکدامنی کی گواہی دی اور اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا :

"اور اس نے یہ کہا کہ بے شک میں اللہ کا ایک بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے مبارک قرار دیا ہے 'جہاں کہیں بھی رہوں' اور مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی وصیت کی ہے جب تک کہ زندہ رہوں۔" (مریم۔ ۳۱۔۳۰)

(۳) مسیحؑ۔ نبی یا بیٹا ؟

• دنیا کی عظیم شخصیات کے گرد ہمیشہ کچھ ایسی چیزوں کا تانا بانا کھڑا کر دیا جاتا ہے جن میں ان شخصیات کی حقیقت دب جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ انسانیت کی ایک عظیم شخصیت تھے اور ان میں ایسی بے شمار صفات تھیں جو انہیں دوسرے انبیاء سے نمایاں کرتی تھیں۔ ان کی ولادت ہی ایک ایسے پیرایہ میں ہوئی تھی کہ جس پر انسانیت حیران کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں بنی اسرائیل کے لئے نبی بنا کر بھیجا تھا اور ان کی تعلیمات میں سادگی، پاکیزگی اور روحانیت کا پہلو نمایاں تھا۔ وہ ایک خدا کی بندگی اور عبادت کا پرچار کرتے تھے۔ لیکن انہیں صرف نبی کی حیثیت سے نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ دکھ بھری انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے بھی مبعوث کیا گیا تھا۔ وہ نابینا لوگوں کو چھوتے تو وہ بینا ہو جاتے، کوڑھ اور برص کے امراض میں مبتلا افراد کو مس کرتے تو وہ صحت یاب ہو جاتے اور مردہ لوگوں کو آواز دیتے تو وہ اللہ کے اذن سے دوبارہ زندہ ہو جاتے تھے۔ ان معجزوں کا مقصد ان کی حقانیت کو ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو فیض پہنچانا تھا، لیکن اس کے بجائے لوگ انہیں خدا یا خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عیسیٰ مسیح کی شخصیت اور تعلیمات کے بارے میں یہ بگاڑ لوگوں میں کب پیدا ہوا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان چیزوں کو مسیحیت میں اس وقت رسمیت حاصل ہوئی جب حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور سچے پیروکاروں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور گرجا گھر پر روشن فکر اور آزاد پسند عوامل کا قبضہ ہو گیا تھا۔ لوگوں نے مسیح علیہ السلام کی سچی تعلیمات پر غور و فکر نہ کیا کہ یہ معجزے وہ نشانیاں ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے انہیں عطا ہوئی ہیں بلکہ الٹا انہیں خدا سمجھنا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں اسلام کے دانشوروں اور اہل طریقت کے امام ابن عربی مسیحیوں کی غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ مسئلہ سبب بنا کہ کچھ لوگ جسم و جسمانیت (Incarnation) کی باتیں کرنے لگے اور یہ کہنے لگے کہ کیونکہ مسیح مردوں کو زندہ کرتا ہے لہٰذا خدا ہے کیونکہ در حقیقت خدا وہ ہوتا ہے جو مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ پس خدا یسوع کی صورت میں ظاہر ہو گیا ہے۔"

اس مسئلہ میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ مسیحؑ اگر مردوں کو زندہ کرتے تھے تو یہ کام اللہ کے اذن سے انجام دیتے تھے۔ یعنی انہیں یہ طاقت اور صلاحیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی اور اس سے ہرگز یہ تاثر نہیں ملتا کہ وہ خدا ہیں۔ اگر سائنس ترقی کر جائے اور مصنوعی ذہانت (Artificial intelligence) میں اتنا کام کر لے اور ایک ایسا موجود ایجاد کر لے جو انسانی دماغ کی طرح اپنا ایک مستقل دماغ رکھتا ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہ ہو گا کہ سائنس خدا ہے۔ اس لئے کہ جو موجودہ سائنس کی مدد سے وجود میں آئے گا وہ انسانی دماغ اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین فطرت اور کائنات میں موجود اشیاء کو بروئے کار لاتے ہوئے اختراع کیا گیا ہو گا۔ پس سائنس بنیادی طور پر کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین فطرت کو دریافت کرنا اور اس کی مخلوقات (بشمول انسانی عقل و دماغ کے) اور کائنات میں موجود صلاحیتوں اور توانائیوں سے فائدہ اٹھانا۔

بہر صورت کسی بھی وجہ سے "مسیح" کے طرفداروں میں سے کچھ لوگ ان کے بارے میں غلو کا شکار ہوئے اور آخر کار چرچ نے تثلیث (یعنی خدا۔ بیٹا۔ روح القدس کے اتحاد) کا عقیدہ (Trinity) اختیار کر لیا۔ تحقیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسیحی دنیا کی ابتدائی تاریخ میں اس عقیدے کا نام نشان بھی نہ تھا۔ تفسیر المنار میں اس ضمن میں خاصی تحقیقات کو منعکس کیا گیا ہے۔ ان تحقیقات سے جن کی تائید مسیحی دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے کی ہے 'اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ دنیائے مسیحیت نے یا تو برہمن ذات کے ہندوؤں سے لیا ہے یا مصر کے بت پرستوں سے اپنایا ہے جن کے یہاں تثلیث کا ایک پرانا تصور موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد لیجن ہوزن (Dr.M.Legen Hausen) نے اس عقیدے کے دفاع میں کی گئی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ ان میں تثلیث کا ظاہری (Modal)' معاشی (Economic) اور ذاتی (Immanent) پہلو پیش کیا گیا ہے۔ (Al-Tawhid Mag.Qom) لیکن اس کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مجموعاً یہ ایک غلط عقیدہ ہے جسے چرچ نے قبول کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخلوق کو چاہے وہ حضرت عیسیٰ جیسی عظیم شخصیات ہوں یا روح القدس جیسے فرشتے ہوں' خالق سے ملانا خالق کی خالقیت سے انکار کے مترادف ہے۔ اگر یہ عقیدہ صحیح ہوتا تو حضرت موسیٰ (Moses) حضرت یعقوب (Jacob) حضرت یوسف (Joseph) اور ان جیسے دوسرے انبیاء بھی اس کا پرچار کرتے! بہر صورت یہ عقیدہ کیسا بھی ہو اور کہیں سے بھی آیا ہو لیکن اس سے "مسیح" کی تعلیمات ضرور پس پردہ چلی گئیں۔ قرآن کریم نے اس عقیدے کا جواب منطق (Logic) کی زبان میں دیا اور یہ دلیل پیش کی کہ اگر مسیح یا ان کی ماں حضرت مریم کا خدائی میں حصہ ہوتا یا یہ دونوں معبود کی سطح پر ہوتے تو وہ اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے غذا اور خوراک کے محتاج نہ ہوتے۔ لیکن جب یہ بات ثابت ہے کہ عام انسانوں کی طرح وہ بھی کھانا کھاتے تھے اور اس کے اثرات اور نتائج قبول کرتے تھے تو وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ وہ عام انسانوں سے تو ممتاز ہیں لیکن بہر حال مخلوق ہیں۔ لہٰذا کسی چیز میں بھی انہیں اللہ کا شریک ٹھہرانا اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے پر کھڑا کرنا جرم عظیم ہے۔ لیکن ہم اگر ان کے تمام کمالات اور امتیازات کو اللہ تعالیٰ کی عطا اور نشانی سمجھ کر تسلیم کریں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ایسا نہیں کہ اگر کوئی "مسیح" کو پاک نبی سمجھ لے (Holy messenger) تو اس میں بدروح (Evil spirit) سما گئی ہو جیسا کہ مرقس (Mark) کی انجیل (۲۸۔۲۱ :۱) میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر کوئی تفصیل سے عہد جدید کی کتاب کا مطالعہ کرے تو اسے یہی دکھائی دے گا کہ "مسیح" کو خدا کے بیٹے کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن ایسے مقامات بھی ملیں گے جہاں مسیح " نے خود کو انسان کا بیٹا کہا تاکہ اس عقیدے کی تردید کر دیں کہ (نعوذ

باللہ) وہ خدا کے بیٹے ہیں۔ جب وہ یروشلم میں پہنچے تو لوگوں نے انہیں داؤد کے بیٹے David`s (Son) اور پیغمبر عیسیٰ (prophet Jesus) کے نام سے یاد کیا لیکن انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا (Matthew ch.20:8-11)۔ انہوں نے ایک اور مقام پر لوگوں کو وعظ کرتے ہوئے کہا کہ ان کا حقیقی باپ خدا ہے جو ان کا پالنے والا ہے۔ ایک اور موقع پر جب انہوں نے ایک مفلوج انسان سے خطاب کر کے کہا: My son your sins are forgiven "میرے بیٹے تمہارے گناہ معاف ہیں" اور ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ صرف اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کر سکتا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کا بیٹا (The son of man) بھی معاف کر سکتا ہے۔ (Mark 2: 5-11) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو انسان کا بیٹا کہتے تھے اور اس قسم کی مثالیں بھی خاصی فراوانی سے پائی جاتی ہیں۔ بہر حال ہمیں اس سے غرض نہیں ہم تو اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ مسیح خود یہ پرچار کرتے تھے کہ عبادت صرف ایک خدا کی ہونی چاہئے Worship the lord your God and serve only him (Matthew 3:10) لیکن اور تعلیمات کی طرح ان کی اس تعلیم کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اسی طرح وہ لوگوں کو شرم' حیا اور عفت و پاکیزگی کی تعلیم دیتے تھے اور زنا اور بے حیائی سے روکتے تھے۔ انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ:

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کرنا لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔" (متی ۲۸۔۲۷:۵) لہٰذا وہ جسم کے ساتھ دل کو بھی گناہ اور برے کام کے تصور سے روکتے تھے اور اسے پاک و پاکیزہ رکھنے کا درس دیتے تھے۔ لیکن جتنا کہ آج دنیائے مسیحیت میں اس قسم کے گناہ کئے جاتے ہیں کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اپنی تمام ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس میدان میں بھی مغرب نے خاصی ترقی کی ہے لیکن مسیحؑ کی تعلیمات ضرور نظر انداز کر دی گئی ہیں۔!

قرآن کریم مسیحیوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیحؑ عیسیٰ بن مریمؑ تو بس اللہ کے رسولؑ اور اس کا ایک کلمہ (لفظ) تھے جسے اس نے مریم کے پاس بھیجا اور اس کی جانب سے ایک روح تھے۔" (نساء۔۱۷۱)

(۴) صلیب!

گرجا گھر دعویٰ کرتا ہے کہ مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ اگلے دن جب کچھ خواتین ان کے

مقبرے کی زیارت کے لئے گئیں تو انہوں نے پتھر ہٹے ہوئے دیکھے اور مسیحؑ کو وہاں سے ناپید پایا۔ کچھ دن بعد مسیحؑ ان کے اور اپنے شاگردوں کے سامنے ظاہر ہوئے (ہم "خاتم الانبیاء" میں ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے یہ شاگرد نبی تھے اور ان پر وحی ہوتی تھی)۔ مسیحؑ کے دوبارہ زندہ ہونے (Resurrection) سے متعلق واقعات کے بارے میں انجیلوں میں خاصا تضاد پایا جاتا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر ہمیں اس پر روشنی ڈالنی ہے کہ اگرچہ انجیل اس پر تاکید کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب پر لٹکا دیا گیا لیکن قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے۔ یوں تو اس مسئلہ میں قرآن کریم اور انجیل مقدس کا موقف مختلف ہے لیکن اس ضمن میں خود انجیل میں بھی ایسی مشکلات پائی جاتی ہیں جن کے بعد وثوق سے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب پر لٹکا دیا گیا تھا۔۔۔۔۔!

ا۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ جس ظالم بادشاہ کی فوج مسیحؑ کے خلاف تھی اور انہیں قتل کرنے کے درپے تھی ان میں سے کوئی بھی مسیحؑ کو نہ پہچانتا تھا۔ اس سلسلے میں عہد جدید کا موقف یہ ہے کہ مسیحؑ کے بارہ شاگردوں میں سے ایک پر جس کا نام یہودا تھا' شیطان سوار ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں اس نے خیانت کی اور مسیح کو مخالف طاقتوں کے سامنے متعارف کرا دیا لیکن بعد میں وہ پشیمان ہو گیا اور اس نے توبہ کر لی۔ مرقس کی انجیل میں لکھا ہے کہ یہودا نے سردار کاہن سے یہ طے کیا تھا کہ جسے وہ بوسہ لے گا وہی مسیح ہو گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا (مرقس ۵۰۔ ۴۳ : ۱۴)۔ لیکن ایسے میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ یہودا نے علامت دینے میں غلطی کی ہو یا مسیحؑ کو متعارف کرانے سے پہلے ہی اس کا ارادہ بدل گیا ہو اور توبہ کرنے کے بعد اس نے مسیحؑ کی جگہ کسی اور کو مسیح کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو۔۔۔!

۲۔ دوسری مشکل کے بارے میں متی کی انجیل میں نقل شدہ یہ عبارت قابل غور ہے :

"اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے' چھوڑ دیتا تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں۔ یسوع برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے۔۔۔ اور جب ■ تخت عدالت پر بیٹھا تھا تو اس کی بیوی نے اسے کہلا بھیجا کہ تو اس راستباز سے کچھ کام نہ رکھو کیونکہ آج خواب میں میں نے اس کے سبب سے بہت دکھ اٹھایا ہے۔" (متی ۲۶۔۱۵ : ۲۷)

انجیل کے مطابق جب مسیحؑ کو گرفتار کیا گیا تھا تو ایک اور قیدی ان کے ساتھ تھا جو ان کا ہم نام تھا یعنی دونوں کا نام یسوع (Jesus) تھا ایک یسوع برابا (Barrabas) اور دوسرے یسوع مسیح (Jesus Christ) تھے۔

مذکورہ اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قید خانے کے افسر کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ لوگوں کی صوابدید پر ایک قیدی کو رہا کر دے۔ ایک ایسی صورتحال میں جبکہ اس کی بیوی نے اس سے یہ تقاضا کیا تھا کہ وہ مسیحؑ کو آزاد کر دے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں نہ کیا؟

یہ بھی ایک قابل تعجب امر ہے کہ عام لوگ ایک جانے پہچانے مجرم کو تو آزاد کرنے پر رضامند ہو جائیں لیکن ان کی خدمت کرنے والے اور ان کے دکھوں کا مداوا کرنے والے بے گناہ مسیحا کو پھانسی دینے کا مطالبہ کریں۔۔۔۔!!

ان مشکلات کی روشنی میں مسیحی برادری وثوق سے یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ جسے کاہنوں کے سردار نے گرفتار کیا تھا اور جسے قید خانے کے افسر پیلاطس نے پھانسی پر لٹکانے کے لئے فوجیوں کے حوالے کیا تھا وہ مسیحؑ تھے اور ان سے ملتا جلتا کوئی اور شخص نہ تھا۔۔۔! بہرحال انجیل مقدس یہ اظہار کرتی ہے کہ اپنی تمام عظمتوں کے باوجود مسیحؑ کو اس وقت کی مقتدر طاقتوں نے صلیب پر لٹکایا اور ان کی توہین کی لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی توہین کئے جانے اور اسے مصلوب ہونے سے بچا لیا اور لوگوں کو اس ضمن میں دھوکہ ہو گیا۔ وہ مسیح کے مصلوب ہونے کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں اور اسے ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں۔

"اور ان کے اس قول کے سبب کہ ہم نے مسیحؑ، مریم کے فرزند عیسیٰ اللہ کے رسول کو قتل کر دیا ہے حالانکہ فی الواقع نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے۔ محض گمان کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔"

(نساء۔ ۱۵۷)

بہرصورت چاہے مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا یا نہیں لٹکایا گیا اس کے باوجود مسلمان اور مسیحی دونوں عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام زندہ ہیں اور انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے لیکن یروشلم کا بائبل اسکول اس کی مخالفت کرتا ہے اور یہ اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جتنا اوپر ہے اتنا ہی نیچے ہے ایسا نہیں کہ وہ زیادہ اوپر ہو۔ اگر غور سے کام لیا جائے تو ان کے اس اعتراض کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ مسیح کو اوپر اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش میں تقرب عطا کیا اور ایک طویل زندگی سے نوازا ہے اور دراصل انہیں اس وقت کی مقتدر طاقتوں کے ہاتھوں توہین کئے جانے اور مصلوب ہونے سے بچا لیا ہے۔

(۵) سلسلۂ نجات

دنیا میں آج بھی ظلم و ستم اور قتل و غارتگری اپنے عروج پر ہے۔ ظلم اور ناانصافی کی چکی میں پسنے والی انسانیت انصاف کی بھیک مانگ رہی ہے۔ وہ بہت دکھ اٹھا چکی ہے اور بہت سے دروازوں پر دستک دے چکی ہے لیکن اسے انصاف نہ ملا! عالمی جنگوں میں ویرانی اور مایوسی کی فضا چھا گئی تھی۔ آمریت اور بربریت کی بھینٹ چڑھنے والے مظلوم انسانوں نے اپنے حقوق بحال کرنے کیلئے اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے اداروں کا وجود ضروری سمجھا تھا لیکن یہ ادارے اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے انصاف فراہم کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اسے ایک ایسے مسیحا کی تلاش ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا کرے جو اسے نفسانی خواہشات کی دلدل اور انسان دشمنی کی لعنت سے نکال کر روحانیت اور انسان دوستی (Love for mankind) کا درس دے اور زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے والی مقتدر طاقتوں کے خلاف جدوجہد کرے۔ علم اور عقل کی ترقی کے ساتھ انسان اسی طرف بڑھ رہا ہے۔

جہاں تک سلسلۂ نجات کا تعلق ہے تو اس کا واضح تصور تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ عہد عتیق، عہد جدید اور قرآن کریم سمیت تمام آسمانی کتابوں میں صراحت سے اس کی تاکید کی گئی ہے کہ آخری فتح حق کی ہوگی۔ زمین پر امن وامان قائم ہو جائے گا۔ عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا اور نیک لوگ زمین کے وارث بن جائیں گے۔ مسیحی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب پر لٹکا دیا گیا اور انہوں نے ان تمام مصائب کو برداشت کیا اس لئے کہ انہوں نے انسانیت کے نجات دہندہ (Saviour) کی حیثیت سے ان کے تمام گناہوں کا ازالہ کرنا تھا۔ یوں وہ نجات کے تصور کو صلیب سے وابستہ کر لیتے ہیں حالانکہ اس کے بغیر بھی وہ "مسیح" کو نجات دینے والی شخصیت کے عنوان سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی میں انسانیت کی نجات کا راستہ ہموار کیا اور اپنے شاگردوں کو مسیحا بننا سکھایا بلکہ وہ زندہ ہیں اور انہیں انسانیت کی آخری نجات کے لئے دوبارہ بھیجا جائے گا۔ اس عقیدے میں مسلمان بھی مسیحیوں کے ساتھ برابر شریک ہیں۔

عہد جدید میں رسولوں کے اعمال میں ملتا ہے:

"لیکن جب روح القدس تم پر نازل ہوگا تو تم قوت پاؤ گے اور یروشلم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہو گے۔ یہ کہہ کر وہ ان کے دیکھتے دیکھتے اوپر اٹھا لیا گیا۔۔۔ اور اس کے جاتے وقت جب وہ آسمان کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے تو دیکھا کہ دو مرد

سفید پوشاک پہنے ان کے پاس آکھڑے ہوئے اور کہنے لگے اے گلیلی کے مردو! تم کیوں کھڑے آسمان کی طرف دیکھتے ہو۔ یہی یسوع جو تمہارے پاس آسمان پر اٹھالیا گیا ہے اسی طرح پھر آئے گا جس طرح تم نے اسے آسمان پر جاتے دیکھا ہے۔ (رسولوں کے اعمال ۱۱-۸ :۱)

قرآن مجید سلسلۂ نجات پر یوں روشنی ڈالتا ہے :

"اور بے شک ہم نے زبور میں اور اس کے بعد ذکر (توریت) میں لکھ دیا ہے کہ میرے نیک بندے ہی زمین کے وارث ہوں گے۔ اس میں عبادت گذار لوگوں کے لئے (ایک بڑا) پیغام ہے۔" (انبیاء۔ ۱۰۵)

عہد عتیق کے موجودہ نسخوں کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے اس وعدے کی سچائی پر اس وقت مزید اطمینان ہوا جب زبور کے مختلف ابواب (باب نمبر ۲۴، ۲۱، ۱۸) میں اس کی جانب اشارے دیکھے اور باب نمبر ۳۷ میں اسے واضح طور پر تلاش کر لیا۔ اس ضمن میں باب نمبر ۳۷ کی کچھ آیات قابل غور ہیں :

"خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔ (۷)

اس آدمی کے سبب سے جو اپنی راہ میں کامیاب ہوتا اور برے منصوبوں کو انجام دیتا ہے

بیزار نہ ہو۔ قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔ (۸)

بیزار نہ ہو اس سے برائی نکلتی ہے کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے۔ (۹)

لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔

لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے اور (۱۱)

سلامتی کی فراوانی سے شادمان رہیں گے۔

لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔ کامل لوگوں کے ایام کو خدا جانتا ہے۔ (۱۷)

ان کی میراث ہمیشہ کے لئے ہوگی۔

وہ آفت کے وقت شرمندہ نہ ہوں گے اور کال کے دنوں میں آسودہ رہیں گے۔ لیکن شریر ہلاک ہوں گے۔ (۱۹)

شریر قرض لیتا ہے اور ادا نہیں کرتا۔ (۲۱)

لیکن صادق رحم کرتا ہے اور دیتا ہے۔

کیونکہ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے اور جن پر لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔ (۲۲)

اس ضمن میں سنت نبویؐ میں بہت سی تفصیلات موصول ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے

بعض چیزیں اختلافی ہیں اور بہت سی غیر معتبر روایات بھی شامل کر لی گئی ہیں لیکن اتنا ضرور مسلم ہے کہ نجات کی یہ آخری منزل کہ جس میں عیسیٰ مسیح زمین پر واپس آئیں گے اور نیک لوگ زمین کے وارث بنا دیئے جائیں گے 'امام مہدیؑ کے انقلاب میں طے ہو گی۔ امام مہدی کے بارے میں اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ ان کی ولادت نہیں ہوئی جبکہ شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام مہدیؑ زندہ ہیں۔ ان کی اس طویل زندگی کے بارے میں شکوک و شبہات ظاہر کئے جاتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اتنی طویل زندگی دے سکتا ہے 'اصحاب کہف کو صدیوں نیند کی حالت میں رکھ سکتا ہے تو امام مہدی کو بھی اتنی طویل عمر دے سکتا ہے۔ بہر صورت شیعہ سنی دونوں متفق القول ہیں کہ جب امام مہدی ظہور کریں گے تو عیسیٰ مسیح بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اس ضمن میں ہم صحیح بخاری (کتاب الانبیاء) اور صحیح مسلم میں موجود ایک روایت کو نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

"حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ تم کیا محسوس کرو گے جب ابن مریم تم پر نازل ہوں گے جبکہ تمہارے امام تمہارے درمیان ہوں گے"

کتاب مقدس میں ہے کہ مسیح علیہ السلام نے انسانیت کی نجات کی پیشگوئی بھی کی اور بتایا کہ انسانیت کی نجات یروشلم کی تباہی کے ہمراہ ہو گی!

"پھر جب تم یروشلم (Israel) کو فوجوں سے گھرا ہوا دیکھو تو جان لینا کہ اس کا اجڑنا نزدیک ہے۔ اس وقت جو یہودیہ (Judea) میں ہیں پہاڑوں پر بھاگ جائیں اور جو یروشلم کے اندر ہوں باہر نکل جائیں اور جو دیہات میں ہوں شہر میں نہ جائیں۔ کیونکہ یہ انتقام کے دن ہوں گے جن میں سب باتیں جو لکھی ہیں پوری ہو جائیں گی... اور جب تک غیر قوموں کی میعاد پوری نہ ہو یروشلم غیر قوموں سے پامال رہے گا... اس وقت لوگ ابن آدم کو قدرت اور بڑے جلال کے ساتھ بادل میں آتے دیکھیں گے اور جب یہ باتیں ہونے لگیں تو سیدھے ہو کر سر اوپر اٹھانا اس لئے کہ تمہاری نجات نزدیک ہو گی"

رسولوں کے اعمال میں جس طرح مسیحؑ نے اپنی واپسی (Resurrection) کی پیشن گوئی کی تھی اس میں انہوں نے کہا تھا کہ لوگ یروشلم بلکہ دنیا کے آخری حصے تک ان کے شاہد ہوں گے۔ اس ضمن میں قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل (۸۔۴) کی کچھ آیات قابل توجہ ہیں۔ ان تمام حقائق کے ذکر کئے جانے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صرف مسیحی ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی مسیح علیہ السلام کو انسانیت کے نجات دہندہ (saviour) کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ لہذا یہ مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت کے لئے تیار کریں اور

ماحول ہموار کرنے کی کوشش کریں تاکہ نجات کا وقت قریب آسکے۔اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان لوگوں کا حساب صاف کیا جائے جو ان عقائد میں تحریف کرتے ہیں اور غلام احمد قادیان اور گوہر شاہی کی طرح جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔

اس مقالے کا ماحصل یہ ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ مسیحی اس حقیقت کا اعتراف کرلیں کہ قرآن اور سنت کا تفصیلی مطالعہ کئے بغیر وہ حضرت عیسیٰ کی اصل شخصیت کو سمجھنے اور ان کی سچی تعلیمات تک پہنچنے میں ناکام رہیں گے۔اسلام کا موقف سمجھے بغیر وہ مسیح اور ان کی والدہ کے بارے میں بہت سے حقائق سے غافل رہیں گے۔ تعصبات کا لبادہ اتار کر اور گرجا گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکال کر ہی وہ حضرت عیسیٰ اور ان کے شاگردوں (Apostles) کے راستے کو تلاش کرسکیں گے۔

مدارک

Gideons` The Holy Bible

Good News Bible, New York : 1983

Dr. Maurice Bucaille, the Bible, Holy Quran and science,

Qom: Ansariyan Pub, 1996

Al-Tawhid, Quarterly,Qom :1996, vol.13, No-3

حسین طباطبائی، تفسیر المیزان

طبرسی، تفسیر مجمع البیان

رشید، تفسیر المنار، مصر

بخاری، صحیح بخاری، کتاب الانبیاء

مسلم، صحیح مسلم

کتاب مقدس، لاہور: پاکستان بائبل سوسائٹی، ۱۹۹۲

خاتم الانبیاء

عربی زبان میں مہر کو خاتم کہتے ہیں۔ معنی و وزن کے لحاظ سے اس کی نظیر طابع ہے۔ لغت کی معتبر کتاب لسان العرب معنی کرتی ہے الخاتم مایوضع علی الطینته۔ خاتم وہ ہوتی ہے جسے اسٹیمپ پر لگایا جاتا ہے۔ پہلے زمانہ میں جب کوئی خط یا دستاویز لکھا جاتا تھا تو اس کے اختتام پر ایک مہر لگادی جاتی تھی۔ یہ مہر ایک طرف سے خط لکھنے والے کا تعارف کراتی تھی تو دوسری طرف یہ اعلان کرتی تھی کہ اس دستاویز یا رقعہ کا مضمون ختم ہو گیا ہے۔ پس خاتم کے معنی مہر کے ہیں اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے ختم اللہ علی قلوبھم۔ خداوند عالم نے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔ یعنی یہ لوگ سرکشی اور نافرمانی میں تمام حدوں سے تجاوز کر گئے اور حق کی آواز کو نظر انداز کرنا ان کی عادت بن گئی تو حق تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں پر مہر لگادی اب یہ حق کی طرف نہیں پلٹ سکتے۔ خاتم عربی زبان میں انگوٹھی پر بھی اطلاق ہوتا ہے اس لیے کہ ایک عرصۂ دراز تک انگوٹھی سے مہر لگائی جاتی تھی۔ راغب اصفہانی خاتم الانبیاء کا معنی کرتے ہیں۔ لانہ ختم النبوۃ ای تمّمھابمجیئہ۔ آخری نبی جنہوں نے اپنی آمد کے ذریعہ سے نبوت کو پایہ تکمیل تک پہنچادیا۔ پس نبوت کو ایک ایسی دستاویز سے تشبیہ دیا گیا ہے جس میں بہت سے کلمات ہیں۔ یہ کلمات وہ تمام انبیاء ہیں جنہیں مختلف ادوار میں انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا جاتا رہا اور پروردگار عالم ان کے توسط سے انسان کو پیغام بھیجتا رہا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ پس جس طرح ایک دانشور ایک رقعہ لکھنے کے

بعد مہر لگا دیتا ہے کہ ضروری مطالب ختم ہو گئے جیسا کہ یہ کام موجودہ دور میں دستخط یا مہر سے انجام دیا جاتا ہے اسی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ جو وحی کے ذریعہ سے انسان سے گفتگو کرتا ہے اور اس کی ہدایت کا پروگرام تشکیل دیتا ہے خاتم انبیاء کو بھیج کر مہر لگا دیتا ہے کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ نبوت سیلڈ (Sealed) کر دی گئی اب اسے کھولنا محال ہے لہٰذا اب جو بھی نبوت یا رسالت کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا اور کذاب ہو گا۔ پس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خاتم النبیین ہیں یعنی انہوں نے اپنے وجود سے نبوت پر مہر لگا دی ہے۔ اور کیونکہ مہر مہر لگانے والے کا تعارف بھی کراتی ہے اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ جو کمالات اور انسانی و اخلاقی صفات تمام انبیاء میں مشترکہ طور پر پائی جاتی تھیں اور جو ان کے خصوصی اور فردی امتیازات تھے' جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان سے یکجا بر خوردار ہیں۔

کسی حد تک اس حقیقت کا اظہار مذکورہ شعر میں کیا گیا ہے:

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس کے علاوہ سرور کائنات میں ایسی خصوصیات بھی ہیں جو گزشتہ انبیاء میں ہرگز نہ تھیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ قیامت تک کوئی ایسا کامل انسان منصہ شہود پر نہ آئے گا جو آنحضرتؐ سے بھی زیادہ اکمل ہو۔ اس لیے کہ اگر قانون الٰہی میں ایسی کوئی گنجائش ہوتی یا کسی کامل تر انسان کو دنیا میں آنا ہوتا تو ہرگز پیغمبر اکرمؐ کو خاتم کا درجہ نہ دیا جاتا بلکہ اس کامل انسان کو خاتم بنایا جاتا' اسکی اطاعت کو فرض ٹھہرایا جاتا اور اس کی لائی ہوئی شریعت کو افضل قرار دیا جاتا۔ لہٰذا آنحضورؐ کو خاتم النبیین بنا کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ ایسا کوئی شخص نہیں آئے گا۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ختم نبوت پر مسلمانوں کے درمیان مکمل اتفاق ہے اور اس پر بھی کہ جو اس عقیدے کو نہ مانے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا محال ہے کہ کوئی آنحضرتؐ کو نبی تو مانے لیکن ان کی خاتمیت سے انکار کرے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی قرآن کریم پر تو ایمان لے آئے لیکن توحید کا منکر بن جائے۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے کیونکہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے جو توحید و وحدانیت کا درس دیتی ہے۔ قرآن جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ختم نبوت کا واضح اعلان کرتا ہے:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین۔ (احزاب۔ ۴۰)

محمدؐ تم مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں۔

عربوں میں قدیم سے یہ [illegible] رہی ہے کہ لوگوں کو ان کی اولاد کے حوالے سے

ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی کے بچے کا نام زبیر ہے تو اسے ابا زبیر کہہ کر پکارا جائے گا۔ اسلا
سے پہلے حضرت خدیجہ کا زید نامی ایک غلام تھا جسے انہوں نے آنحضورؐ کی نذر کر دیا تھا او
آنحضرتؐ نے زید کو آزاد کر دیا تھا۔ زید آنحضورؐ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور جب اسلام آیا
بہت سے معتبر تاریخی مصادر کے مطابق حضرت علی کے بعد سب سے پہلے زید بن حارثہ اسلا
لائے تھے۔ یہ وہی زید ہیں جن کی شادی آنحضورؐ نے اپنی پھوپی زاد بہن زینب بنت جحش سے کی
تھی اور جنگ موتہ میں وہ شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ نے انہیں اپنا منہ بولا
بیٹا بنالیا تھا۔ عربوں کے مرسوم قاعدہ کے مطابق تمام چیزوں میں منہ بولے بیٹے کو سگے بیٹے کا
درجہ دیا جاتا تھا لیکن قانون الٰہی نے جاہلیت کی اس رسم کو قبول نہ کیا۔ خداوند عالم کو یہ بات پسند نہ
آئی کہ جیسے اور لوگوں کو پکارا جاتا ہے ویسے اس کے نبیؐ کو بھی ابا زید کہہ کر مخاطب
کیا جائے۔ عربی زبان میں رجال مردوں پر اطلاق ہوتا ہے یعنی وہ صنف جو بچوں اور عورتوں کے
بالمقابل ہو۔ نیز خطاب فقط اس دور کے مردوں سے ہے۔ لہٰذا اس آیہ کریمہ میں حضرت قاسم،
ابراہیم اور امام حسن و حسین علیہما السلام کے فرزند ہونے میں کسی قسم کا تضاد نہیں جو بچے تھے اور
عہد طفولیت میں تھے اور قرآن کریم نے سورۂ آل عمران (۶۱) میں انہیں ابناء نا کے نام سے یاد
کیا ہے۔ اس نکتہ کی اس لیے وضاحت کی گئی ہے کہ مذکورہ آیہ کریمہ سے آنحضرتؐ کا ابتر ہونا
لازم نہیں آتا۔ بہر صورت قرآن کریم نے آنحضرتؐ کی ختم نبوت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ
رہنے دیا اور مسلمانوں کو پابند کر دیا کہ وہ جب بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یاد کریں
تو اس عنوان سے یاد کریں کہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔

قرآن کریم

اگر سورۂ احزاب میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے کی
صراحت نہ بھی کی جاتی تو خود قرآن کریم آپؐ کی ختم نبوت کا اعلان کرنے اور نبوت پر مہر لگانے
کے لیے کافی تھا۔ انا نحن نزلنا الذکر وانّا له لحافظون۔ (حجر۔۹) یقیناً یہ ذکر ہم نے نازل کیا
ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف خواہ ناخواہ اہل
کتاب کو بھی کرنا پڑتا ہے کہ اگرچہ حضرت موسیٰ پر توریت نازل ہوئی تھی اور حضرت عیسیٰ
پر انجیل۔ لیکن یہ آسمانی کتابیں حق و حقیقت کے دشمنوں اور تحریف کرنے والوں کے گزند سے
محفوظ نہ رہ سکیں اور ان میں اس حد تک تحریفات کی گئیں کہ ان کی اصلی اور واقعی شکل مسخ

ہو گئی۔ لیکن قرآن کریم کے سلسلہ میں ایسا نہ ہوا۔ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی یہ کتاب اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں باقی ہے۔ یہ وہ آسمانی کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود زمین و آسمان کے خالق نے لیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ہرگز منسوخ نہ ہو گی۔ ہم اس ضمن میں بعد میں گفتگو کریں گے کہ قرآن کریم کے احکامات اور قوانین فطری اصولوں پر استوار ہیں کسی خاص زمانہ کی حد تک محدود نہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم میں بشر کی ہدایت کا مکمل سامان موجود ہے اس لیے اس کی لائی ہوئی شریعت قیامت تک باقی رہے گی اور کسی نئی شریعت کے بھیجنے کا جواز باقی نہیں رہتا۔ لیکن ابھی جس صفت کو بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ دوسری آسمانی کتابوں کی بہ نسبت قرآن کریم ایک اور امتیاز سے برخوردار ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب گزشتہ آسمانی کتابوں پر علمی و معنوی سلطنت رکھتی ہے۔ اس میں صرف گزشتہ قوموں کی بہ نسبت اتنا ہی نہیں لکھا ہوا جتنا کہ تورات وانجیل یا صحف ابراہیم میں لکھ دیا گیا تھا بلکہ اس کے علاوہ بھی ایسے حقائق و معانی و علوم ہیں جن کی وجہ سے مجموعاً یہ کتاب تمام آسمانی کتابوں پر بالادستی سے برخوردار ہے۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصد قالما بین یدیہ من الکتاب و مہیمناً علیہ (مائدہ۔۴۸)

اور ہم نے اس کتاب کو حق سے تم پر نازل کیا جو گزشتہ آسمانی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر بالادستی رکھتی ہے۔

مستشرقین ہمیشہ سے اس قسم کے امکانات کو اہمیت دیتے آئے ہیں کہ شاید پیغمبر اکرمؐ نے جزیرۃ العرب میں موجود یہودیوں اور نصرانیوں سے گذشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات کو اخذ کیا ہو۔ یہ امکان سرے سے غلط ہے۔ ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا لیکن اس حقیقت کا اظہار لازم ہے کہ اس کتاب میں صرف وہی حقائق نہیں جو حقیقی تورات وانجیل میں تھے بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ مسیحیت کی دنیا میں یہ نظریات تازگی رکھتے ہیں اور جدید تحقیقات کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ پر ایک آسمانی کتاب نازل ہوئی تھی جو آرامک (Aramaic) میں تھی اور ضائع ہو گئی یا ابھی تک کلیسا کے بند دروازوں میں اس کا نام و نشان موجود ہے۔ یہ بھی قرآن کی حقانیت کی دلیل ہے جو انجیل کے وجود کی تشریح کرتا ہے لیکن اگر موجودہ انجیل اور تورات کا موازنہ قرآن کریم سے کیا جائے اور موازنہ کرنے والا چاہے کسی مذہب و مسلک سے کیوں نہ ہو اسے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن کریم کو ان پر غیر معمولی برتری حاصل ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت عیسیٰ مسیح کی زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کے انجام کار کو جس خوبصورتی اور پاکیزگی سے قرآن کریم نے بیان کیا ہے اتنا انجیل میں نہیں بیان کیا گیا۔ پس قرآن کریم صرف گزشتہ شرائع کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ ان میں

ردوبدل بھی کرتا ہے ان کی حفاظت وحراست بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ان پر تسلط اور "ہیمنہ" رکھتا ہے عربی زبان میں ہیمنہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب ایک چیز کسی دوسری چیز پر اقتدار وسلطنت رکھتی ہو۔ ان میں ردوبدل کر سکتی ہو اور ان پر اسے بالادستی حاصل ہو۔ قرآن کریم کا بھی یہی حال ہے جو آسمانی کتب کے ثابت و مستحکم اصولوں اور اللہ کے نہ بدلنے والے قانون کو اخذ کرتا ہے اور ان میں سے جو زمان و مکان وشریعت کے لحاظ سے مسترد ہو چکے ہیں انہیں منسوخ کرتا ہے۔

یہ ایک واضح امر ہے کہ ہر نبی کی روحانی و معنوی شخصیت اس کی لائی ہوئی آسمانی کتاب کے سائے میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لیے جو انبیاء ایک مکمل شریعت اور کتاب لائے (اولوالعزم) وہ دوسرے انبیاء پر فضیلت رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا مقام ان کی کتاب تورات کی حد تک ہے۔ حضرت عیسیٰ مسیح کا مقام انجیل کی سطح تک ہے۔ پس اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن گزشتہ آسمانی کتابوں پر علمی و معنوی بالادستی سے برخوردار ہے اور ایسے امتیازات رکھتا ہے جو ان میں نہ تھے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اس نسخہ کیمیا کو ساتھ لائے وہ بھی یقیناً تمام انبیاء سے اعلیٰ اور افضل ہوں گے۔ لہٰذا جو کتاب تمام آسمانی کتب پر بالادستی رکھتی ہو اور تحریف کے گزند سے محفوظ ہو وہ گزشتہ شرائع کو تو منسوخ کرتی ہے لیکن خود منسوخ نہیں ہوا کرتی۔

بشارت

بشارت ایک سنت الٰہی ہے جو قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ پروردگار عالم نے اپنے نبیوں کو ایک خاص نظم وترتیب سے بھیجا۔ ہر نبی گزشتہ نبی اور اس کی کتاب کی تصدیق کرتا تھا اور آئندہ نبی کی بشارت دینے کا ذمہ دار تھا۔

"واذ اخذالله ميثاق النبين لما آتيتكم من كتاب وحكمة ثم جالكم رسول مصدق لما معكم لتتومنن به ولتنصرنه" (آل عمران۔۸۱)

اس وقت کو یاد کرو جب پروردگار عالم نے تمام انبیاء سے یہ عہد لیا تھا کہ جب تمہیں کتاب وحکمت دی جائے پھر اس کے بعد ایک رسول آئے جو تمہارے درمیان موجود (کتاب) کی تصدیق کرے تو تم اس پر ضرور ایمان لانا اور اس کی مدد ونصرت کرنا۔ (آل عمران۔۸۱)

اس آیہ کریمہ میں تمام انبیاء سے یہ عہد ومیثاق لیا گیا ہے کہ وہ اپنے بعد آنے والے رسول پر ایمان لائیں گے اور اس کی نصرت کریں گے یعنی اپنی قوم کو اس نبی کی بشارت دیں گے اور اس نبی پر ایمان لانے کی ترغیب دیں گے۔ اس رسول کی بنیادی نشانی یہ ہوگی کہ یہ اس وقت موجود

آسمانی کتاب کی تصدیق کرے گا۔

ایک اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ بشارت وہاں دی جاتی ہے جہاں آنے والا نئی اور جدید چیزیں لے کر آئے لیکن اگر اس کی تعلیمات بھی گزشتہ آسمانی کتابوں کی حد تک ہوں تو پھر اسے بشارت نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی نئی کتاب کی ضرورت رہے گی۔ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کی زبانی نقل کرتا ہے:

واذقال عیسی بن مریم یابنی اسرائیل انی رسول الله الیکم مصدقا لمابین یدی من التوراة ومبشراً برسول یأتی من بعدی اسمه احمد(صف۔۶)

اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے (قوم یہود سے) کہا: اے اسرائیل کے فرزندوں میں تمہارے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میں تمہارے درمیان موجود تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور تمہیں اپنے بعد ایک رسول کی آمد کی بشارت دیتا ہوں جس کا نام احمد ہے۔

تورات اور انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس قدر نشانیاں بیان کی گئی تھیں کہ گویا اس رسول کی پوری شخصیت کو تورات وانجیل میں لکھ دیا گیا تھا۔ جزیرۂ نما عرب میں ظہور کرنے والا یہ نبی کہ جس نے کسی مکتب ومدرسہ میں لکھنا پڑھنا نہ سیکھا تھا کسی نامانوس شخصیت کا مالک نہ تھا بلکہ یہ لوگ ان کتابوں کے توسط سے اس کے اوصاف اور اس کے وجود کو اچھی طرح جان چکے تھے۔ "الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل" (اعراف۔۱۵۷)

"جو لوگ اس امی نبی ورسول کی پیروی کرتے ہیں کہ جسے انہوں نے توراۃ وانجیل میں لکھا ہوا پایا ہے۔ وہ اس نبی کو اسی طرح پہچانتے تھے جس وضاحت کے ساتھ اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے تھے۔" الذین آتیناهم الکتاب یعرفونه کما یعرفون ابناء هم (بقرہ۔۱۴۶)

جن لوگوں کو کتاب دی گئی وہ اس (نبیؐ) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بچوں کو جانتے پہچانتے ہیں۔

پس ہر نبی نے آنے والے نبی کی بشارت دی۔ خاتم الانبیاء نے گزشتہ انبیاء اور آسمانی کتب کی تصدیق تو کی لیکن آئندہ کسی نبی کی بشارت نہ دی۔ یہ خود واضح دلیل ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت تا ابد باقی رہے گی۔

نہج البلاغہ سے ایک اقتباس

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں خداوند عالم کے حضور یہ دعا کرتے ہیں:

اجعل شرائف صلواتك ونوامی برکاتك علی محمد عبدك و رسولك الخاتم لماسبق والفاتح لما انغلق والمعلن الحق بالحق۔(۱)

بارالہا تو اپنی خاص رحمتیں اور پاکیزہ ترین برکتیں اپنے بندہ اور رسول پر قرار دے جو سلسلہ نبوت کے آخری نبی تھے جنہوں نے مہر لگا کر اسے بند کر دیا اور حقائق و معانی اور ہدایت و سعادت کے بند دروازوں کو کھول دیا اور جنہوں نے حق کی مدد سے حق و حقیقت کو آشکار کیا۔

دین الٰہی اور شریعتوں کا اختلاف

اب جبکہ اس چیز کی وضاحت کر دی گئی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ختم نبوت میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہے تو ایک اور سوال سامنے آتا ہے جو بسا اوقات اسلام دشمن عناصر کی جانب سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر خداوند عالم کے نزدیک دین ایک تھا تو پھر مختلف شریعتیں کیوں آئیں اور اگر وقت اور زمانہ کے حساب سے مختلف شریعتوں کو آنا تھا اور گزشتہ شرائع کو منسوخ ہونا تھا تو چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسلام اور شریعت محمدی کیوں منسوخ نہ ہوئی......؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ کے دین کی حقیقت اور شریعتوں کے اختلاف کی نوعیت کی جانب مختصر سا اشارہ کرتے چلیں۔

قرآن کریم دین کو ایک زندہ اور ختم نہ ہونے والی حقیقت کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس کی یہ تعریف کرتا ہے کہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کے سامنے تسلیم محض ہو جانا اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرانا۔" ان الدین عندالله الاسلام (آل عمران۔ ۱۹) بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اس کے سامنے تسلیم محض ہو جانے کے ہیں۔"

ومن یبتغ غیرالاسلام دنیا فلن یقبل منه وھوفی الآخرة من الخاسرین(آل عمران ۔ ۸۵) "اور اگر کوئی اسلام کے سوا کسی اور (مکتب یا نظریہ) کو اپنا دین قرار دے گا تو اس کا یہ عمل ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارے میں رہے گا۔

تمام انبیاء علیہم السلام نے اسی ابدی دین کی طرف انسانیت کو دعوت دی کہ وہ کسی چاند' سورج' ستارے یا مخلوق میں سے کسی ایسی چیز کو خالق کا شریک نہ ٹھہرائیں جو اپنا اختیار خود نہیں رکھتی۔ تمام انبیاء نے خدائے وحدہ لاشریک کی طرف بلایا اور انسانیت کو یہ بتایا کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں بلکہ ایک گذر گاہ ہے۔ اور آخرت کا گھر ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔ تمام انبیاء نے

---

(۱) نہج البلاغہ 'فیض الاسلام خطبہ ۷۱

خواہشات اور ہوا و ہوس کی پیروی کرنے کی مخالفت کی 'اخلاق و کردار کو سنوارنے کی بات کی اور برادری و برابری کا پیغام دیا۔ تمام انبیاء نے ظلم و ستم کی مخالفت کی اور حق و انصاف کا پرچار کیا۔ قرآن کریم ابوالانبیاء حضرت ابراہیم کو اس دین کا بانی قرار دیتا ہے جنھوں نے اس وقت توحید کا پرچم بلند کیا جب انسانیت شرک و بت پرستی میں ڈوب چکی تھی اور حق کے پرستاروں کو مسلمان کے نام سے یاد کیا۔ ملة ابیکم ابراهیم هو سما کم المسلمین (حج۔ ۷۸)

تمہارے والد ابراہیم کی ملت جنھوں نے تمہیں مسلمان کے نام سے یاد کیا۔ پس اس سے اندازہ ہو گیا کہ دین ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں۔ جو چیز وقت اور زمانہ کے اعتبار سے بدلتی رہی ہے وہ شریعتیں ہیں۔ خداوند عالم نے انسان کی ہدایت کے لیے ہزاروں انبیاء بھیجے۔ ثم ارسلنا رسلنا تترا (مومن۔ ۴۴) پھر ہم نے پیغمبروں کو پے در پے بھیجا۔ ولقد وصلنالهم القول لعلهم یتذکرون (قصص۔ ۵۱) ہم نے اپنے نبیوں پر مسلسل اپنے پیغامات بھیجے تاکہ شاید (ان کی قومیں) اس سے نصیحت حاصل کر لیں۔ ان آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے زمین کو اپنی حجت سے خالی نہیں ہونے دیا جو کسی نبی یا رسول یا اسکے جانشین یا آسمانی کتاب کی صورت میں موجود رہی۔ "تترا" وہاں کہا جاتا ہے جہاں ایک کے بعد ایک آنے والا ایک صنف سے ہو۔ یہ خود اس کی دلیل ہے کہ جو دین انبیاء لائے وہ ایک سنخ سے تھا۔ قرآن مجید (سورۂ مائدہ۔ ۴۷) شریعتوں کے اختلاف کی وضاحت کرتا ہے اور شرائع کے اختلاف کا فلسفہ بیان کرتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قوموں اور شریعتوں کے اختلاف سے انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ کیا انسان حق کا پیغام قبول کرتا ہے۔ کیا قوم بنی اسرائیل و یہود اس حق کا پیغام قبول کرتی ہے جو حضرت مسیح لے کر آئے تھے اور کیا یہود و نصاریٰ حق کا وہ پیغام قبول کرتے ہیں جسے محمدؐ عربی لائے تھے۔ اس کے برخلاف قرآن سورۂ شوریٰ آیہ نمبر ۱۳ میں دین کی وحدانیت اور ثابت حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہر حال جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ دین ایک ابدی حقیقت ہے لیکن مختلف دور اور مختلف تقاضوں کے اعتبار سے پروردگار عالم نے انسانیت کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا۔ ان پانچ مرحلوں میں پانچ شریعتیں بھیجی گئیں۔ ہر نئی شریعت گزشتہ شریعت کی حقانیت کی تصدیق کرتی رہی اور اسکے کچھ احکامات کو منسوخ کرتی گئی اور کچھ جدید احکام اور تعلیمات لاتی رہی یہاں تک کہ خاتم الانبیاء کا دور آ گیا اور جب انہوں نے اللہ کے دین کی تعلیمات کا پرچار کر دیا اور تمام احکامات کو بیان کر دیا تو پھر دین کامل ہو گیا اور سرور کائنات کی شریعت ہرگز منسوخ نہیں ہوگی بلکہ قیامت تک باقی رہے گی۔ جو انبیاء ان شریعتوں کو لے کر آئے اور

صاحب کتاب بھی تھے' انہیں اولوالعزم نبی کے نام سے یاد کیا گیا۔ ان کی تفصیل یوں ہے: (۱)

(۱) حضرت نوح علیہ السلام	صحیفہ نوح
(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام	صحیفہ ابراہیم
(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام	توریت
(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام	انجیل
(۵) خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	قرآن کریم

جب ایک نبی کو کتاب و شریعت کے ساتھ بھیجا جاتا تھا تو اس کے بعد بہت سے انبیاء اس شریعت کی حفاظت اور ترویج و تبلیغ کے لیے مامور کیے جاتے تھے۔ بسا اوقات ہر ہر گاؤں یا شہر کے لیے الگ نبی بھیجا جاتا تھا۔ اور کبھی ایک ہی علاقے میں متعدد انبیاء کو بھیجا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں حضرت اسماعیل' حضرت اسحٰق اور حضرت لوط نبی تھے اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ و اسباط اور دوسرے انبیاء اس کی تبلیغ کے ذمہ دار تھے۔ گویا کہ اس وقت انسان اپنی ارتقاء کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اور ایک نبی کی شریعت کی حفاظت اور نشر و اشاعت کے لیے بھی نبی کی ضرورت پڑتی تھی۔ پس اصل شریعت بھی وحی کے ذریعہ آتی تھی اور شریعت کی حفاظت بھی وحی کے ذریعہ ہوتی تھی۔

جب حضرت موسیٰ کو نبی بنا کر بھیجا گیا تو ان کے زمانہ میں حضرت ہارون اس شریعت اور دین الٰہی کے محافظ تھے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے انبیاء جن کا تذکرہ ملتا ہے اور جن کی جانب قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۲ میں ان میں سے بارہ انبیاء کا ذکر ملتا ہے جن سے پروردگار عالم نے عہد و میثاق لیا تھا۔ اس کے علاوہ سورۂ انبیاء ۷۳ میں بھی ان کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ جب یہ دور بھی گزر گیا تو کفر و ضلالت اور شرک ایک بار پھر سر اٹھانے لگا۔ خیانت اور بدعت کا ہاتھ دین موسوی تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ انسان اب ارتقاء کی ایک اور منزل پر تھا لہٰذا پروردگار عالم نے حضرت عیسیٰ کو نبی بنا کر بھیجا جنہوں نے تورات کی تصدیق کی اور ایک نئے نبی کی آمد کی بشارت دی۔ حضرت عیسیٰ کا عہد نبوت بہت مختصر تھا۔ لیکن اس مختصر دور میں بھی وہ انسانیت کو شرک و گمراہی اور جمود و تحریفوں سے نکالنے آئے تھے اور روحانی و جسمانی امراض میں مبتلا انسانیت کے لیے ایک مسیحا بن کر آئے تھے۔ چنانچہ جب ان کی شہرت اور ان کا لایا ہوا حق کا پیغام پھیلا تو باطل نے اسے سرنگوں کرنا چاہا۔ انہوں نے حق کی نصرت اور دین الٰہی کی مدد کے لیے آواز دی اور اس آواز پر سچے دل سے حواریوں نے لبیک کہا۔ حضرت عیسیٰ

(۱) اس تفصیل کی طرف بھی سورۂ شوریٰ۔ ۱۳ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مسیح کے مرید اور پیروکار کافی تھے لیکن جب اس وقت کی مقتدر طاقتوں نے انہیں اور ان کے پیغام و تعلیم کو دبانا چاہا تو صرف حواری باقی رہ گئے تھے۔ حواریوں کی تعداد بارہ تھی۔ موجودہ انجیل کے مطابق سب نے سب حضرت عیسیٰ کے مخلص اور وفادار پیروکار تھے سوائے بارہویں حواری یہودا نے خیانت کی پھر اس کے بعد توبہ کرلی۔ لیکن قرآن کریم حواریوں کے ایمان اور استقامت کو غیر قابل خدشہ بیان کرتا ہے اور ان کی ثابت قدمی کی تعریف کرتا ہے۔ اور کیونکہ یہ موضوع خود مسلمانوں کے درمیان بھی قدرے اختلافی ہے اس لیے ہم اس موضوع پر الگ سے لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ کے حواری

فلما احسّ عیسیٰ منهم الکفر قال من انصاری الی الله قال الحواریون نحن انصار الله آمنا بالله واشهد بانا مسلمون (آل عمران۔ ۵۲)

جب عیسیٰ نے اپنی قوم سے کفر کا احساس کیا تو کہا کہ کون ہے جو اللہ کے راستہ میں میری مدد کرے۔ حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے راستہ میں تمہاری مدد کرنے والے ہیں۔ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور گواہ رہنا کہ ہم (حق کے سامنے) تسلیم محض ہیں۔

اہل لغت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حواری یعنی وہ شخص جو پاک و صاف ہو اور اخلاص رکھتا ہو۔ تفسیر المنار میں لغت کی کتاب اللسان سے نقل کیا گیا ہے "اللغتہ تدل علی الخلوص والنقاء مطلقا" لغت مطلق پاکیزگی اور خلوص و طہارت کی بیانگر ہے۔ نیز جن عورتوں کا رنگ بالکل سفید ہوتا ہے اور جو پاک و صاف رہتی ہیں انہیں حواریات کہا جاتا ہے۔ اس حوالہ سے اہل لغت کے مطابق حواری یعنی جو ہر عیب سے پاک ہو اور جس کا ایمان کفر و شرک اور نفاق کی ملاوٹ سے دور ہو۔ پس قرآن کریم کا حضرت عیسیٰ کے بعض پیروکاروں پر حواری کا لفظ اطلاق کرنا ہی حواریوں کے ایمان کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ قرآن کریم حواریوں کے زبان حال اور زبان قال یعنی ان کی گفتار و کردار سے یہ جملے نقل کرتا ہے کہ وہ ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ کا ان کے ایمان پر اعتراض نہ کرنا اور خاموش رہنا ان کی سچائی کی دلیل ہے۔ اسی لیے اس کے بعد جو آیہ کریمہ نقل کی گئی ہے اس میں وہ خدا کے حضور یہ دعا کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ہم نے اپنے رسول یا نبی کی پیروی کی پس ہمیں نیک بندوں میں لکھ دے۔ یہ ان کے کردار کا اثر تھا کیونکہ اگر انہوں نے اپنی زندگی میں کہیں بھی حضرت عیسیٰ کی لائی ہوئی تعلیمات سے انحراف کیا ہوتا تو قرآن اسے ذکر کرتا یا کم از کم یہ جملے نقل نہ کرتا۔ چنانچہ حواریوں کے ایمان کے

خالص ہونے اور کفر والحاد اور بدعت وجمود کی اس تنگ و تاریک فضا میں ان کا ثابت قدم رہنا اور دین مسیح کی تبلیغ و ترویج کرنا ثابت کرتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کے سچے پیروکار تھے ورنہ حضرت عیسیٰ کے مرید اور چاہنے والے اس سے کہیں زیادہ تھے۔ قرآن مجید سورۂ صف (۶۱) آیہ نمبر ۱۴ میں مسلمانوں کو اسی طرح اللہ کے دین کی نصرت کرنے کا حکم دیتا ہے جس طرح کہ حواریوں نے اللہ کے دین کی نصرت کی تھی۔ اگر رتی برابر بھی حواریوں کے ایمان اور کردار میں خلل ہوتا تو یہ حکم نہ دیا جاتا۔ "اے ایمان لانے والو اللہ کے (دین کی) نصرت کرنے والے بن جاؤ جس طرح سے کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کون ہے جو اللہ کی (راہ میں میری) مدد کرے گا حواریوں نے کہا تھا ہم اللہ (کے دین) کی نصرت کرنے والے ہیں۔"

اسی لیے اکثر مفسرین انہیں ثابت قدم توصیف کرتے ہیں تاہم کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کے ایمان میں شک کرتے ہیں۔ ان میں زمخشری کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس رائے کے طرفدار چند محدود سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر حواری صحیح معنی میں ایمان و تقویٰ سے برخوردار ہوتے تو قدرت الٰہی میں شک نہ کرتے اور حضرت عیسیٰ سے خوان نازل کرنے کی فرمائش نہ کرتے۔

اذ قال الحواریون یعیسیٰ بن مریم هل یستطیع ربّك ان ینزل علینا مائدة من السماء۔ (مائدہ۔ ۱۱۲)

حواریوں نے عیسیٰ بن مریم سے کہا کہ کیا تمہارا پروردگار قادر ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان نازل کرے۔

ان لوگوں کے اس شبہ کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ لوگ آیہ کریمہ کے ذیل پر غور کرتے اور اس کے بعد والی آیت کا بھی مطالعہ کرتے تو ہرگز اس غلط رائے کو قائم نہ کرتے اور انہیں حواریوں کے ایمان میں شک نہ ہوتا۔ قرآن کریم اسی آیہ کریمہ کے ذیل میں یعنی آیہ۔ ۱۱۳ میں نقل کرتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے حواریوں کو تقویٰ کی ترغیب دی اور اس فرمائش کی وجہ جاننا چاہی تو حواریوں نے اس فرمائش کی چند وجوہات بیان کیں:

(۱) نرید ان ناکل منها...... ہم اس دستر خوان میں سے کھانا چاہتے ہیں یا تبرک کی غرض سے یا اس لیے کہ حواری شدید بھوکے تھے۔

(۲) وتطمئن قلوبنا...... ہمارے دل مطمئن ہو جائیں۔ حواری حضرت عیسیٰ کی نبوت اور خدا کی وحدانیت پر ایمان لے آئے تھے اور قرآن کی متعدد آیات اسے بیان کر چکی ہیں لیکن اس ایمان کا منشاء عقل اور دلیل تھی جبکہ وہ کسی ایسے معجزے کو دیکھنا چاہتے تھے جس سے ان کے دل اپنی گہرائیوں سے مسیح کی حقانیت کو باور کرلیں اور یہ کوئی بے جا تقاضا نہ تھا بلکہ قرآن کریم

حضرت ابراہیم خلیل کے بارے میں فرماتا ہے کہ انہوں نے بھی اسی قسم کا تقاضا کیا تھا اور جب پروردگار عالم نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ ایمان نہیں رکھتے تو اللہ کے خلیل نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ ایمان تو رکھتے ہیں لیکن چاہتے ہیں کہ دل مطمئن ہو جائے (بقرہ۔۲۶۰)

(۳) و نعلم ان قد صدقتنا و نکون علیها من الشاهدین۔

ہم مشاہدے (Observation) کی آنکھ سے تمہاری صداقت کو دیکھیں اور بعد میں جا کر اپنی قوم کے لوگوں میں اس سچائی اور معجزے کی حقانیت کو بیان کریں۔ خود اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حواری حضرت عیسیٰ کے دین اور شریعت کی تبلیغ و ترویج پر مامور کیے گئے تھے اور وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی ایسی نشانی یا معجزہ دیکھ لیں جس سے حضرت عیسیٰ کے بعد بھی استفادہ کریں اور لوگوں کو اس دین کا پیروکار بنائیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دین مسیح کی حقانیت اور حواریوں کا خلوص تھا جس کی وجہ سے دین مسیح پوری دنیا میں پھیلا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ اسلام اپنی حقانیت کی بنیاد پر آج دنیا کے چاروں طرف پھیل رہا ہے اور جیسے جیسے انسان اپنی تنگ نظری اور تعصبات کی آلودہ فضا سے بچے گا اتنا ہی اس دین کی حقانیت پر ایمان لے آئے گا۔
بہر حال حواریوں نے جب ان وجوہات کو بیان کیا تو ان کی اس فرمائش کو قبول کر لیا گیا اور آسمان سے ان کے لیے دستر خوان نازل ہوا۔ اگرچہ خود ان آیات سے واضح ہو گیا کہ ان کے ایمان میں شبہ ڈالنے کی کوئی گنجائش نہیں لیکن مشہور مفسرین نے اس قسم کا شبہہ ڈالنے والوں کے تفصیلی جوابات دیئے ہیں۔ ہم ان میں سے دو کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

(۱) امام فخر رازی التفسیر الکبیر میں اور صاحب تفسیر المنار اس آیہ کریمہ کے ذیل میں کسائی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے هل تستطیع ربّک کی قرائت کی ہے اس لیے کہ "ت" اور "ر" دونوں حروف ہم مخرج ہیں۔ یہ بھی متواتر ہے اور حضرت علی، حضرت عائشہ حضرت معاذ اور ابن عباس سے یہ قرائت نقل ہوئی ہے۔ حاکم نیشاپوری نے اس نقل کو بھی صحیح روایات سے استخراج کیا ہے اور کیونکہ اس قرائت سے کسی قسم کے شبہے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اس لیے امام فخر رازی بھی اسی قرائت کو ترجیح دیتے ہیں اور مشہور قرائت کو ان آیات کے منافی قرار دیتے ہیں جن میں حواریوں کے ایمان کو سراہا گیا ہے۔ اس قرائت کے مطابق معنی یہ ہوں گے کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم اپنے پروردگار سے یہ سوال کر سکتے ہو۔ جبکہ رائج قرائت کے معنی یہ تھے کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تمہارا پروردگار اس پر قادر ہے۔

(۲) اگر اس قرائت کو قبول نہ بھی کیا جائے اور رائج قرائت کے مطابق معنی کیا جائے تب بھی کوئی شبہہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حواریوں نے خداوند عالم کی قدرت کے بارے میں

سوال نہیں کیا بلکہ اس کی حکمت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ یعنی کیا یہ حکمت خداوندی کے مطابق ہوگا اگر ہم آسمان سے ایک دستر خوان کا سوال کریں اور اس سے ان کے کمال انکسار کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ استطاعت یہاں قبول مطاوعت کے معنی میں ہے۔ اور باب استفعال سے مراد طلب ہے۔ یعنی اے عیسیٰ بن مریم کیا تمہارا پروردگار ہمارے اس تقاضے کو قبول کر لے گا۔

حواریوں کے ایمان اور خلوص و استقامت کو واضح کرنے کے بعد جو چیز مورد نظر ہے وہ یہ کہ حواری نبی بھی تھے یا صرف حضرت عیسیٰ کے جانشین تھے۔ امام فخر رازی نے التفسیر الکبیر میں سورۂ مائدہ کی مذکورہ آیات کے ذیل میں دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک قول کے مطابق حواری نبی تھے جبکہ دوسرے قول کے مطابق وہ نبی نہ تھے بلکہ خالی جانشین تھے اور حضرت عیسیٰ کی شریعت کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہماری نظر یہ ہے کہ حواری نبی تھے جو لوگ ان کے نبی ہونے کو تسلیم نہیں کرتے وہ اس نبوت کے نظام اور سسٹم سے بے خبر ہیں۔ اس لیے کہ جب ایک نبی کو شریعت کے ساتھ بھیجا جاتا تھا تو نہ جانے کتنے نبی اس شریعت کی نشر و اشاعت کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ مزید یہ کہ اس وقت تک وحی و نبوت کا دروازہ بند نہ ہوا تھا اور حواریوں کا ایمان خالص تھا۔ وہ اس دین و آئین کے سچے پیروکار اور مخلص و وفادار تھے۔ پس کیا وجہ ہے کہ ان پر وحی نہ کی جاتی۔ اسی لیے قرآن کریم خود صراحت سے بیان کرتا ہے کہ ہم نے حواریوں پر وحی کی۔ اذ اوحیت الی الحواریین ان آمنوا بی وبرسولی قالوا آمنا و اشهد باننا مسلمون (مائدہ۔ ۱۱۱)

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں پر وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ بے شک ہم سچے مسلمان (حق کے سامنے مکمل طور پر تسلیم) ہیں۔

کچھ لوگوں نے ان آیات کی غلط تاویل و توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ظواہر قرآن حجت ہیں اور اس تاویل کی کوئی جگہ نہیں۔ قرآن کریم میں لفظ وحی کثرت سے استعمال ہوا ہے اور تقریباً حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے صرف ایک دو جگہ قرینہ اور مقام خود گواہ ہے کہ یہاں وحی کے حقیقی معنی مراد نہیں مثال کے طور پر (سورۂ قصص۔ ۷) میں ارشاد ہوتا ہے:

"ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی کی کہ اسے دودھ پلائیں اور اگر تمہیں اس (کی زندگی) کے بارے میں کسی طرح کا ڈر ہو تو اسے دریا میں بہا دو اور ڈرو نہیں اور غم نہیں کرو بے شک ہم اسے تمہاری جانب پلٹا دیں گے اور اسے مرسلین میں قرار دیں گے۔"

مذکورہ آیۂ کریمہ میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ صرف خالی الہام نہ تھا اس لیے کہ اگر صرف پہلا جملہ ہوتا تو الہام کہہ سکتے تھے بلکہ اس کے بعد مکمل ایک خطاب ہے جو مخاطب کے صیغہ سے کیا گیا ہے لیکن کیونکہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں سے جو خطاب کیا جائے اسے وحی نہ کہا جائے لہٰذا اسے وحی نہیں کہہ سکتے یہ الہام ہے۔ چنانچہ یا تو مذکورہ خطاب وحی ہے جو استثناء کے طور پر حضرت موسیٰ کی والدہ سے کیا گیا ہے تاکہ خداوند عالم اپنے اس نبی کی حفاظت کر سکے جو انسانیت کا خون کرنے والی فرعون کی ہزار سالہ سلطنت کو خاتمہ بخشے یا یہ ایک الہام تھا۔ ایک اور مثال جو قرآن کریم سے پیش کی جاتی ہے وہ شہد کی مکھی کی ہے: واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاً۔ (نحل۔۶۸) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ وہ پہاڑوں میں اپنے لیے چھتے بنائے۔

اس آیۂ کریمہ میں کیونکہ خطاب شہد کی مکھی سے ہے لہٰذا وحی کے معنی اس کی فطرت میں ودیعت کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ یہ کام جس فطری امر (Instinct) کی بنا پر کرتی ہے یہ اسے پروردگار عالم نے ودیعت کیا ہے کیونکہ شعور تو نہیں رکھتی۔ ان مثالوں میں مقام اور سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اصلی معنی مراد نہیں اس مثال کے علاوہ اگر وحی کا لفظ جہاں بھی بغیر قرینہ کے استعمال کیا گیا ہو تو اصلی اور حقیقی معنی مراد ہوں گے۔ لہٰذا کوئی جواز نہیں کہ حقیقی معنی سے نکال کر دوسرے معنی میں مورد بحث آیت کی توجیہ و تاویل کی جائے۔ پس اب جبکہ یہ بحث واضح ہو گئی تو ہم اپنی اصلی گفتگو کی طرف پلٹتے ہیں۔ مذکورہ ابحاث سے اس میں شک باقی نہیں رہتا کہ حواری حضرت عیسیٰ کے دین کے سچے اور مخلص پیروکار تھے۔ وہ نبی تھے اور عصمت سے برخوردار تھے اور حضرت عیسیٰ کے دین کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ہوتا چلا آیا تھا۔ لیکن جب انسان نے اس شریعت میں بھی رخنہ کیا، انجیل میں تحریفیں کیں اور حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ مریم کو پروردگار عالم کا شریک ٹھہرایا تو خداوند عالم نے آنحضرتؐ کی صورت میں ایک نئی شریعت بھیجی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت پر مہر لگا دی وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور جب وہ تمام احکام و تعلیمات کو بیان کر چکے تو اعلان کر دیا گیا کہ آج کے بعد دین کامل ہو گیا ہے۔ آنحضورؐ کے بعد ان کے جانشینوں نے اس شریعت کی پاسداری کا بیڑا اٹھایا۔ اہل سنت انہیں خلفائے راشدین کہتے ہیں اور شیعہ انہیں امام کے نام سے یاد کرتے ہیں جن کی تعداد بارہ ہے۔ پس دین ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوتا۔ جو چیز وقت کے ساتھ بدلتی رہی وہ شریعت اور فروعی احکامات ہیں۔ جیسے جیسے بشر علم و عقل اور تہذیب و تمدن کا سفر طے کرتا گیا ویسے ویسے شریعتیں بھی بھیجی جاتی رہیں۔

اور جب آخری شریعت کو بھیجا گیا تو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے شریعت کی جگہ اجتہاد نے لے لی۔ اور شریعت کی تبلیغ اور حفاظت و حراست کا فریضہ انبیاء کے بجائے نیک علماء کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان شریعتوں کا باہمی اختلاف سرمایہ داری اور سوشلزم میں موجود اختلاف کی طرح نہ تھا یعنی شریعت موسوی اور شریعت عیسوی میں تضاد نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دین تو ایک تھا بس کچھ خاص احکام منسوخ ہوتے تھے کچھ احکام باقی رہتے تھے اور کچھ جدید احکام نازل ہوتے تھے۔ اگر ہم ان شریعتوں کی ایک جامع مثال پیش کرنا چاہیں تو یہ شریعتیں پرائمری اسکول کی کلاسوں کی مانند ہیں۔ جیسے جیسے بچے میں شعور بڑھتا ہے وہ ایک کلاس سے دوسری کلاس میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور پانچویں کلاس ختم ہونے کے بعد ایک نیا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کلاسوں کے نصاب اور طرز تعلیم میں تضاد نہیں پایا جاتا بلکہ خاص علوم کے مختلف مرحلے اور درجے ہوتے ہیں جیسا کہ سورہ شوریٰ (آیہ نمبر۔ ۱۳) میں ان کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ پس اب جبکہ دین کی حقیقت واضح ہو گئی اور شریعتوں کے اختلاف کی جانب اشارہ کیا جا چکا تو اب ہم اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ باقی شرائع کیوں منسوخ ہوئیں اور آنحضورؐ کی لائی ہوئی شریعت کیوں باقی رہے گی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ ادوار میں بشر اس طفل مکتب کی مانند تھا جو کتاب و قلم اور علم و دانش کی حفاظت کرنے کے قابل نہ تھا۔ اگر اسے کتاب دی جائے تو وہ اس کتاب کو پھاڑ دیتا ہے۔ یہی کچھ گزشتہ قوموں نے آسمانی کتابوں کے ساتھ کیا اور اسی لیے نہ ہمارے پاس صحیفۂ ابراہیم ہے نہ تورات و انجیل اپنی اصلی صورت میں باقی ہیں۔ بلکہ گزشتہ ادوار میں تو انسان اتنا پسماندہ تھا کہ اپنی تاریخ لکھنے اور محفوظ کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی وضاحت اسلام کے بعد تاریخ میں دکھائی دیتی ہے اسلام سے پہلے یہ اتنی ہی تاریک اور مبہم ہو جاتی ہے۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بشر اس حد تک ضرور پہنچ گیا تھا کہ اسے جو کتاب دی جائے اس کی حفاظت کر سکے' اپنی تاریخ کو قلم بند کر سکے۔ اسی لیے قرآن کریم نازل ہوا تو پہلی صدی ہجری میں اس کی حفاظت کے لیے عربی زبان کے اصول و قواعد وضع کیے گئے۔ علم لغت' صرف و نحو' معانی' بیان' بدیع اور علم قرائت وجود میں آیا۔ علم حدیث' تفسیر' فقہ اور علم کلام نے جنم لیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے اور مسلمانوں کو احادیث پر غور و فکر کرنے اور انہیں لکھنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہند و یونان کے تمام علوم و فنون کو زندہ کیا اور انہیں شایان شان ترقی دی اور اپنے سے پہلے زمانہ کو زمانۂ جاہلیت کے نام سے یاد کیا۔

اس لیے کہ جس نبی کے پیغام پر وہ ایمان لے آئے تھے وہ انہیں فطرت کے راز کائنات کے حقائق اور زمین و آسمان کے خالق سے آشنا کرنے آیا تھا اور اسے وحی ہونے والی پہلی آیات ہی میں قرائت کا حکم دیا گیا تھا اور تعلیم و تعلم کی بات کی گئی تھی۔

اجتہاد

انسان اب تمدن اور ارتقاء کی ایک نئی منزل میں قدم رکھ چکا تھا۔ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی میراث کی حفاظت کر سکتا تھا اور اس میں غور و فکر، تدبر و تفکر اور تحقیق و تدقیق کر سکتا تھا۔ وہ کلیات کو جزئیات سے تطبیق کرنے اور جزوی احکام کا استقراء کر کے ان سے کلیات وضع کرنے کے قابل ہو گیا تھا لہٰذا پروردگار عالم نے خاتم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج کر اسے قرآن و سنت کی عظیم نعمت سے نوازا اور تشریع کی جگہ اجتہاد نے لے لی۔ پس اجتہاد اسلام میں ایک زندہ حقیقت کا نام ہے۔ اجتہاد کے معنی قانون سازی کے ہیں۔ دنیا کے قانون ساز اداروں میں قانون بنایا جاتا ہے جبکہ مذہب کے اس قانون ساز ادارے میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کو استخراج کیا جاتا ہے۔ اجتہاد یہ ہے کہ قرآن، سنت، عقل اور اجماع کو مدرک اور ماخذ قرار دے کر بنیادی اصول اور کلی قواعد وضع کیے جائیں اور جزوی مسائل اور فروعی احکامات کو ان کلیات کی طرف پلٹا کر ان سے اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا حکم استنباط کیا جائے۔ قرآن مجید جس طرح لوگوں کی ہدایت و رشادت کے لیے ایسے گروہ کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے جو نیکی کا حکم دے برائیوں سے روکے اللہ کے احکامات کی یاددہانی کرائے وہاں اس قانون ساز ادارے کے وجود کو بھی لازم سمجھتا ہے۔ سورہ توبہ (۱۲۲) میں قرآن کریم اسلامی معاشرے کے لیے ایسے گروہ کی موجودگی کو ضروری قرار دیتا ہے جو دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کرے۔ یہ گروہ بہت سے احکامات سے مستثنیٰ ہے من جملہ اس پر سے جہاد کا حکم بھی ساقط ہے۔ اسی طرح قرآن (نساء۔ ۸۳) مشکل و جدید مسائل میں اجتہاد و استنباط کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور ایسے لوگوں کے وجود کو اللہ تعالیٰ کی فضل و رحمت کا جزو قرار دیتا ہے۔ شیعوں میں ایک رجعت پسند گروہ اخباریوں کے نام سے رہا ہے لیکن اکثریت اجتہاد کی قائل رہی ہے اور یوں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ سے کھلا رہا ہے اور لازم قرار دے دیا گیا کہ ہر مسلمان یا خود مجتہد ہو یعنی شریعت کے احکام کو استنباط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو یا کسی زندہ مجتہد اعلم (The most learned) کے فتوؤں پر عمل کر لے ورنہ احتیاط کے مسلک پر عمل کرے۔ لیکن اہلسنت کی اکثریت نے اسے قدرے محدود کر دیا۔ فقہائے اربعہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی آمد کے بعد اہلسنت چار فقہی مذاہب میں تقسیم

ہو گئے اور انہوں نے ان آئمہ کے فتاویٰ کو سند کا درجہ دیتے ہوئے ان کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنے وقت کے مشہور و معروف اور ماہر فقیہ تھے۔ ان میں سے امام ابو حنیفہ نے کچھ عرصہ امام جعفر صادقؑ کے درس میں شرکت کی تھی جو خاندان رسالت کے نمایاں فرد تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فقہاء بھی انسان تھے۔ ان سے بھی غلطی ہو سکتی تھی اور اگر غلطی نہ بھی ہو تو اس سے تو بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہزار سال بعد کی ضرورتوں اور تقاضوں سے قطعاً لاعلم تھے۔ اسی لیے خود ان آئمہ کی جو آراء نقل کی گئی ہیں ان میں وہ اپنے فتاویٰ میں غلطی کے امکان کو روا سمجھتے ہیں اور سند اور حجت کا درجہ صرف قرآن و سنت کو دیتے ہیں اس لیے کہ وہ خود اجتہاد کے فلسفہ اور اس کے معنی کو بہتر سمجھتے تھے۔ علماء اور فقہائے وقت کو چاہیے تھا کہ قرآن و سنت کے ساتھ گزشتہ فقہاء کے استنباطات سے استفادہ کرتے اور ان آئمہ کے استنباط کو اولیت دیتے پھر ان پر بحث و تبادلہ خیال کرتے اور وقت و زمانہ کی ضروریات کے ساتھ احکام الٰہی کو تطبیق دیتے۔ یوں وہ فکری جمود سے بھی بچ سکتے تھے اور مسلمانوں کو وقت کے ساتھ حرکت کرنے یا اس سے آگے رہنے پر مائل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے تنگ نظری سے کام لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان وقت اور زمانہ کے لحاظ سے پیچھے رہ گئے۔ علم فقہ پہلی اور دوسری صدی ہجری سے باہر نہ نکل سکا۔ اسلام کے بہت سے دانشوروں نے جب اس خلا کا احساس کیا تو اجتہاد کے وجود کو لازم اور ضروری قرار دیا اور اسے بند کرنے کی شدید مخالفت کی۔ ان دانشوروں میں امام غزالی' سید جمال الدین' علامہ مودودی' علامہ اقبال' جسٹس امیر علی اور سر سید احمد خان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اجتہاد قرآن و سنت کی مخالفت کا نام نہیں تا کہ اگر کوئی قرآنی نصوص کی مخالفت بھی کرے اور جرم کا مرتکب بھی ہو تو اسے اس کا ذاتی اجتہاد قرار دیا جائے بلکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قرآن و سنت اور عقل واجماع کی روشنی میں وضع کردہ اصول و قواعد کے توسط سے اللہ کے حکم کے سمجھنے اور نکالنے کا نام ہے۔ اب جبکہ قرآن نے انسان کو قرآن و سنت اور عقل و اجماع کی روشنی میں اجتہاد کی اجازت دے دی اور ہر اس اقدام' فیصلہ' فتوے اور حکم سے روک لیا جس کا منشاء جہالت ولا علمی ہو۔ لاتقف مالیس لك به علم (اسراء۔۳۶) "اس چیز کی پیروی نہ کرو جس کے بارے میں تمہیں علم نہ ہو" تو جیسے جیسے انسانی علم اور عقل ترقی کرتی جائے گی اس کے فہم و فراست اور شعور میں اضافہ ہوتا رہے گا ویسے ویسے اجتہاد ترقی کرتا جائے گا اور فقہاء زیادہ مہارت سے اللہ کے احکام کو استنباط کریں گے۔ یوں مذہبی احکامات وقت کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کر سکیں گے اور جہاں علم و دانش اور عقل کا دین و مذہب کے ساتھ یہ پیوند بر قرار ہو گا وہاں نسخ کا تصور بھی

نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ اس پر موقوف ہے کہ قرآن کریم اور سنت ایک زندۂ جاوید اور ختم نہ ہونے والی حقیقت ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم قرآن و سنت کے ایک ابدی حقیقت ہونے کی جانب بھی اشارہ کریں۔

قرآن کریم

قرآن مجید آخری آسمانی کتاب ہے جس کی کچھ خصوصیات کی جانب شروع میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ کتاب جو تمام آسمانی کتابوں پر بالادستی رکھتی ہے اور تحریف سے مصون و محفوظ ہے' اس کتاب کے جاوداں ہونے کا راز اس میں مضمر ہے کہ اس کے مخاطب کسی خاص زمانہ یا خطہ یا مذہب و مسلک کے لوگ نہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہوں بلکہ یہ کتاب پوری انسانیت سے مخاطب ہوتی ہے۔ اور جو پیغمبر اس کتاب کو لائے ہیں ان کی رسالت بھی پوری انسانیت پر محیط ہے۔ وما ارسلناك الا كافة للناس بشيراً و نذيراً (سبا۔ ۲۸) اور ہم نے تمہیں پوری انسانیت کے لیے بشارت دینے والا اور عذاب الٰہی سے ڈرنے والا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ واوحی الی ھذا القرآن لا نذرکم به و من بلغ۔ (انعام۔۱۹)" اور یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ تمہیں اور ہر اس شخص کو ڈراؤں جس تک یہ پیغام پہنچ جائے۔" اسی طرح قرآن کریم کی تعلیمات زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ قرآن صرف چودہ سو سال پرانے بتوں کو توڑنے نہ آیا تھا بلکہ اگر آج بھی انسان اللہ کے سوا کسی مخلوق کے سامنے جھک جائے یا کسی بھی چیز کو اس کا شریک ٹھہرائے تو وہ بھی بت پرستی ہے۔ اگر آج کی قومیں بھی مغرب کے سامنے زانو خم کرنے لگیں اور کائنات کے بہت سے امور کی تدبیر میں مغرب یا امریکہ کو مشیت الٰہی سے بے نیاز سمجھنے لگیں تو قرآن کی نظر میں یہ بھی لات و منات ہے۔ قرآن کریم کی یہ تعلیم اور یہ انسانی اصول ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے کہ "ولا يتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله (آل عمران۔ ۶۴) ایسا نہ ہو کہ ہم میں سے کچھ لوگ اللہ کے سوا کچھ دوسروں کے مالک اور مختار کل بن بیٹھیں۔ ایسا نہ ہو کہ آج کے دور کے یہ ظالم وڈیرے' جاگیردار اور چودھری فرعون بن کر اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ اور غلام بنا لیں۔ پس قرآن مساوات اور آزادی کا پیغام لے کر آیا ہے اور ظلم و ستم کا مخالف ہے۔ لہٰذا جتنا انسان ترقی کرتا جائے گا اور روشن فکر بنتا جائے گا وہ ان تعلیمات کی حقانیت اور عظمت کو اتنا ہی سلام کرے گا" ان الله يامر بالعدل والاحسان وايتاءِ ذی القربىٰ وينهىٰ عن الفحشاء والمنكر والبغی "۔ (نحل۔ ۹۰) بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں انصاف' اچھے کاموں اور قرابتداروں پر عطا و بخشش کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحاشی (و بے حیائی) برے کاموں اور ظلم سے روکتا اور منع

فرماتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور تین چیزوں سے ہمیشہ ممانعت کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور اسی پر تمدن اور معاشرے کی فلاح اور ترقی وسعادت کا دار ومدار ہے۔ تمدن (Civilization) کے یہ بنیادی اصول قرآن تعلیم دیتا ہے اور جو قوم بھی ان پر عمل پیرا ہو گی عزت وسربلندی اور کامیابی وسعادت اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ بشارت اہل کتاب کو پہلے ہی دے دی گئی تھی کہ جو نبی شریعت لے کر آئے گا وہ پاک وپاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے جائز قرار دے گا اور فطرت کے خلاف پلید اور گندی چیزوں کو جو انسانی فطرت کے خلاف ہوں ان کے لیے ناجائز ٹھہرائے گا۔ یحلّ لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث۔ (اعراف۔ ۱۵۷)

اگر قرآن کریم شراب اور دوسری مست کرنے والی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے تو زمانہ کتنی بھی ترقی کر جائے یہ منحوس چیز انسانیت کے حق میں ہرگز مفید اور نفع بخش ثابت نہ ہو گی۔ اگر اسلام سؤر اور درندوں کے گوشت کو حرام ٹھہراتا ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مضرات تو ضرور واضح ہو سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان کے نقصانات ختم ہو جائیں اور جو انہیں استعمال کرنے لگے اس کی روح میں درندگی رسوخ نہ کرے!

اگر قرآن بیہودہ وبدحواس کرنے والی موسیقی سے جو انسان کے جذبات کو ابھارے' ممانعت عمل میں لاتا ہے تو زمان ومکان اس حکم میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا۔

اسلام سے عناد رکھنے والے بہت غور وفکر کے بعد ایک غلاموں کے قانون کو سامنے لاتے ہیں جس سے متعلق احکام وضع کیے گئے تھے اور وہ منسوخ ہو گئے۔ ان لوگوں کے لیے اتنا کہتے چلیں کہ اسلام ایسی تعلیمات اور ایسے قوانین ضرور وضع کرتا ہے جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزاد کر دیں' غلاموں اور آقاؤں کو ایک صف میں کھڑا کر دیں لیکن کفر افریقا کے آزاد انسانوں کے گلوں میں غلامی کا طوق ڈال دیتا ہے۔ مسلمان دانشوروں کو استقراء کرنا چاہیے کہ صرف پہلی صدی ہجری میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ سے متاثر ہو کر کتنے ہزار یا لاکھ غلام آزاد کیے گئے۔ اگر اسلام چاہتا تو اتنی قدرت رکھتا تھا کہ پوری انسانیت کو اپنا غلام بنا لیتا لیکن اسلام انسان کو غلامی سے نکالنے آیا تھا جس طرح حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکالنے آئے تھے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں کتاب العتق یا آزادی کی کتاب تو ملتی ہے لیکن کتاب الرق یعنی غلامی کا کوئی باب نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنی تعلیمات کے سائے میں غلامی کے موضوع ہی کو ختم کر دیا لیکن احکام اپنی جگہ باقی ہیں اور جب بھی اس سرکش انسان نے انسانیت کو اپنا غلام بنایا یہ احکام نافذ العمل ہو جائیں گے پس غلاموں سے متعلق بھی اسلام کے احکام منسوخ نہیں ہوئے۔ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے ایسے معاملے یا خرید و فروخت سے منع کیا جس میں قیمت خرید اور خریدنے والی چیز کی نوعیت معین نہ ہو اور نقصان اور دھوکہ بازی کا اندیشہ ہو تو یہ قانون آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی اپنی قوت پر باقی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "لاضرر ولا ضرار فی الاسلام" کا قاعدہ وضع کیا اور بتلا دیا کہ اسلام نہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کی اجازت دیتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا عائد کردہ خسارہ برداشت کرنے کو صحیح سمجھتا ہے۔ پس جس نے جو کیا ہے اس کی تلافی کرے تو یہ قانون علم و دانش اور اقتصاد و معیشت کی ترقی کے باوجود انسانیت کے لیے رہنما اصول ہے اور اس سے فقہاء نے بے انتہا استفادے کیے ہیں جو ابھی تک جاری ہیں۔ پس قرآن و سنت کیونکہ اسی طرح کے تبدیل نہ ہونے والے اصولوں پر مشتمل ہے لہٰذا یہ اصول تا ابد قائم رہیں گے۔ قرآن کریم کے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ یہ قوموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون کو بیان کرتا ہے۔ انہی قوانین میں سے ایک یہ قانون ہے:

ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا مابانفسھم (رعد۔ ۱۱)

اس آیۂ کریمہ سے ملتی جلتی آیت جس میں اس قانون کا سبب بھی بیان کیا گیا ہے سورۂ انفال (آیت۔ ۵۳) میں ہے۔ اس کے صحیح اور دقیق معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم کسی قوم سے اس وقت تک اپنی نعمتوں کو نہیں چھینتا جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، اطاعت اور شکر کی حالت میں باقی رہتی ہے اور اس کا اخلاق فاسد نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کا اخلاق فاسد ہو جاتا ہے وہ گناہ، بے راہ روی اور بے حیائی پر اتر آتی ہے، اس کے بازاروں اور لین دین میں دھوکہ بازی اور بے ایمانی بڑھ جاتی ہے تو پروردگار اس سے نعمتیں چھین لیتا ہے اور رحمتوں کی جگہ عذاب لے لیتا ہے۔ قوموں کی زندگیاں فلسفۂ تاریخ و تمدن اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان اس اٹل قانون پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ اسی اٹل قانون کو سورۂ اعراف۔ ۹۶ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"ولو ان اھل القری آمنوا و اتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا"

اگر بستی والے ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم آسمان و زمین کی برکتیں ان کے لیے کھول دیں گے لیکن انہوں نے (ہمارے پیغامات کو) جھٹلایا۔ مغرب میں اتنے عظیم ارتقاء کے باوجود اگرچہ کچھ اخلاقی اور انسانی اقدار ہیں لیکن مجموعاً ایمان کی کمی اور شرم و حیاء اور عفت و پاکدامنی کا فقدان ہے اس لیے مغرب کی بہت سی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور آپس کی کش مکش یا دوسری قوموں کو غلام بنانے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ نتیجتاً مغرب خدا کی برکتوں سے دور ہے۔ اسی طرح مشرق میں بھی حقیقی ایمان کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ تقویٰ کا بھی فقدان ہے کیونکہ اگر

ان میں تقویٰ ہوتا تو وہ اپنی پسماندگی اور ناخواندگی کا حل تجویز کرتے' اپنی سستی و کاہلی کا علاج کرتے اور فحاشی و عریانی اور فرقہ گرائی کو مہار کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو علم و حکمت کو زندہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور آسمان و زمین کی برکتیں ان کے لیے کھل جاتیں جیسا کہ یہ کام صدر اسلام کے مسلمانوں نے کر دکھایا تھا۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام ایک زندہ اور باقی رہنے والی حقیقت کا نام ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے انسان میں عقل و شعور بڑھ رہا ہے وہ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا پیغام پڑھے لکھے معاشروں کو زیادہ متاثر کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف مارکس ازم اسی دور کی پیداوار تھا لیکن ایک صدی سے زیادہ باقی نہ رہ سکا۔ اسی طرح دنیا کے دوسرے ادیان اور مکاتب فکر بھی ایک ایک کر کے مارکس ازم کی طرح عجائب خانہ کی زینت بنتے چلے جائیں گے اور آخر کار صرف اسلام کی حقانیت اور سچائی باقی رہ جائے گی۔

ایک شبہہ

کچھ سطحی نگاہ رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین تو قرار دیتا ہے لیکن ختم المرسلین نہیں قرار دیتا۔ لہٰذا یہ صحیح ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن عین ممکن ہے کہ ان کے بعد کوئی رسول بھیج دیا جائے۔ جس حد تک ہم اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں اس کے بعد اس اعتراض یا اس مفروضہ کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن پھر بھی ہم اس کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے نبی اور رسول کے فرق کو واضح کرنا لازم ہے۔

رسول اور نبی کا فرق

نبی اسے کہتے ہیں جس پر وحی ہوتی ہو۔ وہ اسی وحی کے ذریعہ سے لوگوں کو سعادت و ہدایت کے راستہ پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے' ان کے عقیدے کی اصلاح کرتا ہے اور انہیں تہذیب نفس کی دعوت دیتا ہے۔ رسول ان تمام کاموں کے علاوہ ایک خاص پیغام یا خاص ماموریت (Assignment) لے کر آتا ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کو فرعون کی قید سے نکالنا۔ سورۂ نساء۔ ۶۴' سورۂ نحل۔ ۱۵ اور سورۂ النساء۔ ۱۶۴ ان تمام آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول کی اطاعت لوگوں پر فرض ہوتی ہے اور رسول لوگوں پر حجت تمام کرتا ہے اور اگر لوگ پھر بھی اس کی مخالفت و نافرمانی کرتے ہیں تو ان پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ پس ہر رسول نبی ضرور ہوتا ہے تاکہ اپنی رسالت کو تکمیل تک پہنچا سکے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوا کرتا۔ اسی لیے

قرآن کریم حضرت موسیٰ یا پیغمبر اکرم یا دوسرے انبیاء کو نبی بھی کہتا ہے اور رسول کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔ پس اگر سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مہر نبوت قرار دیا اور ان کے بعد وحی کا سلسلہ بند ہو گیا تو آنحضور، ختم المرسلین بھی ہیں یعنی آپؐ کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا اس لیے کہ جب نبوت ہی کی جگہ باقی نہیں رہی تو رسالت کہاں رہے گی جو نبوت کے علاوہ بھی بہت سی ذمہ داریوں اور فرائض کی حامل ہوا کرتی ہے اور جب وحی کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو پھر کہاں کی رسالت اور کہاں کی نبوت!!

پس اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرتؐ خاتم النبیین اور ختم المرسلین ہیں تو اب اگر کوئی اس دین مبین میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے اور یہ کہے کہ وہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی نبی مانتا ہے اور غلام احمد قادیان کے بھی تمام دعووں کو قبول کرتا ہے(۱) تو وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہے۔ اسلام کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ اس دین و آئین کو قبول کرے۔ "لا اکراہ فی الدین قدتبین الرشدمن الغی۔" (بقرہ۔۲۵۶) دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں اس لیے کہ ہدایت کا راستہ گمراہی کے راستہ سے الگ ہو گیا ہے۔ اسلام اپنی سچائی اور حقانیت پر یقین رکھتا ہے اس لیے کسی کو زبردستی اپنا پیروکار نہیں بنانا چاہتا لیکن کسی کو اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ وہ اس کی تعلیمات، اس کے عقائد میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ اسلام اپنی تعلیمات کو بدعتوں اور تحریفوں سے بچانے کا طرفدار ہے تاکہ یہ قیامت تک کے لیے انسانیت کا ہادی و رہنما بنا رہے۔ اس نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس دین نے آخر تک رہنا ہے اگر کوئی اس میں بدعت یا تحریف پھیلانے کی کوشش کرے اور اس کی مرکزیت میں ردوبدل کرنے کی سعی کرے تو وہ مجرم اور مرتد ہے اور اگر اس شخص کو جس نے اس کی حقانیت کو پہچان لینے کے بعد اس میں یہ رخنہ ڈالا' اگر واجب القتل بھی قرار دے دیا جائے تو کم ہے اس لیے کہ آج بھی دنیا کا کوئی قانون اور دنیا کی کوئی عدالت کسی مذہب کے عقائد اور بنیادی تعلیمات سے کھیلنے (Blasphemy) کی اجازت نہیں دیتا۔ خصوصاً ایسا دین جسے قیامت تک رہنا ہے!

اب تک ہم نے عقلی اور نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ قرآن کریم اور سنت نبویؐ ایسے رہنما اصول و قوانین پر مشتمل ہیں جو ہمیشہ انسانیت کے لیے نفع بخش رہیں گے اور ہرگز منسوخ نہ ہوں گے۔ نیز یہ بھی کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین اور سردار انبیاء ہیں۔ اس کے علاوہ عصمت سے برخوردار' لغزشوں سے مبرا اور مثالی کردار کے حامل ہیں جس طرح کہ تمام انبیاء معصوم ہوا کرتے تھے۔ لیکن تاریخ و سیرت و حدیث میں کچھ ایسے واقعات

1-Encyclopedia of Islam, Vol.I pp.301-302

نقل کیے گئے ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت اور ان کے افضل البشر اور خاتم النبیین ہونے کے مخالف ہیں۔ لہٰذا ہم ان واقعات کا ایک ایک کر کے تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) خودکشی کا واقعہ

(۲) قصۂ غرانیق

(۳) سہو ونسیان

(۴) سحر کی حقیقت

(۵) بیماری کا غلبہ

(۶) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیارات

(۱) خودکشی کا واقعہ

علامہ شبلی نعمانی سیرت النبیؐ میں صحیح بخاری باب التعبیر سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ابتدائے بعثت میں جب پندرہ روز تک وحی رک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں۔ دفعتاً حضرت جبریل نظر آتے تھے اور کہتے تھے اے محمدؐ! تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو۔(۱) مذکورہ واقعہ کو سید امیر علی نے روح اسلام میں بھی نقل کیا ہے۔(۲) علامہ شبلی اس واقعہ کو صحیح ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ یہ روایت مرفوع ہے یعنی اس کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا۔ پس نقل معتبر نہیں ہے۔

ہماری نظر میں اگر بالفرض اس روایت کا نقل بھی معتبر ہوتا تب بھی یہ واقعہ حقیقت کے خلاف ہے اس کی تین وجوہات ہیں۔

(۱) اس واقعہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نبوت پر یقین نہ رکھتے تھے اور وحی نازل ہونے اور نبوت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد بھی یہ تلقین انہیں جبریل امین کرتے تھے۔

(۲) اس روایت میں خودکشی جیسے بدترین جرم کو جو انسانیت اور مذہب کے خلاف ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت دی گئی ہے۔

(۳) اس روایت میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت یا گناہوں سے

---

(۱) شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ جلد اول ص ۱۲۶۔

(۲) روح اسلام ترجمہ ہادی حسین ص ۹۵

اجتناب کو ایک جبری امر بتلایا گیا ہے یعنی جبریل امین انہیں روک لیتے تھے جیسا کہ بعثت سے قبل کے واقعات میں علامہ شبلی نے بھی اس طرح کی چیزیں ذکر کی ہیں جبکہ انبیاء کی عصمت ہر گز جبری نہ ہوتی تھی۔ قرآن مجید سورۂ مریم میں کہیں حضرت مریم کی شرم وحیا اور عفت و پاکدامنی اور عبادت کا تذکرہ کرتا ہے اور کبھی اپنے رسول کو حضرت ابراہیم کی اس جدوجہد کی یاد دلاتا ہے جو انہوں نے بت پرستی کے خلاف کی تھی۔ اسی طرح کبھی حضرت اسماعیل کے صادق الوعد ہونے کی جانب پیغمبر اکرمؐ کی توجہ مائل کرتا ہے اور کبھی حضرت موسیٰ کے خلوص وصداقت کی جانب اور اسی طرح اور بھی بہت سے انبیاء کی صداقت کی یاد لاتا ہے اور پھر فرماتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جن پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نازل ہوئیں۔ سورہ انعام آیت نمبر ۹۰ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "أولئك الذين هدى الله فبهدٰهم اقتده" یہ وہ لوگ تھے جنہیں خدا نے ہدایت کی پس تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔ سورہ زمر آیت نمبر۔ ۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے ؛ اور جسے خدا ہدایت کرتا ہے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ پس انبیاء کی ہدایت کا ثبوت فراہم کرنے والی سورۂ انعام کی یہ آیۂ کریمہ سورۂ زمر آیت نمبر ۳۶ کی روشنی میں انبیاء سے ہر گمراہی کو دور کرتی ہے اور ان کی عصمت ثابت کرتی ہے اس لئے کہ سورۂ یٰسین۔ آیت نمبر ۶۲ میں ہر گناہ کو گمراہی وضلال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے مجموعاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام عصمت سے برخوردار ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کی بھی عصمت جبری نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو خاتم النبیین کو ہدایت کے سرچشمہ کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا جس سے انبیاء برخوردار تھے۔ جس طرح ایک شیر دل اور شجاع انسان جان دے دیتا ہے لیکن بزدلی اور ذلت کو قبول نہیں کرتا اسی طرح انبیاء اخلاق، تہذیب نفس اور انسانی اقدار کے حوالہ سے کامل انسان ہوتے ہیں اور خود کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔

(۲) قصۂ غرانیق

اس واقعہ کو ہم علامہ سیوطی کی درمنثور اور شبلی کی سیرت النبیؐ سے نقل کر رہے ہیں۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ بعثت کے ابتدائی سال تھے۔ بت پرستی کا دور تھا اور بہت سے مسلمان کفار مکہ کے شکنجوں سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کر چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی۔ کفار بھی موجود تھے۔ جب آپؐ نے سورۂ نجم کی یہ آیت پڑھی "ومناة الثالثة الاخرى" تو شیطان نے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے "تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى" یعنی یہ بت معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔ اس کے

بعد آنحضرتؐ نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپؐ کی متابعت کی۔ جبریل امین نازل ہوئے اور انہوں نے کہا کہ وہ اس آیت کو نہیں لائے بلکہ یہ شیطان کی طرف سے ہے۔(۱)

اس واقعہ کے بارے میں سیرت النبیؐ شبلی نعمانی کی یہ عبارت قابل توجہ ہے:

"کبار محدثین نے مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری اور علامہ نووی نے اسے باطل اور موضوع لکھا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے۔ ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر شہرت رکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر کو کہ جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے اس روایت کی صحت پر اصرار ہے۔

تفسیر المیزان کے مصنف علامہ محمد حسین طباطبائی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ روایت پیغمبر اکرمؐ پر بدترین تہمت اور جہالت و نادانی کا الزام عائد کرتی ہے۔ اس لیے کہ جو جملہ شیطان نے القاء کیا تھا جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قرائت کیا اور انہیں یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے اور اسے جبریل امین نہیں لائے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (نعوذ باللہ) اس سے بھی غافل ہو گئے کہ یہ صاف کفر اور شرک ہے جس کا قبول کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے لیکن روایت کے مطابق وہ اسی حالت پر باقی رہے یہاں تک کہ انہوں نے سجدہ کیا۔ پھر جب جبریل امین نازل ہوئے تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ شیطان کا وسوسہ تھا۔ لہٰذا علامہ طباطبائی اس روایت کو جھوٹ اور گڑھے ہوئے افسانوں میں سے قرار دیتے ہیں۔ شیعوں کے یہاں یہ روایت مطلقاً نقل نہیں کی گئی اور وہ اصول مذہب اور اعتقادات میں خبر واحد کو حجت نہیں جانتے بلکہ صرف یقینی اور محکم دلائل پر اکتفا کرتے ہیں۔

بعض اہل فن کے مطابق اگرچہ اہلسنت کے ذرائع سے اس روایت کا نقل صحیح ہے لیکن جس اصول کا اظہار علامہ شبلی نعمانی نے مقدمۂ سیرت النبیؐ میں کیا ہے وہ یہ ہے کہ صرف روایت کا صحیح ہونا کافی نہیں بلکہ اسے قرآن کریم کے مخالف نہیں ہونا چاہیے۔ جو اصول قرآن مجید بیان کرتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ شیطان اللہ کے مخلص اور نیک بندوں پر کسی قسم کا تسلط نہیں رکھتا۔ "ان عبادی لیس لک علیهم سلطان۔" (اسراء۔ ۶۵) یقیناً تو میرے (مخلص اور نیک) بندوں پر کسی طرح کا تسلط و نفوذ نہیں رکھتا۔ پس جب شیطان کا زور اللہ کے مخلص بندوں پر اور انبیاء پر نہیں چلتا تو خاتم النبیین پر کیسے چل سکتا ہے!

اسلام کے قوانین کے مطابق اگر کوئی اسلام کی حقانیت کو پہچان لینے اور اس مذہب حق پر

---

(۱) شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ جلد اول ص ۱۴۶ و علامہ سیوطی در منثور۔ سورۂ نجم

ایمان لانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے بھی باطل سے سمجھوتہ کرے یعنی وہ دل سے اللہ تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک ہونے کا انکار کر کے بت مت کو قبول کر لے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی نظر میں کوئی گناہ بھی اللہ کا شریک ٹھہرانے سے بڑھ کر نہیں۔ لئن اشرکت لیحبطن عملك۔ (زمر۔ ۶۵) اگر (اے پیغمبرؐ) تم نے بھی شرک کیا تو تمہارے اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے۔

اس آیۂ کریمہ سے ہر گز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ خاکم بدہن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس گناہ میں مبتلا ہوئے تھے بلکہ مقصود اس امر کو واضح کرنا ہے کہ اے نبی یہ گناہ ہماری نظر میں اتنا سنگین ہے کہ اگر بالفرض محال آپؐ جیسے باعظمت نبی بھی اس میں مبتلا ہوئے تو آپؐ بھی ہماری نظروں سے گر جائیں گے۔ نیز جن آیات کے ذیل میں یہ واقعہ گڑھا گیا ہے وہ صراحت سے اس قسم کے ہر بیہودہ امکان کو مسترد کرتی ہے۔ جہاں رحمٰن ہو اور جبریل امین جیسے فرشتے اللہ کی آیت کو نازل کر رہے ہوں وہاں شیطان پر نہیں مار سکتا۔

"والنجم اذا ھوی۔ ماضل صاحبکم وماغویٰ ۔ وماینطق عن الھویٰ۔ ان ھوالاوحی یوحیٰ ۔ علمه شدید القویٰ۔" (سورۂ نجم۔ ۵۔۱)

"ستارے کی قسم جب وہ گر جائے۔ تمہارا صاحب (رسول) نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ ہی بھٹکا ہے۔ وہ اپنی ہوا و ہوس سے کچھ نہیں بولتا۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر جو ہم نے وحی کیا ہے۔ اسے بہت زبردست اور توانا (فرشتہ یعنی جبریل امین) نے تعلیم دی ہے۔"

پس ان آیات میں نہ صرف وحی الٰہی میں کسی قسم کی غلطی کے امکان کو مسترد کر دیا گیا ہے بلکہ پیغمبر اکرمؐ کی ہر گفتار کو وحی الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ تاہم جس کا لفظ بھی وحی ہو وہ قرآن ہے اور باقی وحی بالمعنی ہے۔ اس حقیقت میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا شبہ یا اختلاف نہیں۔ مذکورہ واقعہ میں نقل کیا گیا تھا کہ شیطان نے جو کلمات القا کیے اور پیغمبر اسے رحمٰن کی آیت سمجھے یہ امر ان کے بھٹکنے کی خبر دیتا ہے لیکن ان آیات میں سختی سے اس کی تردید کر دی گئی اور بتا دیا گیا کہ ہمارا نبی نہ بھٹکتا ہے اور نہ گمراہ ہوتا ہے کہ بے جان بتوں کی شفاعت قبول کر لے اور شرک سے مصالحت کر لے اس لیے کہ یہ تو ابراہیم بت شکن کی ملت کی پیروی کرنے آیا ہے جو ہر گز مشرک نہ تھے۔ پس اس واقعہ کے بارے میں جو توجیہات کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سورۂ نجم کی آیات کی تلاوت کر رہے تھے تو کسی نے بتوں کی عظمت کے بارے میں مذکور جملہ بلند آواز سے کہا اور اسے آنحضورؐ سے نسبت دے کر قریش میں مشہور کر دیا۔ آنحضرتؐ کو جب اس کا علم ہوا تو آپؐ نے اس کی تردید کر دی۔

جسٹس امیر علی نے بھی اس واقعہ پر خوب حاشیے لگائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مستشرقین کے بقول یہ قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ سے مصالحت کے لیے کیا تھا اور کوئی مقام تعجب نہیں اگر اپنے متعصب دشمنوں کے حق میں تھوڑی سی رعایت کر کے کشمکش کو ختم کرنے کا خیال لمحہ بھر کے لیے آپ کے دل میں آیا ہو۔ اپنی تحقیق کرنے کے بعد جس طرح وہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں وہ اسے مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ روح اسلام میں ان کی یہ عبارت موجود ہے:

"آپؐ نے قرآن کی ایک آیت تلاوت کی جس میں آپؐ نے ان تین چاند دیویوں کا تذکرہ احترام سے کیا اور اس کا اقرار کیا کہ ان سے عنداللہ شفاعت کی اُمید کی جاسکتی ہے پس خدا کے آگے جھک جاؤ اور اس کی بندگی کرو۔ سارا مجمع اس مصالحت سے خوش ہو کر محمدؐ کے خدا کے حضور سجدہ میں گر گیا۔ سارے شہر نے اس دوگونہ مذہب کو قبول کر لیا۔ لیکن صحرا کا یہ رؤیا دیکھنے والا ایسا شخص نہ تھا کہ ایک جھوٹی بات پر توقف کرتا۔(۱)

اس عبارت سے واضح طور پر یہ تاثر ملتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جان بوجھ کر مصالحت کی غرض سے شیطانی آیات کو قرآنی آیت بنا کر پیش کیا لیکن بعد میں اسے مسترد کر دیا۔ اس لیے کہ وہ جھوٹ تو بول سکتے تھے لیکن جھوٹ پر توقف نہ کر سکتے تھے۔ اسی لئے امیر علی صاحب بعد میں صراحت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے بعد میں اعتراف کیا کہ ان سے غلطی ہو گئی ہے۔ حاشا! وکلاّ !!! اسلام کی ترجمانی کرنے والے یہ دانشور کبھی کبھی ایسی باتوں کو باور کر لیتے ہیں جسے عام انسانی عقل بھی مسترد کر دیتی ہے۔ جس پیغمبرؐ نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہ بولا تھا اور پورا مکہ جس کی صداقت کی گواہی دیتا تھا وہ ایک وقتی مصلحت کے لیے کیسے جھوٹ بول سکتا تھا!

جب قریش کے مصلحت پسند اس کے پاس آئے تھے اور انہوں نے تقاضا کیا تھا کہ ان کے بتوں کو برا نہ کہا جائے تو اس نبی نے ابتداء ہی میں جبکہ حضرت ابو طالب کے سوا کوئی اس کی حمایت کرنے والا نہ تھا یہ کہا تھا کہ اگر اس کے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیا جائے تب بھی وہ اپنے مشن کی حقانیت اور بتوں کی مذمت سے باز نہ آئے گا۔ لہٰذا اب جبکہ حق کے پرستار بڑھ گئے تھے وہ کیسے اس غلطی کا مرتکب ہو سکتا تھا؟! امیر علی صاحب خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو یہ احساس تھا کہ کفر و شرک کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت و مصلحت آپؐ کے کیے کرائے کام کو یکسر تباہ کر دے گی اور آپؐ نے اہل طائف سے بھی

(۱) روح اسلام، ترجمہ ہادی حسین ص ۱۱۷-۱۱۵

اس مسئلہ میں کسی قسم کی نرمی نہ دکھائی اور انہیں بت پرستی کی مہلت نہ دی۔ انہیں یہ بھی اعتراف ہے کہ مغربی سوانح نگاروں نے سرور کائناتؐ کی اس لغزش پر بڑی شماتت آمیز خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن وہ اس نکتہ کو سمجھنے سے غافل رہے کہ اس ضمن میں اگر اس واقعہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مغرب کی شماتت بجا ہے اس لیے کہ اہل کتاب ہونے کے ناتے وہ کم از کم اس حقیقت سے ضرور واقف ہیں کہ جو نبی بھی حق کا پیغام لے کر آتا ہے باطل سے سمجھوتہ نہیں کرتا وہ بت پرستی اور کفر کو قبول نہیں کرتا جیسا کہ اللہ کے کسی نبی نے ایسا نہیں کیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس واقعہ کو بنیاد بنا کر آنحضرتؐ پر یہ جھوٹ باندھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معمولاً اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ مستشرقین کو اندازہ ہے کہ جس رسولؐ کی پوری زندگی بت شکنی میں گزری ہو وہ ہرگز باطل سے سمجھوتہ نہیں کرتا لیکن انہوں نے مسلمان سیرت نگاروں اور دانشوروں کی کمزوری کو بنیاد بنا کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ خراب کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

مونٹگومری واٹ (Montgommery watt) "محمدؐ مکہ میں" لکھتا ہے:

The muslim scholars, not possesing the modern concept of gradual development,considered Muhammad from the very first to have been explicity aware of the full range of orthrodox dogma.

"مسلمان دانشور کیونکہ تدریجی ارتقاء کے مغربی نظریہ سے برخوردار نہیں ہیں اس لئے انہوں نے شروع سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رجعت پسند عقیدے کا مکمل طرفدار فرض کر لیا۔"

مغربی سوانح نگاروں کی ایک غلطی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام بھی مغرب جیسا ایک نظریہ تھا جسے مکہ میں موجود ایک شخص نے ایجاد کیا تھا۔ ہم متعدد دلائل اور حقائق کی روشنی میں اس روایت کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کر چکے ہیں۔ پس یہاں مفروضہ درکار نہیں بلکہ قصہ غرانیق ایک افسانہ ہے جو قرآنی نصوص، واقعیات اور حقائق کے مخالف ہے اور تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ سفید جھوٹ ہے۔ مذکورہ مستشرق اور مغربی سوانح نگاروں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ سورہ حج آیہ نمبر ۵۲ اس پر نازل ہوئی یا کم از کم اس واقعہ کی دلیل ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس آیہ کریمہ کے بارے ئے اور دیکھا جائے کہ کیا حقیقت وہی ہے جس کا ان مغربی دانشوروں

نے دعویٰ کیا ہے......؟

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنّی القی الشیطان فی اُمینته فینسخ الله مایلقی الشیطان ثم یحکم الله آیا ته و الله علیم حکیم (حج۔۵۲)

"اور ہم نے تم سے پہلے کسی رسول یا نبی کو نہیں بھیجا مگر جب اس نے قرائت کی تو شیطان نے اس کی قرائت میں (رخنہ) کیا۔ پس پروردگار عالم نے شیطان کی القا کردہ چیز کو منسوخ کیا ہے اور اپنی آیات کو مستحکم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا دانا اور بڑی حکمت والا ہے۔"

مغربی دانشوروں کی جانب سے کیے گئے اس دعویٰ کی حقانیت کو تولنے کے لیے ہمیں عربی زبان اور لغت کا جائزہ لینا پڑے گا اس لیے کہ معنی صحیح نہیں کیے گئے۔ عربی زبان میں لفظ تمنی منیٰ سے لیا گیا ہے جس کے اصلی معنی ناپ تول اور وزن کے ہیں اور اسی سے تقدیر کے معنی اخذ کیے گئے ہیں پس منی یعنی آرزو ایسی آرزو جو پوری نہ ہو تمنی الحدیث حدیث گھڑنے کے معنی میں آیا ہے اور اگر اس کے ساتھ کتاب کا لفظ استعمال ہو تب قرائت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن مجازاً آیۂ شریفہ میں کیونکہ کتاب کا لفظ استعمال نہیں ہوا پس کوئی دلیل نہیں کہ تمنی سے قرائت کے معنی مراد لیے جائیں جبکہ اس کے حقیقی معنی آرزو کے ہیں۔

صحیح معنی: اور ہم نے تم سے پہلے کسی نبی یا رسول کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب اس رسول نے (دعوت حق پھیلنے کی) آرزو کی تو شیطان نے اس نبی کی آرزو میں خلل ڈالا۔ (یعنی لوگوں کو اس نبی کی مخالفت اور دشمنی کی ترغیب دی)۔ اس کے بعد پروردگار عالم نے شیطان کے کیے دھرے کا اثر مٹا دیا اور اپنی نشانیوں کو مستحکم کیا۔

دوسرا جواب: پس ہم نے ذکر کیا کہ اس آیہ کریمہ کے واضح اور ظاہری و حقیقی معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں اور جن لوگوں نے مختلف معنی کیے ہیں وہ کج فہمی کی نشانی ہے۔ لیکن اگر گذشتہ معنی بھی صحیح تسلیم کر لیے جائیں تو اس سے مغربی سوانح نگاروں کا مدعا ثابت نہیں ہوتا اس لیے کہ یہ آیۂ کریمہ گزشتہ انبیاء و مرسلین کے واقعات کی حکایت کر رہی ہے جبکہ قصۂ غرانیق پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں جعل کیا گیا ہے۔ اگر اس سے بھی صرف نظر کر لیا جائے کہ یہ گزشتہ انبیاء کے حالات پر ناظر ہے تب بھی اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ نبی قرائت کرتا تھا تو شیطان اس کی قرائت میں وسوسہ کرتا تھا یعنی لوگوں کے ذہنوں میں اس کی قرائت سے متعلق وسوسے ڈالتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو نازل کر کے ان وسوسوں کا اثر مٹا دیتا تھا اور اپنی آیات کو محکم کرتا تھا۔ اور اس کا شاہد یہ ہے کہ اس کے بعد والی آیات (۵۳ / ۵۴) میں اس کا جو سبب بیان کیا گیا ہے یعنی شیطان کے القائات کا وہ یہ ہے کہ کفار اور حق کے دشمن جب ان وسوسوں کو

سنتے ہیں تو اپنی دشمنی کا کھلا اظہار کرنے لگتے ہیں اور حق سے مزید دور چلے جاتے ہیں اور اہل ایمان جب اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ شیطان کا وجود اور اسکے وسوسے ایک امتحان الٰہی ہے اور پروردگار شیطان کے کیے کو مٹادے گا تو وہ حق کے تابع ہو جاتے ہیں اور ان کی پیشانیاں جھک جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر آیہ نمبر ۵۲ کو قصۂ غرانیق پر منطبق کیا جائے تو بعد والی آیات کے معانی الٹ جائیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اہل ایمان کو معلوم ہو کہ خدائے احد کو سجدہ کرنے والے اور بتوں کی نفی کرنے والے رسول نے بتوں کو قبول کر لیا ہے اور ان سے مصالحت کر لی ہے تو یہ اہل ایمان کی شکست کے مترادف ہوگا حالانکہ آیۂ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے اسے اپنی کامیابی سمجھا۔ نیز جیسا کہ نقل کیا گیا ہے اس واقعہ سے کفار پیغمبر کے قریب آگئے جبکہ آیہ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ ہم نے ایسا کر کے کفار کا امتحان لیا اور انہوں نے اپنے عناد کا اظہار کر کے ثابت کر دیا کہ وہ حق سے ہمیشہ ہمیشہ دور رہیں گے۔

پس ان جوابات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مغربی سوانح نگاروں کا یہ دعویٰ کہ یہ آیۂ کریمہ قصۂ غرانیق سے متعلق ہے بالکل بے بنیاد، کمزور اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ آیۂ کریمہ کے ظاہری معنیٰ، اس کا سیاق و سباق اور دوسری آیات سے تعلق اس کی مکمل تردید کے لئے کافی ہے۔

(۳) سہو و نسیان

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کثرت سے ایسی روایات وارد ہوئی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سہو و نسیان بسا اوقات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عارض ہوتا تھا۔ یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوران نماز بھول چک ہو جاتی تھی۔ کتاب السہو کے ابواب میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر یا عصر کی نماز میں دو رکعت ادا کر کے بھول گئے اس پر ذوالشمالین نے ان سے کہا کہ اللہ کے نبیؐ آپ بھول گئے یا نماز قصر پڑھی۔ اس پر پیغمبرؐ نے باقی دو رکعتوں کو بھی ادا کیا۔ (۱)

ان روایات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوران نماز بھول گئے لیکن کچھ اصحاب کی توجہ دلانے سے انہیں یاد آیا۔ کچھ روایات میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلام کیا اور اس کے باوجود بھی باقی دو رکعتوں کو تمام کیا حالانکہ نماز میں عام گفتگو سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ کچھ علماء اور اہل فن کا کہنا یہ ہے کہ ذوالیدین یا ذوالشمالین جنگ بدر ہی میں شہید ہو گئے تھے لہٰذا ممکن نہیں کہ ابوہریرہ جو جنگ خیبر کے بعد

---

(۱) صحیح بخاری کتاب السہو (تفصیلی حوالے آخر میں ذکر کئے گئے ہیں)

۷ھ میں اسلام لائے ان سے روایت کر سکیں۔ تاہم جو لوگ ان روایات کو صحیح سمجھتے ہیں وہ ان کی یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ بھی بالآخر ایک انسان تھے اور ان سے بھول چک ہونا ایک فطری امر ہے جو ان کی عصمت کے خلاف نہیں۔ ایک اور توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ نماز اور سجدے میں سہو کے احکام کی تشریع اور تعلیم کی خاطر پروردگار عالم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سہو میں مبتلا کیا۔ لیکن ان لوگوں کو یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ پروردگار عالم اپنے حبیب کو سہو میں مبتلا کیے بغیر بھی سہو کے احکام تشریع کر سکتا تھا۔ بہر صورت دیکھنا یہ ہے کہ قرآن سہو و نسیان کے بارے میں کیا کچھ کہتا ہے۔ اور قرآن کریم سے اس ضمن میں کون سے حقائق سامنے آتے ہیں۔ یعنی کیا قرآن پیغمبر اکرمؐ سے سہو و نسیان کی نسبت دیتا ہے یا نہیں۔۔۔۔ ؟ کیا سہو یعنی بھول چک انبیاء کے مشن کے خلاف تو نہیں۔۔۔۔۔ ؟

اگر ہم اس مقدس کتاب میں سہو کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ قرآن اس کی شدید مذمت کرتا ہے اور اسے ایک نقص کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بسا اوقات سرکش اور نافرمان قوموں کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو بھول گئے یا خود خدا کو بھول گئے۔ البتہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ امت محمدیؐ پر جن چیزوں کو معاف کیا گیا ہے ان میں سے ایک بھول بھی ہے بشرطیکہ بھولنے والا قصوروار نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص غفلت یا کوتاہی کیے بغیر کسی ایسے مسئلہ میں مبتلا ہو جائے اور نماز پڑھنا بھول جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور وہ اس نماز کو قضا کر سکتا ہے۔ پس اگرچہ اللہ تعالیٰ اس کی پکڑ نہ کرے گا لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ یہ نقص نہیں یا اس پر دوسرے آثار بھی مرتب نہ ہوں گے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو کوئی نیک کام کرنا تھا اور وہ بھول جائے تو اگرچہ اسے سزا نہ دی جائے گی لیکن ثواب اور خود اس کے نفس میں جو کمال اس نیک کام کو کر کے حاصل ہوتا وہ بہر حال نہیں ہوگا۔

ہم قرآن مجید سے نسیان کے بارے میں چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

(۱) نسوا الله فنسیهم (توبہ۔۶۷)

وہ (منافقین) اللہ کو بھول گئے اور اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔

(۲) یحرفون الکلم من مواضعه ونسوا حظاً مما ذکروا به (مائدہ۔۱۳)

کلمات کو ان کی مقرر و متعین جگہوں سے تحریف کرتے ہیں اور اس فائدے اور نصیب کو بھول جاتے ہیں۔ جس کی انہیں یاددہانی کرائی گئی تھی۔

(۳) فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم هذا (سجدہ۔۱۴)

پس مزہ چکھو (دوزخ کے عذاب کا) اس لیے کہ تم اس دن کی ملاقات کو بھول چکے تھے۔

(۴) ولا تنس نصیبک من الدنیا (قصص۔ ۷۷)

تم دنیا میں موجود اپنے حصے کو نہ بھولو۔

ان آیات میں واضح ہے کہ قرآن کریم نسیان اور اہل نسیان کی مذمت کرتا ہے اور کفار و مشرکین کو اس صفت سے یاد کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو یا اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو یا قیامت کے دن کو بھول گئے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم یاد کو کمال قرار دیتا ہے اور خدا کی یاد اور اس کے ذکر کو عبادت کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جہاں تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے تو قرآن کریم میں ایک آیۂ کریمہ ہے (اعلیٰ۔ ۶) جو اس مسئلہ میں قرآن کے محکمات اور اٹل اصولوں میں سے ہے۔

سنقرئك فلا تنسى ٭ الا ما شاء الله (اعلى۔ ٦۔ ٥)

"(اے نبیؐ) ہم تم پر پڑھیں گے پھر تم نہ بھولو گے مگر جس میں خدا کی مشیت ہو"۔ اس آیۂ کریمہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے نبی کو یہ وعدہ دے رہا ہے کہ وہ انہیں ایسے اسباب و وسائل اور ایسے علم سے نواز دے گا کہ وہ ہرگز نہیں بھولیں گے۔ بعد میں جو استثناء کیا گیا ہے (الا ما شاء اللہ) "مگر جس چیز کو خدا چاہے۔" یہ بتانے کے لیے ہے کہ یہ نعمت عطا کرنے کے باوجود قادر مطلق اگر چاہے تو تمہیں سہو و نسیان میں مبتلا کرنے پر قادر ہے۔ اس لیے کہ یہ نعمت دینے والی ذات بھی وہ خود ہے۔ اگر استثناء کو اس کے علاوہ معنیٰ کیا جائے یعنی جب چاہے خدا بھلا دے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ پیغمبر اکرمؐ بھی بھول جاتے تھے تو ان میں اور دوسرے لوگوں میں اس مسئلہ میں کوئی خاص فرق نہ رہے گا اس لیے کہ عام لوگ بھی کبھی کبھار بھول جاتے ہیں۔ جبکہ آیۂ کریمہ نبیؐ پر اپنی اس نعمت کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ انہیں ایسی قرائت یا ایسے علم سے نوازا جائے گا کہ وہ ہرگز نہیں بھولیں گے۔ اس آیۂ شریفہ سے (جو خاص نبی اکرمؐ سے مخصوص ہے) یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز نہیں بھولتے تھے اس لیے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات تھیں۔

اگر ہم عقلی حوالہ سے بھی اس مسئلہ پر غور کریں تو دکھائی دے گا کہ بھول چک گناہ نہیں ہے اور انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا بشرطیکہ وہ اللہ کے حکم کو نہ بھولیں بلکہ عام امور کی بھول چک ہو لیکن یہ بنیادی طور پر فلسفۂ نبوت اور انبیاء کی بعثت کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم ایک ایسے رسول کو بھیجنا چاہتا تھا کہ جس کا قول و فعل حجت ہو۔ نہ صرف اس دور کے لوگوں کے لیے بلکہ قیامت تک کے لوگ اس کے قول و فعل کو سند کے طور پر استعمال کر سکیں جبکہ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ سہو و نسیان خاتم الانبیاء پر

عارض ہوتا تھا تو نہ ان کا قول حجت رہے گا نہ فعل اس لیے کہ کہاں سے یہ ثابت کیا جا سکے گا کہ یہ کام آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھولے سے نہیں کر لیا۔ یہ بات بھولے سے نہیں کہہ دی اور جن مسائل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یقین دہانی نقل نہ کی گئی ہو ان مسائل میں قول وفعل نبی سنت یا حجت وسند کا درجہ حاصل نہ کر سکے گا حالانکہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول اور فعل مطلقاً حجت ہے۔ ہم اس ضمن میں آگے چل کر مزید گفتگو کریں گے۔ اگر عام زندگی میں بھی دیکھا جائے تو بھول چک کو ایک قابل مذمت چیز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں مبتلا رہتے ہیں انہیں ناقص انسان کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک عام انسان بھی اگر ذہنی مشق کرے اور اپنے حافظہ پر کام کرے تو وہ اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ بھول چک تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ سائنس نے اس حقیقت کا انکشاف بھی کیا ہے کہ عام انسان اپنے ذہن اور اپنی یادداشت سے صرف تین یا چار فیصد استفادہ کرتا ہے اور سائنسدان اور مفکرین بہت زیادہ ہوا تو سات فیصد (۷%) پس جو انسان کامل ہو اور اپنے ذہن ودماغ اور اپنے حافظے کی صلاحیتوں سے سو فیصد استفادہ کرے تو کیسے اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ نسیان میں مبتلا ہو اور بھول جائے۔ اسی لیے جو لوگ اہم امور سنبھالتے ہیں ان کی بہ نسبت نسیان کی مذمت بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی ملک کا صدر یا وزیر اعظم کسی بین الاقوامی کانفرنس میں تقریر کرنے کا پابند کیا گیا ہو اور وہ یہ کہے کہ میں بھول گیا تو دنیا اسے کن نگاہوں سے دیکھے گی...... ؟!!! پس نسیان یا سہو کا پیغمبر اکرمؐ پر عارض ہونا ایک نقص ہے جو قرآن کریم کی نص اور فلسفہ بعثت ونبوت کے خلاف ہے اور عقل بھی اسے تسلیم نہیں کرتی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر قرآن کریم میں بعض موارد میں نسیان یعنی بھول کو پیغمبر اکرمؐ سے کیوں نسبت دی گئی ہے۔ اگر ہم اس سوال کا جواب دینا چاہیں تو ان آیات کا جائزہ لینا پڑے گا۔ بظاہر صرف دو آیات ایسی ہیں جن سے یہ تاثر مل سکتا ہے:

(الف) "اے رسولؐ" اگر تم کچھ لوگوں کو ہماری آیات کا مضحکہ اڑاتے دیکھو تو ان سے دوری اختیار کرو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری چیز کی تضحیک کرنے لگیں اور اگر پھر بھی شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ہرگز ستمکاروں کے ساتھ نہ بیٹھنا۔ (انعام۔ ۶۸)

اس آیۂ کریمہ میں اگرچہ خطاب پیغمبر اکرمؐ سے ہے لیکن اس سے مراد عام مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کے لیے اسلام دشمن عناصر اور اللہ تعالیٰ کے احکام وآیات کی توہین وتضحیک کرنے والوں کے پاس بیٹھنا روا نہیں جب تک کہ وہ لوگ اللہ کی آیات کی توہین کر رہے ہوں اور جب وہ اس کام سے کسی دوسرے کام میں لگ جائیں تو ان کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔

لیکن اگر خداوند عالم کے اس حکم کو کوئی اہل ایمان بھول جائے تو اسے جیسے ہی یاد آئے وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہو۔ پس اس آیۂ شریفہ میں کیونکہ مراد مسلمان ہیں لہٰذا ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیطان جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھلانے کا سبب بنا اور یہ بات ہم مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں کہہ رہے ہیں:

(۱) شیطان نبی کے حافظہ پر ہرگز نفوذ نہیں رکھتا اور نبی اللہ تعالیٰ کا حکم ہرگز نہیں بھولتا۔

(۲) سورۂ اعلیٰ کی آیات جو کہ محکم آیات ہیں اور جن کا ذکر گزر چکا ہے' ان میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ "تم ہرگز نہیں بھولو گے۔"

(۳) آیۂ مورد بحث کے بعد والی آیت یعنی آیہ نمبر ۶۹۔ میں بتایا گیا ہے کہ اگر با تقویٰ مسلمان اس نیت سے اللہ کی آیات کا مضحکہ اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھ جائیں کہ انہیں راہ راست پر لے آئیں تو ان کے مقام و منزلت میں کمی نہیں آئے گی۔ پس سیاق سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ احکام مسلمانوں کے لیے نازل ہوئے ہیں۔

(۴) سورۂ نساء۔ ۱۴۰ جو کہ مدنی آیت ہے مذکورہ آیہ شریفہ یعنی انعام۔ ۶۸ کی تفسیر کرتی ہے جو کہ مکی ہے۔

وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات اللہ یکفربھا و یستھزا بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ۔ (نساء۔ ۱۴۰)

تم پر (اللہ کی) کتاب میں یہ حکم نازل ہوا تھا (یعنی سورۂ انعام میں) کہ جب لوگوں کو اللہ کی آیات کا استہزاء اور انکار کرتے دیکھو تو ان کے پاس نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری چیز کی تضحیک میں لگ جائیں۔

(ب) ایک اور آیہ کریمہ جس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ اس میں جناب ختمی مرتبتؐ کی جانب نسیان کی نسبت دی گئی ہے:

"ماننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا و مثلھا۔"

ہم کسی نشانی کو منسوخ نہیں کرتے اور نہ ہی اسے بھلاتے ہیں مگر اس جیسی یا اس سے بہتر نشانی سامنے لاتے ہیں۔

نسخ یعنی آنکھوں سے اوجھل ہونا یا غائب کر دینا اور "انساء" یعنی کسی چیز کا یادداشت سے مٹا دینا۔ قادر مطلق ارشاد فرما رہا ہے کہ ہمارا کام حکمت اور کمال کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنی کسی نشانی کو لوگوں کی نظروں اور ان کے حافظوں سے غائب کر دیتے ہیں تو اس جیسی یا اس سے بہتر نشانی سامنے لاتے ہیں۔ اس آیۂ شریفہ میں انساء یعنی بھلا دینے کی نسبت عام لوگوں کی

طرف دی گئی ہے اور گذشتہ دلائل کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شامل حال نہیں ہوتی۔ اس آیۂ کریمہ میں ایک نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں، حتیٰ قرآن میں موجود آیات یا نشانیوں کے کئی زاویے ہیں۔ قرآن کریم کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) آیات میں سے صرف دو کے بارے میں کسی حد تک وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ منسوخ ہوئیں۔ ہو سکتا ہے کوئی دو چار اور نکال لائے لیکن اگر کسی آیۂ کریمہ میں موجود حکم منسوخ ہو گیا تو ایسا نہیں کہ اس کا وجود ہی سرے سے بیکار ہو جائے بلکہ وہ آیت دوسری جہات سے قابل استفادہ رہے گی۔ مثلاً اپنی فصاحت وبلاغت کے حوالہ سے۔

(۴) آنحضرتؐ پر سحر

علامہ ابن خلدون نے "مقدمہ ابن خلدون" میں لکھا ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا گیا۔ اس جادو کا اثر باطل کرنے کے لیے معوذتین دو سورتیں (قل اعوذ برب الناس۔ قل اعوذ برب الفلق) اتریں۔(۱) صحیح بخاری باب السحر میں حضرت عائشہ سے متعدد روایات ہیں جن میں آپ فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا لگتا تھا کہ وہ عورتوں کی طرف جارہے ہیں جبکہ آپؐ ان کی طرف نہیں جارہے ہوتے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس سحر کے نتیجہ میں آپؐ خیال کرتے تھے کہ آپؐ نے کوئی کام کیا جبکہ آپؐ نے نہیں کیا ہوتا تھا۔(۲) جہاں تک خود سحر کا تعلق ہے تو ہمیں اس سے انکار نہیں کہ سحر ایک حقیقت ہے جیسا کہ اس کے بارے میں علامہ ابن خلدون نے بھی کچھ تفصیلات لکھی ہیں اور قرآن کریم نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے لیکن یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ نبی پر سحر ہو سکتا ہے یا نہیں۔؟

اگر ہم قوموں کی تاریخ کا جائزہ لیں اور اس ضمن میں قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کریں تو معلوم ہوگا کہ صرف حضرت موسیٰ کا دور تاریخ کا وہ واحد دور تھا جہاں جادو اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا جیسا کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں فصاحت وبلاغت اپنے کمال تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ جب حق کے طرفدار یعنی حضرت موسیٰ نے حق کا پرچم بلند کیا تو باطل نے انہیں دبانے کے لیے سحر سے مدد حاصل کی اور اس وقت کے ماہر ترین جادوگروں کو جمع کیا۔ ان کے جادو اور سحر کی عظمت کو خود قرآن کریم نے توصیف کیا ہے اور سورۂ اعراف۔

---

(۱) مقدمۂ ابن خلدون 'ترجمہ راغب رحمانی' حصہ دوم ص ۴۰۳

(۲) صحیح البخاری بحاشیۃ السندی 'بیروت: دار المعرفہ' جلد چہارم۔ باب السحر

۱۱۶ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ جب فرعون کے لائے ہوئے جادوگروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو لوگوں میں خوف واضطراب پھیلا دیا اور بہت خطرناک اور زبردست جادو کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ جب مجمع پر دہشت چھاگئی اور لوگ ان خطرناک سانپوں کو دیکھ کر بھاگنے لگے تو حق کے پرچمدار نے آواز دی:

فلما القوا قال موسی ماجئتم به السحر ان الله سیبطله ان الله لا یصلح عمل المفسدین ویحق الحق بکلماته ولو کره المجرمون (یونس۔ ۸۲۔۸۱)

"جب انہوں نے (اپنی رسیاں) ڈالیں تو موسیٰ نے کہا کہ جس جادو کا تم نے مظاہرہ کیا ہے اللہ تعالیٰ اس کا نام ونشان بھی مٹادے گا اس لیے کہ بلاشبہ وہ فساد پھیلانے والوں کے کاموں کو نتیجہ تک نہیں پہنچنے دیتا اور حق کو اپنے کلمات کے ذریعہ سے غلبہ عطا کرتا ہے اگرچہ یہ بات مجرموں کو گوارا نہیں۔

باوجودیکہ سحر حضرت موسیٰ پر نہیں کیا گیا تھا لیکن کیونکہ حق کے مقابلہ پر آگیا تھا اس لیے باطل کا مظہر تھا اور فساد پھیلانے والوں کے کرتوت کا حصہ تھا۔ چنانچہ قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی کی زبان سے یہ کلی قانون نقل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ باطل کو اس حد تک پھیلنے نہیں دیتا کہ وہ حق کی حقانیت کو گوشۂ تاریکی میں ڈال دے بلکہ اس کے برخلاف اپنے کلمات کے ذریعہ سے حق کو آشکار کرتا ہے اور باطل اور فساد پھیلانے والوں کے غلط کاموں کے اثرات کو محو کردیتا ہے۔ پس سحر جیسی حقیقت بھی اگر حق تعالیٰ کے کلمات کے مقابلے میں آجائے تو اسے مٹنا ہے اور اسے محو ہونا ہے اس لیے کہ وہ باطل ہے اور باطل حق کے مقابلہ میں نہیں ٹھہرتا۔ پس جب سحر یا جادو اپنی عظمت کے زمانہ میں موسیٰ کلیم اللہ کے سامنے نہ کھڑا ہو سکا تو جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ان کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا تھا اور انہیں تحت تاثیر قرار دے سکتا تھا حالانکہ وہ افضل واکمل بشر تھے اور جادو کے سامنے ان کا مغلوب ہو جانا حق کی شکست کے مترادف تھا جس کی تردید قرآن حضرت موسیٰ کی زبانی کرچکا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نقل کرتا ہے کہ یہ وہ الزام ہے جو اسلام دشمن عناصر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عائد کرتے تھے لہٰذا اہل ایمان کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اذیقول الظالمون ان تتبعون الا رجلاً مسحوراً (اسراء۔ ۴۷)

اس وقت جبکہ اہل ستم یہ کہا کرتے ہیں کہ تم پیروی نہیں کرتے مگر ایسے شخص کی جس پر جادو کیا جاچکا ہے۔ یہی جملہ سورۂ فرقان آیت نمبر ۸ میں نقل کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات کفار جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت اور حقانیت کو مجروح

کرنے کے لیے لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھرتے تھے اور اہل ایمان کی قدر و قیمت گھٹانے کے لیے یہ کہتے تھے کہ وہ ایک جادو کیے ہوئے شخص کی پیروی کرتے ہیں۔ لہٰذا جن روایات میں نقل کیا گیا ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر جادو ہوا اور اس کے اثرات مرتب ہوئے یہ روایات قرآن کی نص کے خلاف ہیں۔اور مسلمانوں کو اس پر مکمل اتفاق اور اجماع ہے کہ اگر کوئی حدیث نص قرآن کے خلاف ہو تو وہ اعتبار سے ساقط ہے۔ علامہ شبلی نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ پس یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر جادو نہیں ہوا۔ ممکن ہے ایسا کرنے کی کوشش کی گئی ہو لیکن شر پسند عناصر کو کامیابی نہ ہوئی ہو جہاں تک معوذتین کے نزول کا تعلق ہے تو عین ممکن ہے کہ کسی مسلمان پر جادو کیا گیا ہو چنانچہ مسلمانوں کو جادو گنڈا اور سفلی عمل کرنے والوں کے شر سے بچانے اور ان چیزوں سے دور رکھنے کے لیے معوذتین یعنی سورۂ فلق اور سورۂ ناس نازل ہوئی ہوں۔ واللہ اعلم۔

(۵) بیماری کا غلبہ

علامہ شبلی سیرت النبیؐ میں مستند ذرائع سے ذیل کی عبارت لکھتے ہیں: "(وفات سے پہلے ایک دن اتوار کو) لوگوں نے دوا پلانی چاہی چونکہ گوارا نہ تھی آپؐ نے انکار فرمایا۔ اسی حالت میں غشی طاری ہو گئی' لوگوں نے منہ کھول کر دوا پلا دی۔ افاقہ کے بعد آپؐ کو احساس ہوا تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے۔ محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضاء تھا۔ یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے آپؐ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنگ مزاجی نہیں بلکہ لطف طبع تھا۔"(۱)

مذکورہ اقتباس میں کہ جسے صحیح اور مستند احادیث سے نقل کیا گیا ہے' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ نسبت دی گئی ہے کہ بیماری آپؐ پر اس حد تک غلبہ کر گئی تھی کہ اس نے آپ کے دماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ لہٰذا آپؐ نے تمام حاضرین کو دوا پلانے کا حکم دیا حالانکہ یہ لوگ اس بیماری میں مبتلا نہ تھے اور نہ ہی ان سے ایسی خطا سرزد ہوئی تھی جس کا علاج اس دوا میں ہوتا۔ چنانچہ محدثین کی یہ توجیہہ ناقابل قبول ہے کہ یہ بشریت کا اقتضاء تھا اس لیے کہ جب ایک انسان بیمار ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ تلخ دوا کو نہ پیے لیکن کسی بیمار کی انسانیت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کو اپنی دوا تجویز کرے بلکہ اس کے برخلاف وہ دعا کرتا ہے کہ خدا دشمن کو بھی اس بیماری میں مبتلا نہ کرے تاکہ اسے دوا پینا پڑے۔ اسی طرح شبلی

۱۔ سیرت النبیؐ حصہ دوم ص ۱۱۲

کا جواب بھی صحیح نہیں اور ہمیں نہیں معلوم کہ اس لطف طبع سے ان کی کیا مراد ہے......؟! اس مسئلہ میں ہم ان واقعات اور مسائل کا بھی جائزہ لیں گے جن میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ ناروا نسبتیں دی گئی ہیں لیکن اس سے پہلے اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ کیا انبیاء علیہم السلام کی سیرت میں ایسی کوئی چیز ملتی ہے کہ بیماری کے غلبے یا اس طرح کے اضطراری حالات میں وہ ایسی باتیں کرنے لگیں جو عام حالات میں نہ کرتے ہوں یا بیماری ان کی عقل اور ان کے شعور پر اثرانداز ہو جائے......؟

تمام انبیاء علیہم السلام میں ایک حضرت ایوب ہیں جن کے کردار کا یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ قرآن مجید (ص۔ آیات ۴۳۔۴۱) (انبیاء۔ ۸۳) میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ جس حد تک خود قرآن سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا تو ان کا سارا مال و دولت چھین لیا گیا' ان کے اہل و عیال انہیں تنہا چھوڑ گئے یا حادثات کا شکار ہو گئے اور بیماری نے انہیں زمین گیر کر دیا۔ یعنی وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے صبر کیا اور زبان سے ایک لفظ بھی مشیت الٰہی کے خلاف نہ نکالا۔ وہ اسی طرح شکر کرتے رہے جیسا کہ عام حالات میں کیا کرتے تھے اور اسی لیے قرآن ان کی صبر و بردباری کی تعریف کرتا ہے اور ان کے طرز عبادت اور بندگی کے قرینہ کو سراہتا ہے۔ وایوب اذنادی ربّہ انی مسنّی الضروانت ارحم الراحمین (انبیاء۔ ۸۳)

"اور ایوب کو یاد کرو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکار کر کہا کہ مصیبت اور بدحالی نے مجھے گھیر لیا ہے جبکہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

پس اس حالت میں جب کہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہے تھے' ان کے بیوی بچے ان سے الگ کر دیئے گئے تھے' ان کا مال و دولت اور گھربار نہ رہا تھا اور حق و انصاف کے دشمن انہیں طعنے دے رہے تھے ان کی زبان سے مرضی حق کے خلاف کوئی لفظ نہ نکلا۔ ان کی دعا یہ بتا رہی ہے کہ وہ عقل و شعور کی اسی منزل پر تھے جس منزل پر وہ اس امتحان سے پہلے تھے اور اس منزل پر نہ ہوتے تو کم از کم قرآن ان کے صبر و استقامت کی تعریف نہ کرتا۔ صبر وہاں کہا جاتا ہے کہ انسان مشکلات اور شدائد میں اس راستہ کو نہ چھوڑے جس پر پہلے تھا۔ اگر بیماری ان پر غلبہ کر جاتی اور ان کا عقل و شعور اس کا شکار ہو جاتا تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتے پھر نہ پروردگار عالم سے اس انداز میں راز و نیاز اور مناجات کر پاتے اور نہ صبر و استقامت اور حق پر ڈٹے رہنے کا ثبوت دیتے۔

اسی طرح جب حضرت یعقوب جیسے باپ سے حضرت یوسف جیسا بیٹا چھین لیا گیا جس کے حسن و جمال اور اخلاق و کمالات کے وہ دلدادہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس مسئلہ میں ان کے باقی بیٹے

قصوروار ہیں لیکن اس کے باوجود وہ نہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہوئے اور نہ انہوں نے اپنے باقی بیٹوں کو دھتکار کر اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے دیا بلکہ توبہ اور اصلاح کی بات کی۔ حضرت یوسف کے فراق میں روتے روتے ان کی آنکھیں اور بال سفید ہوگئے اور سالہاسال گزر گئے۔ قرآن کریم نقل کرتا ہے کہ غم وفراق اور عشق کے ان ایام میں ان کے طرز عمل اور ان کی باتوں پر لوگوں کی طرف سے شدید اعتراض ہوتا تھا۔ ان کی تضحیک کی جاتی تھی اور انہیں جہالت اور ناروا نسبتوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا لیکن وہ ان سب کا جواب نہایت بردباری سے دیتے تھے اور فرماتے تھے "انی اعلم من الله مالا تعلمون" (یوسف۔۸۶) بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ میں جانتا ہوں تم اس سے ناواقف ہو۔ یعنی میرا ہر عمل علم کے مطابق ہے۔ پس عام حالات میں اگر سالہاسال سے ایک ایسا باپ اپنے بیٹے سے جدا ہو جائے جس کا وہ ولدادہ ہو اور سالہاسال تک اس پر روتا رہے تو عام قاعدے کے مطابق اس کا دماغ اور اس کے ہوش وحواس صحیح وسالم نہ رہیں گے۔ لیکن قرآن کریم تاکید کرتا ہے کہ اس حال میں بھی وہ کمال کی اس منزل پر تھے کہ جب انہوں نے فرمایا کہ میں یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں اور باوجودیکہ ان کی بات کو جہالت سے تعبیر کیا گیا لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ حقیقت وہی تھی جو اللہ کے نبی فرمارہے تھے۔ پس انبیاء ایک کامل (Perfect) انسان ہوتے ہیں۔ نیز اس وقت اور معاشرے میں ہر لحاظ سے بہتر و برتر ہوتے ہیں لہٰذا انہیں اس لیے منتخب کیا جاتا ہے کہ انسانیت کا ہادی اور رہنما بنایا جائے۔ اور باوجودیکہ وہ انسانیت اور تہذیب نفس کے حوالہ سے اس سطح پر ہوتے ہیں کہ خود مشکلات پر قابو پالیں لیکن اس کے ساتھ الطاف الٰہی بھی ان کے شامل حال ہوتی ہیں۔ بہرصورت کیونکہ وہ جسمانی وروحانی ہر حوالہ سے کامل ہوتے ہیں اور ان کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کے قول وفعل کو نمونہ اور مثالی کردار (Ideal) کے طور پر قبول کریں لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ بیماری میں ہوش وحواس کھو بیٹھیں یا ایسی بات کردیں جو صحیح حالت میں نہ کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی سیرت میں کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے ساتھ ایسا ہوا ہو۔ نیز جن روایات اور واقعات میں اس قسم کی چیزیں بیان کی گئی ہیں وہ نہ تاریخ کے حوالہ سے یقینی ہیں اور نہ ہی ان پر مسلمانوں کے درمیان اجماع یا اتفاق ہے۔ پس بہتر یہ ہے کہ ان واقعات کی غلط توجیہات کرنے کے بجائے صاف کہہ دینا چاہئے کہ یہ موضوعات یعنی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی ضمن میں واقعۂ قرطاس قابل توجہ ہے جسے صحیح بخاری و صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں تواتر سے نقل کیا گیا ہے۔

صحیح بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ "پیغمبر اکرمؐ وفات سے پہلے بیمار ہوگئے تھے

اور جبکہ آپؐ کے گھر میں کچھ لوگ تھے جن کے درمیان حضرت عمر بھی تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ (دوات کاغذ) لے آؤ تاکہ میں تمہیں ایسی تحریر لکھ دوں کہ جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ نبیؐ پر بیماری غالب آگئی ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے پس ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ گھر میں موجود لوگوں کے درمیان اختلاف و جھگڑا شروع ہو گیا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ جاؤ کچھ لے آؤ تاکہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے لیے وہ کچھ لکھ دیں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ جبکہ باقی نے وہی کچھ کہا جو حضرت عمر نے کہا تھا۔ جب اختلاف اور قیل و قال زیادہ ہوا تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ (۱)

آنحضرتؐ کی بیماری سے متعلق یہ روایت صحیح بخاری کی مختلف کتابوں یا ابواب میں نقل ہوئی ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں بھی روایت کی گئی ہے۔ ہم نے اسے صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنتہ باب کراھیتہ الخلاف سے نقل کیا ہے اور یہ روایت مولانا سلیمان ندوی صاحب کی نظر سے نہیں گذری لہٰذا ان کا یہ کہنا بجا نہیں کہ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کا نام نہیں ذکر کیا گیا اور صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں وارد ہوئی ہے۔ بعض جگہ صراحت سے نام لیا گیا ہے اور باقی جگہ نام نہیں لیا گیا۔ بہر حال ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کس نے ایسا کیا بلکہ اس حقیقت کی وضاحت کرنا ہے کہ متواتر اور صحیح روایات کے مطابق :

(i) صحابہ کرام میں سے کچھ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ الزام عائد کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیماری کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں یعنی اس حال میں ہیں کہ ان کا حکم نافذ نہیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرنے کی مخالفت کی گئی۔

(ii) ان افراد نے گمراہی سے بچنے اور ہدایت حاصل کرنے کے سلسلہ میں قرآن مجید پر اکتفا کرنے کا نظریہ پیش کیا جبکہ خود قرآن سنت کو نافذ العمل سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ قرآن و سنت کے سائے میں رہ کر اور ان میں موجود تمام احکامات کی پیروی کر کے ہی مسلمان ہدایت کا راستہ پا سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان اصحاب نے سنت یا نبی کریمؐ کے اوامر کو غیر قابل اجرا سمجھا اور انہیں نافذ کرنے کی مخالفت کی۔

(iii) صحیح بخاری اور دوسری صحاح میں تواتر سے نقل شدہ دوسری روایات کے مطابق

(۱) صحیح البخاری بحاشیتہ السندی، جلد چہارم، باب کراھیۃ الخلاف ص ۱۷۲

حاضرین میں سے کچھ لوگوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہا:
اھجر استفھوہ کیا یہ شخص لغو و بیہودہ گفتگو کر رہا ہے۔ جاؤ اس سے خود پوچھ لو (نعوذ باللہ) یہ چیز قابل توجہ ہے کہ ہم اس مسئلہ کو بنیاد بنا کر صحابۂ کرام کی تنقیص نہیں کرنا چاہتے اس لیے کہ ہم ان کی عظمت کے قائل ہیں لیکن بہر حال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی مسلمان بھی ان کی عصمت اور گناہوں سے پاک ہونے کا دعویدار نہیں ہے۔ ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کسی ایسے مسئلہ کو چھیڑا جاتا ہے اور اس میں حق و حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے غلط فائدے اٹھانا شروع کر دیتا ہے اور دوسرا گروہ سینہ تان کر صحابہ کے دفاع میں اتر آتا ہے۔ مسلمان صحابہ کی عظمت کے قائل ہیں نہ کہ عصمت کے۔ لہٰذا ہمیں اس مسئلہ میں ان لوگوں سے شدید اختلاف ہے جو صحابہ کا دفاع کرنے میں اتنا آگے چلے جاتے ہیں کہ نبوت کے مقام کو اس کی مقرر اور متعین جگہ سے نیچے لے آتے ہیں اور نتیجتاً وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے وہ چیزیں کہنے اور سوچنے لگتے ہیں جو کسی عام نبی اور رسول کو بھی زیب نہیں دیتیں۔ چنانچہ مورد بحث مسئلہ میں ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں. کہ صحابہ سے غلطی ہوئی تھی۔ انہوں نے اللہ کے آخری نبیؐ کے بارے میں جو نسبت دی وہ انہیں ہر گز زیب نہ دیتی تھی۔ انہوں نے صرف پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے کھلم کھلا نافرمانی نہیں کی بلکہ مکمل طور پر ہی سنت نبویؐ سے بے نیازی کا اظہار کیا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آخری لحہ میں کیا لکھنا چاہتے تھے جیسا کہ شیعہ حضرات اس ضمن میں کچھ دعوے کرتے ہیں لیکن روایت کے مطابق اس حد تک ضرور ہے کہ سرور کائنات کچھ ایسا رہنما اصول تعلیم دینا چاہتے تھے جس کے بعد مسلمان ہر گز گمراہ نہ ہوں۔ لیکن صحابہ کی ایک جماعت اس ارادے میں حائل ہو گئی۔ لہٰذا روایت کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے کہ ابن عباس اس سانحہ پر نہایت افسوس کا اظہار کرتے تھے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہک گئے تھے یا بھٹک گئے تھے یا بیماری ان پر غلبہ کر گئی تھی تو ہم اس ضمن میں پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ انبیاء کے سلسلہ میں اس بات کا امکان ہی نہیں ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بطریق اولیٰ یہ احتمال غلط ہے۔ اسی لیے سورۂ نجم کی وہ آیات گزر چکیں جن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کی نص کے مطابق فرمایا کہ ہمارا نبی نہ بھٹکتا ہے نہ بہکتا ہے نہ نفسانی حالات اس پر اتنا غلبہ کرتے ہیں کہ وہ حق و حقیقت کے خلاف بولنے لگے بلکہ یہ جو کچھ بولتا ہے وہ وحی ہے۔ یعنی اگر الفاظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوں تو وحی باللفظ ہے (قرآن) ورنہ وحی بالمعنی

(حدیث) ہے لیکن ان نقلی دلائل کے علاوہ اس کا عملی ثبوت خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت فراہم کیا جب کچھ لوگ ان کے پاس قلم و دوات لے کر پہنچے۔ انہیں دیکھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "ابعدالذی قلتم "(۱) کیا میرے بارے میں یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی مجھ سے چاہتے ہو کہ میں لکھ دوں یعنی تم نے میرے بارے میں اتنی ناروا نسبتیں دیں کہ میرے حکم اور میرے قول کو سند اور اعتبار سے گرا دیا اور میرے بارے میں یہ باب کھول دیا کہ مجھ پر بیماری غلبہ کر سکتی ہے جس کے نتیجہ میں 'میں نے یہ حکم دیا۔ پس اب جبکہ میرے بارے میں یہ احتمالات دیئے جا چکے ہیں تو کیا پھر بھی میں لکھوں اور اگر لکھوں تو کیا اسے سند کا درجہ حاصل ہوگا؟ چنانچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کا تقاضا مسترد کر کے یہ سمجھا دیا کہ عقل و شعور اور ہوش و حواس کے حوالہ سے وہ اسی حال میں ہیں جس میں بیماری سے پہلے تھے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو آپؐ لکھ دیتے اور آپ کی لکھی ہوئی یہ دستاویز بھی مسلمانوں کو گمراہی سے نہیں نکال سکتی تھی اس لیے کہ معترض حضرات نے اس کی سندیت اور حجت ہونے ہی میں شبہہ ڈال دیا تھا۔ بہر صورت جب صحابہ کرام نے بہت اصرار کیا تو آپؐ نے انہیں تین وصیتیں فرمائیں۔ ان میں سے تیسری وصیت کو راوی بھول گئے۔(۲) یہ امر بھی قابل تعجب ہے کہ جن مسلمانوں نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحہ کو قلبند کیا تھا وہ آخری وقت میں کی گئیں تین وصیتوں میں سے ایک کو کیسے بھول گئے......!!! ان روایات سے ایک خاص نتیجہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ایسا نہیں کہ حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں کے درمیان اختلاف پھوٹ پڑے ہوں بلکہ آپؐ کی زندگی کے دوران ہی ان اختلافات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور یہ واقعہ انہی میں سے ہے۔ اس مسئلہ میں ہم اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں کہ بیماری یا کوئی اور نفسانی حالت نبی کو اتنا متاثر نہیں کرتی کہ اس کا قول و فعل حجت نہ رہے" صحیح بخاری اور سیرت النبیؐ (شبلی نعمانی) سے ایک ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ کسی نبی کی روح قبض نہیں کی جاتی مگر یہ کہ اس سے قبل وہ جنت میں اپنا مقام نہ دیکھ لے۔ پھر اسے اختیار دیا جاتا ہے چاہے تو اس دنیا میں رہے اور چاہے تو آخرت کے گھر 'انبیاء کی رفاقت اور رضوان الٰہی کو دنیاوی زندگی پر ترجیح دے۔ چنانچہ آپ ایک اور حدیث میں فرماتی ہیں کہ جب سرور کائناتؐ نے آخری لحات میں

(۱) ہاشم معروف 'سیرۃ المصطفیٰ' بیروت : دار التعارف '۱۹۹۰' ص ۱۶۹ ۔ ۱۶۴ ۔

(۲) رجوع کریں صحیح بخاری' صحیح مسلم اور سیرت النبی" شبلی نعمانی' طبقات ابن سعد' البدایہ والنھایہ

فرمایا"بل الرفیق الاعلی" بلکہ سب سے اعلیٰ دوست کی رفاقت تو میں نے کہا اس کا مطلب ہے آپؐ نے ہمیں اختیار نہ کیا۔(۱) یہ جملہ کتب سیر میں بھی کثرت سے نقل کیا گیا ہے اور خود اس حدیث کی تائید کرتا ہے کہ قبض روح سے پہلے ملک الموت نبی سے اجازت لیتا ہے۔ پس جب موت اور قبض روح نبی پر مسلط نہیں کی گئی تو بیماری کیونکر مسلط ہو سکتی ہے کہ اپنی عقل کا توازن کھو دے۔ علامہ شبلی سیرت النبیؐ کے مقدمہ میں ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (Ibne-amr) کی عادت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو۔ عبداللہ بن عمرو نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے دہان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔(۲) پس اگرچہ یہ روایت غیظ و غضب اور خوشی کے تناظر میں نقل ہوئی ہے لیکن سرور کائنات کا اپنے دہن مبارک کی جانب اشارہ کر کے فرمانا کہ اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے' بتا رہا ہے کہ یہ بات کسی خاص حالت سے مخصوص نہیں بلکہ تمام حالات میں غم ہو یا خوشی' بیماری ہو یا صحت یا کوئی اور حالت ہو اللہ کے اس حبیبؐ کے دہن مبارک سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔ اس حدیث کے معتبر ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ حدیث ماینطق عن الھویٰ کے قرآنی معنیٰ کی وضاحت ہے۔(۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیارات

مسلمان مکمل اتفاق کے ساتھ تمام امور میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر کو مطلقاً حجت سمجھتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی قید یا شرط کو روا نہیں جانتے۔ لیکن کچھ لوگوں نے اس ضمن میں غیر ضروری تفصیلات ذکر کی ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ نبی کا ہر فعل حجت نہیں ہوا کرتا بلکہ صرف آخرت کے امور سے متعلق اقوال و افعال حجت ہیں۔

سر سید احمد خان سیرت النبیؐ پر لکھی گئی اپنی کتاب خطبات الاحمدیہ میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کو چار اقسام میں تقسیم کرتے ہیں اور صرف انہی اقوال کو حجت اور وحی بالمعنیٰ سمجھتے ہیں جو آخرت کے امور سے متعلق ہوں۔ باقی امور میں ان کی پیروی کو باعث ثواب ضرور سمجھتے ہیں لیکن بقول ان کے اگر حالات زمانہ اس کے ترک پر مجبور کر دیں تو اس سے دین

---

(۱) صحیح بخاری جلد سوم باب مرض النبیؐ ص ۹۶۔ ۹۲

(۲) شبلی نعمانی'سیرت النبیؐ' مقدمہ (۳) مزید تفصیلات باب کے آخر میں دیکھیں

میں کوئی نقص وارد نہیں ہوتا اور نہ کسی گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے۔

ان افعال کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) وہ جو ہمارے دین سے علاقہ رکھتے ہیں

(۲) جو جناب رسول خداؐ کے مخصوص حالات سے علاقہ رکھتے ہیں

(۳) ایسے اقوال جو تمام لوگوں کے حالات پر مؤثر ہیں۔

(۴) جو احکام سیاست ملکی اور انتظام مدنی سے متعلق ہیں۔

سر سید شاہ ولی اللہ سے یہ تفصیل نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جو بیماریوں کا علاج بتایا یا کسی رنگ کے گھوڑے کو پسند یا ناپسند کیا یا کوئی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بطریق عادت کیا نہ عبادت یا اتفاقیہ کوئی کام بغیر ارادے کے ہو گیا اور نیز ایسے کام جو سردار کے لشکروں کے معین کرنے اور انکے لیے نشانیوں کے قرار دینے اور متخاصمین کے درمیان فیصلہ کرنے کے ہیں۔ یہ سب دوسری قسم میں داخل ہیں۔ آخر میں وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سوائے ذکر آخرت کے باقی تمام باتیں تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں۔(۱)

جو تقسیم سر سید احمد خان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اقوال و افعال میں پیش کی ہے وہ مسلمانوں کے درمیان ایک نئی چیز ہے اس لیے کہ مسلمانوں کا مکمل اجماع ہے کہ قرآن و سنت مطلقاً سند اور حجت ہے۔ ہاں جو لوگ مغربی دانشوروں سے متاثر ہیں وہ ضرور اس قسم کی قیود و شروط ذکر فرماتے ہیں۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے سر سید کا احترام محفوظ ہے لیکن تفسیر و سیرت میں ان کے اقوال کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اسی طرح دنیا و آخرت کا جو تضاد ان کی توضیحات میں دکھائی دیتا ہے وہ مسیحیت میں تو موجود ہے لیکن اسلام میں اس کی کوئی جگہ نہیں اس لیے کہ اسلام دنیا کو آخرت کی کھیتی اور آخرت کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایسا نہیں کہ پیغمبر اسلام صرف آخرت کی چار باتیں کرنے آئے تھے بلکہ پروردگار عالم نے انہیں یہ اعلان کرنے کا حکم دیا تھا:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ ربّ العالمین (انعام۔ ۱۶۲)

اے رسولؐ! کہہ دیجئے کہ یقیناً میری نماز میری عبادتیں اور قربانیاں میرا مرنا اور میرا جینا سب کچھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے ہے جو عالمین کا پالنے والا ہے۔

پس اس دنیا میں آنے سے لے کر مرنے تک کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جس کے بارے میں اسلام نے کوئی واضح حکم نہ دیا ہو۔ اسی طرح زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کے بارے میں

(۱) سیرت النبی 'خطبات الاحمدیہ' خطبۂ سادسہ 'ص ۲۱۵۔ ۲۱۴

اسلام کی تعلیمات بیان نہ کی گئیں ہوں۔ پس اسلام کی نظر میں دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جو آخرت کا پیش خیمہ نہ بن سکتی ہو۔ اس سے پہلے کہ ہم سر سید کی بیان کردہ مثالوں کی طرف اشارہ کرتے چلیں، یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ حدیث کے فہم اور ان کے استخراج و استنباط کے سلسلہ میں اجتہاد ایک لازمی امر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اوامر و نواہی دو اقسام کے ہیں۔

(۱) شرعی امور کے بارے میں ہیں

(۲) جو عقل کی جانب ایک طرح کی رہنمائی ہے۔ (ارشادی)

اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کسی بیماری کا علاج تجویز فرمایا تو وہ ایک قانون ساز ادارے کی حیثیت سے تجویز نہیں فرمایا بلکہ اس وقت کے موجود وسائل اور طریقہ کار کے لحاظ سے بہترین علاج تھا۔ لہٰذا اگر علم طب ترقی کر گیا ہوتا اور ترقی یافتہ وسائل موجود ہوتے تو آپؐ اس کی جانب رہنمائی فرماتے۔ لیکن اس دور میں یہ بہترین علاج تھا بشرطیکہ نقل کو معتبر فرض کر لیا جائے ورنہ آپؐ ہرگز اس مسئلہ میں اپنی رائے کا اظہار نہ فرماتے۔ لیکن کیونکہ شرعی احکام کے علاوہ دوسرے امور سے متعلق روایات میں اتنی دقت اور درایت سے کام نہیں لیا گیا لہٰذا ان پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح یہ نقل کرنا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کوئی کام اتفاقاً بغیر قصد کے پیش آگیا۔ یہ بھی بعید از قیاس نظر آتا ہے اس لیے کہ جو انسان عقل و شعور سے برخوردار ہوتا ہے وہ اپنے تمام کاموں کو ایک خاص نظم و ضبط سے انجام دیتا ہے۔ جو کام اس کے مقاصد اور مفادات اور دنیا و آخرت کے امور میں فائدہ مند ہوتے ہیں انہیں انجام دیتا ہے اور جن میں مرضی الٰہی شامل نہیں ہوتی ان سے پرہیز کرتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کسی چیز کو پسند کرنا یا نہ کرنا حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کسی لشکر کے سردار کو معین کرنا یا لوگوں کے درمیان قضاوت کرنا اور ان کے باہمی اختلافات کو حل کرنا یا سیاسی امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رائے نافذ نہیں" سراسر غلطی اور نافہمی پر مبنی ہے۔ نیز یہ قرآن اور سنت کی صریح نص کے خلاف ہے۔ اگر پیغمبر اکرمؐ کسی مسلمان کو سردار بناتے اور اس کا حکم نہ مانا جاتا اور اگر مسلمانوں کے درمیان انصاف سے فیصلے کرتے اور ان کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو نہ اسلامی معاشرہ قائم ہوتا نہ اسلام اتنی ترقی کرتا کہ علم، تہذیب، تمدن اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی عظمت پوری دنیا میں تسلیم کر لی جاتی۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جہاں مسلمانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیمات سے رتی برابر انحراف کیا انہیں زبردست شکست ہوئی اور جنگ احد اس کی

بہترین مثال ہے۔ جو چیز قرآن و سنت کے فہم کے سلسلہ میں ضروری ہے وہ اجتہاد اور دین میں تفقہ و بصیرت ہے۔ اگر بالفرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس زمانہ میں گھوڑے کو سواری کی حیثیت سے منتخب کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھوڑے پر سوار ہونا سنت ہے بلکہ سنت نبویؐ یہ ہے کہ اس وقت موجود بہترین سواری کو پسند فرمایا لہٰذا مسلمانوں کو بھی کوشش کرنی چاہیے کہ جائز وسائل میں بہترین سواری کا انتظام کریں۔ لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے اور ہر مسئلہ میں صحیح رائے تک پہنچنے کے لیے بہت سے مراحل کو طے کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی اس مسئلہ میں مسلمانوں کے درمیان موجود متفقہ اور حقیقت پر مبنی نظریے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی لازمی شرط اس قانون کلی کو تسلیم کرنا ہے کہ نبی کا قول حجت ہے اور کوئی اہل ایمان یہ حق نہیں رکھتا کہ نبی کے اظہار رائے یا کسی چیز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے بعد اپنی ذاتی رائے پر عمل کرے۔"(۱)

نیز اسلامی مملکت کی قانون سازی کے سلسلہ میں علامہ مودودی لکھتے ہیں "یہ قانون سازی قرآن و سنت کے وضع کردہ دائرے کے اندر ہونی چاہیے۔ اُمت مسلمہ کا فرض ہے کہ فرمانِ الٰہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کے سامنے مکمل تسلیم ہو جائے اور رتی برابر بھی ان سے انحراف نہ کرے۔(۲)

علامہ مودودی نے جو کچھ بیان کیا ہے یہ ان اختیارات کی تفصیل ہے جسے قرآن اپنی متعدد آیات میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ احزاب آیۂ نمبر ۶ میں ارشاد ہوتا ہے "النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم، نبیؐ اہل ایمان کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق رکھتا ہے۔ پس جب نبیؐ اہل ایمان کی جان پر خود ان سے زیادہ سزاوار ہے تو ان کے مال اور دوسری چیزوں پر بطریق اولیٰ زیادہ حق رکھتا ہوگا۔ سورۂ احزاب ہی کی آیت نمبر ۲۱ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے ہر ہر گوشہ کو بطور مطلق اسوہ اور نمونہ قرار دیا جاتا ہے تاکہ اہل ایمان اسے اپنی زندگی میں ایک مثالی کردار کے طور پر سامنے رکھیں اور اس کی پیروی کریں۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ (احزاب۔۲۱) لیکن جس آیہ کریمہ میں مزید صراحت و وضاحت سے کام لیا گیا ہے اور ہر قسم کی چون وچرا اور شک وشبہہ کی گنجائش مطلقاً ختم کردی گئی ہے وہ اسی سورۂ

---

(۱) علامہ مودودی، الاسلام فی مواجھتہ التحدیات المعاصرۃ

(۲) علامہ مودودی، نظام الحیاۃ فی السلام ص ۳۳

کی آیت نمبر ۳۶ ہے۔ وماکان لمؤمن ولامؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرہ من امرھم۔ ومن یعص اللہ ورسولہ فقدضل ضلالاً مبیناً (احزاب۔ ۳۶)

اور اللہ ورسولؐ کے کسی مسئلہ میں فیصلہ کے بعد کسی مؤمن یا مؤمنہ کے لیے اپنے امور ومعاملات میں کسی قسم کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ اور اگر کوئی اللہ ورسولؐ کی نافرمانی کرے گا تو بے شک وہ واضح طور پر گمراہی کا شکار ہو جائے گا۔

اس آیۂ کریمہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے امور ومسائل میں اگر ضروری سمجھیں تو دخالت کر سکتے ہیں اور ان کا فیصلہ نافذ ہے اور اس فیصلہ سے نافرمانی واضح اور کھلی گمراہی کے مترادف ہے۔ پس اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو تقسیم سرسید نے پیش کی تھی وہ نص قرآن کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ یہ آیہ کریمہ ایک خاص واقعہ کے ذیل میں نازل ہوئی ہے۔ سیوطی درمنثور میں ابن عباس سے ایک روایت نقل کرتے ہیں جسے مفسرین اور اہل سیر میں بہت سوں نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید بن حارثہ کے لیے اپنی پھوپی زاد بہن زینب بنت جحش سے رشتہ بھیجا۔ انہوں نے اس بنا پر اس سے انکار کیا کہ وہ حسب ونسب میں زید سے بہتر ہیں۔ چنانچہ خداوند عالم نے اس آیۂ کریمہ کو نازل کیا اور جب حضرت زینب بنت جحش نے دیکھ لیا کہ ان کا انکار اللہ ورسولؐ کی نافرمانی اور کھلی گمراہی کے مترادف ہے تو انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن کیونکہ وہ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں اور حضرت زید بن حارثہ حضرت خدیجہ کے غلام تھے جنہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کر کے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا للہٰذا ان دونوں میں نہ نبھ سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت زینب خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی شخصیت کے گرد مغربی سوانح نگاروں نے کچھ افسانے گھڑنے کی کوشش کی ہے جن کا دھوکہ سید امیر علی بھی کھا گئے ہیں اس لیے کہ یہ کوئی غیر نہ تھیں ان کی اپنی پھوپی زاد بہن تھیں۔ بہر حال ہمیں اس سے بحث نہیں کرنا۔ آیۂ کریمہ میں اللہ کے حکم سے مراد حکم تشریعی ہے اور رسولؐ کے حکم سے مراد وہ فیصلے ہیں جنہیں آنحضرتؐ لوگوں کے معاملات اور مسائل میں دیں۔ جیسا کہ حضرت زینب کے بارے میں آپؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ زید سے بیاہ کریں۔ یہ احکام اس حق کی بنا پر نافذ اور واجب العمل ہیں جسے سورۂ احزاب کی ابتداء ہی میں بیان کر دیا گیا تھا کہ نبی اہل ایمان کی جانوں پر ان سے زیادہ حق رکھتا ہے۔ اس حکم نبوی کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن نمایاں طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح آنحضورؐ جاہلیت کی غلط رسموں اور غلام اور آزاد کے فرق کو اور حسب ونسب کی فخر فروشیوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال ان کے حکم کی

اطاعت فرض ہے (نساء۔ ۹۵) اور ان کا فعل تمام موارد میں حجت اور سند ہے اسی لیے قرآن کریم (سورہ نساء۔ ٦۵) مسلمانوں کے باہمی اختلافات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عدلیہ کے سربراہ کی حیثیت سے حکم قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو دل سے ان کے فیصلوں کو قبول کرنے کی سخت تاکید کرتا ہے۔" فلاوربّك لایؤمنون حتی یحکموك فیماشجربینهم ثم لایجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً (نساء۔ ۹۵) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں" پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

معمولاً جب کوئی قاضی منصب قضاوت پر بیٹھ کر دو افراد کے درمیان فیصلہ کرتا ہے تو جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہوتا ہے وہ اس فیصلے کو دل سے قبول نہیں کرتا بلکہ اضطراب کی حالت میں ہوتا ہے۔ آیۂ شریفہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اس وقت ایمان کی حقیقت تک پہنچیں گے اور صحیح معنی میں مؤمن کہلائے جانے کے مستحق ٹھہریں گے جب یہ آپس کے اختلافات میں صرف تمہیں حکم ٹھہرائیں۔ کسی اور کی عدالت میں جا کر اپنا حق نہ لیں۔ پھر ان کی بہ نسبت تم جو بھی فیصلہ کرو یہ دل کی گہرائیوں سے اسے قبول کرلیں اور مکمل طور سے تسلیم و تابع ہوجائیں۔ پس ان آیات سے واضح ہے کہ لوگوں کی باہمی کش مکش اور اختلافات میں نبی کریمؐ کا حکم نافذ ہے۔ اسلامی معاشرے کے تمام امور و معاملات میں ایک خاص نظم و ضبط برقرار کرنے کے لیے اور اسی طرح دوسرے بہت سے اسباب کی بنا پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی کے قول اور نبی کے فعل کی پیروی کو لازم اور فرض قرار دیا ہے اور ان سے مخالفت اور نافرمانی کو گناہ گمراہی اور ضلال کے نام سے یاد کیا ہے اور اللہ کے عذاب کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ ختم المرسلین سے کیا مخصوص قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا لوگوں پر فرض کردیا کہ وہ اسکی اطاعت کریں۔ وماارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله (نساء۔ ٦۴)

ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اللہ کی اجازت سے لوگوں پر فرض کردیا کہ وہ اس کی اطاعت کرتے رہیں۔ یا یہ کہ ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔" (سورۂ نساء۔ ٦۹) میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو تمام امور میں اللہ و رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں انہیں آخرت میں انبیاء و صدیقین کے ساتھ محشور کیا جائے گا۔ سورۂ نساء۔ ۸۰ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کے اطاعت گذار صرف وہ لوگ ہیں جو نبی کی اطاعت کرتے ہیں۔ سورہ نساء۔ ۱۱۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی حق و ہدایت کا راستہ واضح ہونے کے

بعد بھی رسول کی مخالفت کرے گا تو ہم اسے دوزخ میں ڈال دیں گے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں جن کے مطالعہ کے بعد کسی قسم کا شک باقی نہیں رہتا کہ دینی و دنیاوی تمام امور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مطلق اطاعت واجب ہے۔ اور جو لوگ آنحضرتؐ کے حکم کی مخالفت کریں گے یا اسے حالات زمانہ کے لحاظ سے یا کسی دوسرے مسائل کی خاطر ترک کردیں گے وہ واضح گمراہی میں چلے گئے ہیں اور دوزخ ان کا ٹھکانہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی طرح سنت بھی مطلقاً سند اور حجت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیارات اور احکامات زمان و مکان و موضوعات کی شرائط سے آزاد ہیں اور حقیقی اسلام اور ہدایت کا سچا راستہ صرف قرآن کے ساتھ ساتھ سنت کی پیروی میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ختم المرسلین اور خاتم النبیین بنا کر بھیجا۔

مدارک

مرتضی عاملی' الصحیح من سیرۃ النبیؐ' بیروت: دار السیرۃ' 1995' جلد سوم
شبلی نعمانی' سیرت النبیؐ' کراچی: دار الاشاعت' جلد اول' ۹۸۴
ہاشم معروف' سیرۃ المصطفی' بیروت: دار التعارف' ۱۹۹۰ء' ص ۱۶۹۔ ۱۶۴
اولاد حیدر بلگرامی' اسوۃ الرسولؐ' لاہور: علی پبلی کیشنز' جلد سوم ص' ۴۴۱۔ ۴۳۵
سر سید احمد' خطبات سیرۃ النبیؐ' لاہور: دوست ایسوسی ایٹس' ۱۹۹۷ء الخطبہ السادسہ ص ۲۱۵۔ ۲۱۴
امیر علی' روح اسلام' ترجمہ ہادی حسین' لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۱۹۹۰ء' ص ۹۵
مرتضی مطہری' خاتمیت' تہران: انتشارات صدرا' ۱۹۹۶ء
فخر رازی' التفسیر الکبیر' تہران: دار الکتب العلمیہ
محمد حسین طباطبائی' تفسیر القرآن' تہران: دار الکتب الاسلامیہ ۱۳۹۱ھ
جوادی آملی' تفسیر موضوعی قرآن' قم: مرکز نشر فرہنگی رجاء' ۱۹۹۳ء جلد ششم
ابوالحسن طبرسی' مجمع البیان' شام: ۱۹۳۵
محمد رشید رضا' تفسیر المنار' قاہرہ: جلد ہفتم
سیوطی' در المنثور' تہران:
بخاری' صحیح البخاری بحاشیۃ السندی' بیروت: دار المعرفۃ
علامہ حلی' کشف المراد' قم: موسسہ امام صادق' ۱۹۹۶' ص ۱۷۶۔ ۱۷۴

حسین مظفر، دلائل الصدق، قم: مکتبہ بصیرتی، ۱۹۷۴ء ص ۳۸۷
قاضی نوراللہ شستری، احقاق الحق، تہران: کتابفروشی اسلامیہ جلد دوم ص ۲۰۵
فیض الاسلام، نہج البلاغہ، تہران: ۱۳۹۲ھ، خطبہ نمبر ۱۷
ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء حصہ دوم ص ۴۰۳
راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ القرآن، قم: المکتبة المرتضویہ
ابن منظور، لسان العرب، قم: نشر ادب الحوزہ، ۱۴۰۵ھ
ابوالاعلیٰ مودودی، نظام الحیاۃ فی الاسلام، امریکہ: الاتحاد الاسلامی العالمی، ۱۹۷۰ء ص ۳۳
ابوالاعلیٰ مودودی، الاسلام فی مواجہۃ التحدیات المعاصرۃ، ترجمہ خلیل احمد الحامدی، کویت: دارالقلم، ۱۹۷۱ء
الزبیدی، تاج العروس، بیروت: دار مکتبۃ الحیاۃ، ۱۳۰۶ھ

H.A.R. GIBB & Kramers, Shorter Encyclopedia of Islam,Leiden: E.J. Brill , 1974, PP.385-396

H.A.R.GIBB & Kramers, Encyclopedia of Islam, Leiden: E.J. Brill, 1986, Vol. I PP.301-302

Montgommery Watt, Mubammad (PBUH) at Mecca, Karachi: Oxford University press,1993, PP.104-106

R.A.Nicholson, Literary History of Arabs, Cambridge: Curzon press,1993, P. 152

☆ جہاں تک آنحضرتؐ کی گفتار کا تعلق ہے تو صحیح بخاری میں بہت سی ایسی روایات نقل کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنی طرف سے کچھ قیاس نہ کرتے صرف اللہ تعالیٰ کا حکم بیان کرتے اور اگر کسی مسئلہ میں حکم نازل نہ ہوا ہو تو خاموش رہتے تھے۔ (ترجمۂ علامہ وحید الزماں، باب ۱۲۱۵ صفحہ ۹۳۳)۔ جہاں تک بیماری کا تعلق ہے تو خود صحیح بخاری کی نقل کردہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرتؐ کو عام انسانوں کے مقابلے میں دگنی تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ مکمل ہوش و حواس میں رہتے اور اس بیماری کے نتیجے میں ملنے والے اجر و ثواب کی یاددہانی کراتے (کتاب المرضیٰ باب ۳۸۳، ۳۸۴)۔ اس وقت کے مسلمانوں یعنی صحابہ کرام کے درمیان اختلافات کے سلسلے میں بھی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں۔ (باب۔ ۱۲۱۲)

آخری خلیفہ

یہ ایک مبینہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان متنازعہ مسائل کی کمی نہیں۔ یہ اختلافات ہمیشہ سے عالم اسلام کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئے ہیں لیکن انہیں حل کرنے کی ضرورت پر زور نہیں دیا گیا۔ آج بھی مسلمان مذہبی اختلافات' فرقہ بازیوں اور تعصبات کا شکار ہیں اور اس کی سزا خود بھی بھگت رہے ہیں اور اسلام کے پیغام کو اقوام عالم کے سامنے پیش کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ قرآن کریم نے جہاں ہر مسئلے کا حل پیش کیا ہے وہاں مسلمانوں کے درمیان موجود ان اندرونی اختلافات کا حل بھی تجویز کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"پس اگر تم کسی چیز میں تنازعہ کرو تو اسے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو"

اس آیۂ کریمہ میں مسلمانوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ آپس کے اختلافات اور باہمی جھگڑوں کا تصفیہ قرآن اور سنت کے سائے میں رہ کر کیا کریں۔ یہ آیۂ کریمہ جس دور میں نازل ہوئی اس وقت سے لے کر قیامت تک کے اختلافات پر ناظر ہے۔ اگر قرآن کے ماننے والے ان اختلافات کو قرآن وسنت کی جانب پلٹا دیتے اور ان کے ذریعے سے اختلافات کو حل کرتے تو آج اسلامی دنیا اتنے شدید مسائل کا شکار نہ ہوتی۔ انہی اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور اسلامی خلافت کا مسئلہ ہے۔ یوں تو اس مسئلے پر پوری تاریخ میں بڑی لے دے ہوئی ہے لیکن دوسری طرف ہمیں تاریخ اسلام میں ایسی عظیم

یہ مقالہ اہلسنت والجماعت کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔

شخصیات دکھائی دیتی ہیں جو اپنے حسن اخلاق' نیک کردار اور بے لوث خدمات سے ان اختلافات پر غالب آگئیں۔ انہوں نے اپنی جاذب نظر شخصیت اور حسن خلق سے مسلمانوں میں جاری مخاصمتوں' جھگڑوں اور جنگ و جدال کا خاتمہ کیا اور اپنے عظیم کردار سے معاشرے کے ہر گروہ و قبیلے کو متاثر کیا۔ اس طرح یہ لوگ اپنا خاندانی وقار برقرار رکھنے اور معاشرے کو قرآن و سنت پر جمع کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چھوٹے دل و دماغ کے چند لوگوں نے اپنے ذاتی رجحانات اور سیاسی مفادات کی خاطر ان پر الزامات کی بارش کردی۔ اسلام کی مخالف طاقتوں اور نام نہاد خلافتوں نے ان اعتراضات سے فائدہ اٹھا کر ان شخصیات کے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ آنے والی نسلوں کے لئے ان مقدس ہستیوں کی صاف ستھری زندگی کے نقوش بھی دھندلے پڑ گئے۔ پس جب تک اسلامی معاشروں میں ایسے مثالی کرداروں کو زندہ نہیں کیا جائے گا جو عالم اسلام میں اتحاد و یکجہتی کے مظہر ہوں' اس وقت تک مسلمان اپنے باہمی اختلافات کو حل کرنے اور معاشرے میں اسلامی اقدار کو فروغ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ اسلام کی ان عظیم اور بے مثال شخصیات میں نمایاں طور پر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا نام لیا جا سکتا ہے۔

۱۵ رمضان المبارک سنہ ۳ ہجری کا بابرکت دن نواسۂ رسول امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت کی یاد دلاتا ہے۔ ولادت سے لے کر تقریباً آٹھ سال تک آپ آغوش رسالت میں رہے۔ شیعہ و سنی احادیث کے مجموعے کثرت و تواتر کے ساتھ نہ صرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آپ سے بے پناہ محبت اور خاص تعلق کا پتہ دیتے ہیں بلکہ ان احادیث سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اس فرزند کو غیر معمولی اہمیت دے کر مسلمانوں کی قیادت کے لئے تیار کر رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ بات مسلمانوں کے گوش گزار کر رہے ہیں کہ یہ آگے جا کر ان کی امت میں اہم کردار ادا کریں گے اور مسلمانوں کے دو متحارب گروہوں میں صلح و آشتی برقرار کریں گے۔

سنہ ۱۱ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پر شفقت سایہ اٹھنے کے بعد سے لے کر سنہ ۴۰ ہجری تک وہ اپنے والد حضرت علی مرتضیٰ کے زیر تربیت رہے۔ آپ کو بہت قریب سے خلفائے راشدین کو دیکھنے کا موقع ملا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس طرح آپ کی شخصیت کو اجاگر کر دیا تھا اور جو کچھ آپ کے حق میں فرمایا تھا اس کا اثر تھا یا آپ کی شخصیت میں موجود رعب تھا کہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام آپ کو بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور مسلمان آپ کے احترام میں کمی نہ آنے دیتے۔ حضرت عمر آپ اور آپ کے بھائی امام حسینؑ کو بقیہ مسلمانوں پر فوقیت دیتے ہوئے بیت المال میں سے بدری اصحاب کے برابر حصہ دیتے تھے۔

یوں تو اس ۲۹ سالہ دور میں آپ سیاسی' سماجی اور معاشرتی امور میں اپنے والد کے مدد و معاون رہے تھے اور آپ کی خدمات عالم اسلام کے افق پر ابھر آئی تھیں لیکن جب لوگوں نے آپ کے والد سے خلیفہ کی حیثیت سے بیعت کر لی تو خلافت مرتضوی کا بہت سارا بوجھ بھی آپ کے کاندھوں پر آپڑا تھا۔ ۱۹ رمضان المبارک ۴۰ ہجری میں آپ کے والد پر مسجد کوفہ میں تلوار سے حملہ کیا گیا جس کے نتیجہ میں ۲۱ رمضان کو وہ خالق حقیقی سے جا ملے اور اسی دن کوفہ میں موجود چالیس ہزار لوگوں نے بغیر کسی جرو بحث یا مخالفت کے آپ کو خلیفہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ خلافت کی تاریخ میں نہ آپ سے پہلے اور نہ ہی آپ کے بعد اس قسم کا اتحاد و اتفاق دیکھنے میں آیا تھا اگر ہم تاریخ خلافت کی جانب مختصر سا اشارہ کریں اور انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو سقیفہ بنی ساعدہ کا اجلاس اور اس کے بعد کے واقعات ہمیں خلیفہ اول کے انتخاب کے وقت ان اختلافات کی جانب رہنمائی کریں گے۔ یہ اختلافات تیسری خلافت کے تقرر کے وقت خاصے شدید ہو گئے تھے جب خلیفہ ثانی نے خلافت کے لئے چھ نامزد مقرر کئے تھے اور خاص دقتوں کے بعد حضرت عثمان کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ پھر جب خلافت کے بعد ملوکیت کا دور شروع ہوا تو اس مقام کو تصاحب کرنے کے لئے مسلمانوں کے درمیان طویل جنگیں لڑی گئیں اور خونریزی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ گئیں اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ خانہ کعبہ اور حرم شریف بھی خلافت کی اس کشمکش سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس پر بھی پتھراؤ کیا گیا۔ اس کے برخلاف جب امام حسنؑ کو خلافت کے لئے پیش کیا گیا تو اس وقت کوفہ جیسا شہر دارالخلافہ تھا جہاں مختلف رنگ' نسل اور مذہب کے لوگ آباد تھے جن کی ذہنی سطح اور رجحانات بھی یکسر مختلف تھے۔ کوفہ کو ہمیشہ سے اختلافات و نفاق کے مرکز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس سب کے باوجود فرزند رسولؐ کی جامع شخصیت اور ان کا اعلیٰ اخلاق اس انتشار و اختلاف پر حاوی آگیا اور تمام ہاتھ ان کی بیعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلا واقعہ تھا جب نواسہ رسولؐ کے سوا نہ خلافت کا کوئی امیدوار تھا اور نہ ہی اس انتخاب کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند ہوئی تھی۔ جب ارباب حل و عقد کے اس حسن انتخاب کی خبر مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ اور دوسری ریاستوں کو پہنچی تو انہوں نے اس کا شایان شان استقبال کیا اور لوگوں سے امام حسنؑ کے لئے بیعت لی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نامزدگی کے خلاف مخالفت و اعتراض کی آوازیں بلند ہونی چاہیئے تھیں اور تاریخ انہیں نقل کرتی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی ایسا نمایاں چہرہ سامنے نہیں آتا جو فرزند رسولؐ سے بیعت کرنے میں پس و پیش کرے۔ لہذا کوفہ' بصرہ' یمن' حجاز' فارس اور وہ تمام ریاستیں آپ کے تابع ہو گئیں جو اس سے قبل آپ کے والد

محترم کے زیر نظر تھیں۔ ہم صلح امام حسنؑ میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔ ڈاکٹر ایس ایچ ایم جعفری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"تاریخی ذرائع کے مطابق صفین کی جنگ میں حضرت علیؑ کے ہمراہ ستر بدری اصحاب، سات سو اصحابہ شجرہ (جنہوں نے حدیبیہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی تھی) اور چار سو دوسرے صحابہ کرام شامل تھے۔ ان میں کی خاصی تعداد ابھی کوفہ میں قیام پذیر تھی کیونکہ حضرت علیؑ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ ان تمام صحابہ نے امام حسنؑ کے انتخاب میں شرکت کی ہوگی اور انہیں اپنا خلیفہ منتخب کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ ان کی صدائے احتجاج ضرور منعکس کرتی۔ اس حقیقت میں کسی طرح کا شبہ نہیں پایا جاتا۔ نیز مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منورہ میں بھی امام حسنؑ کی خلافت کا استقبال کیا گیا ہوگا یا کم از کم اسے قبول کر لیا گیا ہوگا۔ اس امر کی تصدیق یوں کی جا سکتی ہے کہ ہمیں ان شہروں سے امام حسنؑ کی خلافت کے خلاف ایک آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔" (۱)

پس یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ پورے عالم اسلام نے ایک آواز ہو کر امام حسنؑ کو خلیفہ کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ صرف والیٔ شام امیر معاویہ اور ان کے حواریوں نے اس خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس سے فرزند رسولؐ کی خلافت اور ارباب حل و عقد کے اجماع پر کوئی حرف نہیں آتا اس لئے کہ جب صحابہ کرام سمیت پوری اسلامی دنیا اور مکہ و مدینہ میں موجود اسلامی حلقے امام حسنؑ سے بیعت کر چکے تھے تو اس سے امیر معاویہ اور ان کے معاون عمرو بن عاص کی مخالفت سے رتی برابر بھی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ ان کی مخالفت قرآن و سنت کی رو سے نہیں تھی بلکہ امیر شام عنان اقتدار سنبھالنے اور حکمران بننے کے خواہاں تھے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی ایک دو اشخاص سے اجماع پر حرف نہیں آیا کرتا۔ پہلے خلیفہ کو منتخب کیا گیا تھا تو بہت سی ریاستیں ان کی مخالف ہو گئی تھیں اور انہیں زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے تیار نہ تھیں لیکن اس مخالفت سے ان کی خلافت پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ اسی طرح کی مخالفت عہد مرتضوی میں بھی شام کی جانب سے کی گئی تھی۔

مؤرخ شاہ معین الدین ندوی تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں:

"حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ہی سے حضرت امیر معاویہ والی شام کے دل میں عالم اسلام پر حکومت کرنے کی تمنا تھی۔ اس کے لئے انہوں نے جنگ بھی کی لیکن حضرت علیؑ کی زندگی میں ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی تھی۔ (۲)

پس جبکہ وہ خود حکومت سنبھالنے کے خواہشمند تھے اور اس کا اظہار انہوں نے صلح حسن

کے بعد اپنی زبان سے بھی کیا تھا لہذا جو شخصیت بھی خلافت سنبھالتی وہ اس کی مخالفت کرتے۔ ان کی اس خواہش کا خمیازہ عالم اسلام کو بھگتنا پڑا اس لئے کہ شام کے خلاف ہونے والی ان جنگوں میں ان کے خلاف نبرد کرتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب شجرہ، بدری اصحاب اور دوسرے صحابہ کی ایک بڑی تعداد شہادت کے درجہ پر فائز ہو چکی تھی۔ مزید براں نہ جانے کتنے بے گناہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ گئیں اور تمدن وارتقاء تعلیم و تعلم اور امن وامان کی جن بنیادوں پر جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی معاشرے کو استوار کیا تھا وہ ان اندرونی معرکوں کی نذر ہو گیا۔ تاریخ صلح کے بعد امیر شام کے بیانات محفوظ کرتی ہے جس میں انہوں نے لوگوں سے خطاب کر کے کہا تھا کہ انہوں نے ان کے نماز روزے کی خاطر جنگ نہیں کی بلکہ ان پر حکومت کرنے کی غرض سے یہ جنگیں لڑی ہیں۔ اور کیونکہ حضرت علیؑ ومعاویہ اور اسی طرح امام حسنؑ ومعاویہ کے درمیان ہونے والی جنگوں کو بھی ایک اختلافی مسئلہ بنالیا گیا ہے لہذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان معرکوں کے اختلافی ہونے کی جانب اشارہ کرنے کے بعد قرآن وسنت کے اصول کے ذریعے سے انہیں حل کریں۔

علامہ ابن خلدون مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں:

”علیؑ ومعاویہ کی لڑائی میں معاویہ کی طرف غلطی کو متعین کرنا غلط ہے کیونکہ اجماع کا جو یہ فیصلہ ہے کہ اجتہاد میں صحیح وغلط دونوں کا احتمال ہوتا ہے غلطی کے تعین کی صورت باقی نہیں رہتی“۔(۳) لیکن جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں اس مسئلے میں علامہ صاحب کی رائے قبول نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ

۱۔ امیر شام یہ جنگ قرآن وسنت کی رو سے نہیں لڑ رہے تھے۔

۲۔ ان لڑائیوں کو علیؑ ومعاویہ کی لڑائی کہنا غلط ہو گا اس لئے کہ جنگ صفین اور امام حسنؑ سے ہونے والے ان معرکوں میں شام ایک طرف تھا اور تمام صحابہ کرام سمیت پوری اسلامی دنیا دوسری طرف تھی۔

۳۔ علامہ صاحب کا یہ کہنا کہ امیر معاویہ کی طرف سے غلطی کو متعین کرنا غلط ہے قرآن وسنت کی نص کے خلاف ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سیرت اور حدیث کے معتبر ترین مجموعوں میں مکمل تواتر اور صحت کے ساتھ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس کی تصدیق وتوثیق تمام اہل نظر نے کی ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمار یاسر سے فرمایا تھا کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔ پس جب حضور مقبولؐ نے امیر شام اور ان کے حواریوں کو باغی گروہ کے نام سے یاد کیا تو قول رسول مقبولؐ

کے بعد کسی مسلمان دانشور کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس کے اوپر اپنا نظریہ تھوپے۔ دوسری طرف قرآن کریم سورہ حجرات(۴۹) آیت نمبر ۹ میں اس وقت تک باغیوں سے جنگ کا حکم دیتا ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالی کے حکم پر نہیں پلٹ جاتے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف جنگ لڑنے لگیں تو ان میں مصالحت بر قرار کرو۔ پس اگر ایک گروہ دوسرے کے خلاف بغاوت کرے تو اس کے خلاف جنگ کرو جو اہل بغاوت ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی جانب پلٹ جائے۔" (حجرات۔ ۹)

اس آیۂ کریمہ میں مسلمانوں کے دو متحارب دھڑوں کے درمیان مصالحت بر قرار کرنے اور صلح صفائی کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ان میں سے باغی گروہ کے خلاف اس وقت تک نبرد جاری رکھنے کی تاکید کی گئی ہے جب تک کہ وہ ظلم و تجاوز اور بغاوت و سرکشی سے ہٹ کر اللہ تعالی کے حکم کی جانب واپس نہیں پلٹ جاتا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عالم اسلام کو امام حسنؑ سے بیعت کئے اور آپ کی خلافت کو قائم و دائم ہوئے کئی ماہ گذر چکے تھے۔ ایسے موقع پر امیر شام ساٹھ ہزار افواج کے ہمراہ عراق پر حملہ آور ہوئے یقیناً یہ امام حسنؑ کے حق خلافت کے خلاف کھلا تجاوز تھا۔ اس سے پہلے اپنے متعدد خطوط میں امام مجتبیٰؑ انہیں بغاوت و سرکشی کے اس راستے کو ترک کر کے تقویٰ اختیار کرنے اور اپنی بیعت کے زمرے میں شامل ہونے کی متعدد تاکیدیں کر چکے تھے۔ باغیوں کے بارے میں اسلام اور قرآن کا یہی اٹل حکم تھا جس کی رو سے حضرت علیؑ اور دوسرے صحابہ کرام نے ان کے خلاف جنگ لڑی تھی اور اللہ سبحانہ و تعالی کے اسی قانون کے مطابق امام حسنؑ نے امیر شام سے مکمل طور پر دفاعی جنگ کی تھی اور ہر اول دستہ کو شام کی سرحدوں پر روانہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی مدائن تک پیشقدمی کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب ان کی سپاہ نے نالائقی کا ثبوت دیا اور اس کے سرداروں نے ان سے خیانت کی اور یہ واضح ہو گیا کہ ان کی سپاہ اہل شام کے خلاف مقابلے کی توان نہیں رکھتی تو امام حسنؑ قرآن کے اس حکم کو نافذ نہ کر سکے چنانچہ امت مسلمہ کو بلاوجہ کی خونریزی اور انتشار سے بچانے کے لئے ان کی صلاح صلح پر ٹھہری۔ قرآن کریم سورہ نساء۔ ۵۹ میں فرماتا ہے

یایھا الذین آمنوا آطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم (نساء۔ ۵۹)

(ترجمہ) اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبان اقتدار ہوں۔

اگرچہ اس آیۂ کریمہ میں اولی الامر کی تفسیر میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے لیکن ان میں سے ہر تفسیر کے مطابق امام حسنؑ اولی الامر کے مصداق ہیں۔ ایک قانونی حکمران ہوتے

کی حیثیت سے بھی امیر شام پر امام حسنؑ کی اطاعت فرض تھی اس لئے کہ صلح سے پہلے یعنی رمضان ۴۰ ہجری سے لے کر جمادی الاولی ۴۱ ہجری تک امیر شام ابھی عالم اسلام کے مطلق العنان حاکم نہ بنے تھے۔ بہر حال اولی الامر کی تفسیر میں تین قول نقل کیے گئے ہیں:

۱۔ اس سے مراد ہر وہ حکمران ہے جو زمام اقتدار سنبھال لے۔

۲۔ اس سے مراد خلفائے راشدین ہیں جو حکومت کے علاوہ دینی زعامت سے برخوردار تھے اور آیۂ کریمہ اس وقت تک ان خلفاء کو واجب الاطاعت قرار دیتی ہے جب تک کہ ان کا حکم قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ اولی الامر سے مراد بارہ امام ہیں۔ ان کی اطاعت مطلقاً فرض ہے اس لئے کہ وہ عصمت سے برخوردار تھے۔ یہ قول شیعوں سے مخصوص ہے۔

اگرچہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ذکر کرنے اور مطلق اطاعت کا حکم دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولی الامر صرف صاحبان اقتدار نہیں بلکہ اس میں دینی پیشوائی اور امام ہونا بھی شامل ہے۔ لیکن تینوں اقوال کے مطابق امام حسنؑ اولی الامر تھے اس لئے کہ وہ زمام اقتدار سنبھال چکے تھے اور عالم اسلام کے حکمران بنے انہیں کئی ماہ گزر گئے تھے۔ امام حسنؑ آخری خلیفہ راشد بھی تھے اس لئے کہ ان کا انتخاب شوریٰ کے نتیجہ میں عمل میں آیا تھا اور ان کے اقتدار سے مستعفی ہو جانے کے بعد خلافت نے ختم ہونا تھا اور ملوکیت نے اس کی جگہ لینی تھی۔ بہر صورت وہ دینی زعامت سے برخوردار تھے اور اسی لئے ان کی جانب سے اپنی بیعت کرنے اور تمام مسلمانوں کے زمرے میں شامل ہو جانے کی ہدایت قرآن و سنت کے عین مطابق تھی اور اس سے انتشار و افتراق کا دروازہ مکمل طور پر بند ہو سکتا تھا۔ تیسرے قول کے مطابق جو شیعوں سے منسوب ہے امام حسنؑ دوسرے امام تھے اور ان کی اطاعت فرض تھی۔ پس اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس آیۂ کریمہ کی رو سے دینی زعیم خلیفۂ رسول اور اسلامی دنیا کے مقتدر حکمران (تینوں اقوال) ہونے کی حیثیت سے کہ جس کی سربراہی کو تمام مسلمان ریاستیں قبول کر چکی تھیں، امیر شام کا فرض بنتا تھا کہ امام حسنؑ کی اطاعت کرتے۔ لیکن جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو یہ ماننے میں کوئی حرج نہیں کہ شام سے ہونے والی اس کشمکش میں امام حسنؑ حق بجانب تھے۔ وہ خلافت کے ہر معیار پر پورے اتر چکے تھے۔ ارباب حل و عقد نے اسی لیاقت و شائستگی کے باعث انہیں مکمل اتفاق کے ساتھ منتخب کیا تھا اور اس پر آشوب اور نازک دور میں چھ ماہ تک خلافت کو بہترین طریقے پر چلا کر انہوں نے اپنی سیاست دکیاست اور انتظامی امور میں اپنی گرفت کو ثابت کر دیا تھا۔ پس واضح ہو گیا کہ والی شام و مصر کی مخالفت سے امام حسنؑ

کی خلافت راشدہ یا آخری خلیفہ ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔

حدیث نبویؐ

یوں تو تاریخ اسلام میں سیدنا امام حسنؓ کی خلافت ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار کسی اہل نظر کو زیب نہیں دیتا۔ اور رائج اصطلاح کے مطابق امام حسنؓ آخری اور پانچویں خلیفۂ راشد ہیں لیکن سنت و احادیث میں بھی ان کے آخری خلیفہ ہونے کا ٹھوس ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ اہلسنت والجماعت کے مشائخ اور احادیث کے ناقلین نے صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں سے اس ضمن میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم سفینہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ یہ حدیث نبویؐ امام حسنؓ کے خلیفہ راشد ہونے پر مہر نبوت لگا دینے کے مترادف ہے۔ اس ضمن میں حافظ ابن کثیر "البدایہ والنہایہ فی الاسلام" میں مذکورہ ذیل عبارت لکھتے ہیں۔ :

"حسن علیہ السلام کے خلیفہ راشد ہونے کی دلیل وہ حدیث نبویؐ ہے جسے ہم نے دلائل نبوت میں سفینہ سے نقل کیا ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم تکون ملکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی پھر اس کے بعد شہنشاہی (ملوکیت) ہو گی۔" (۴)

حافظ ابن کثیر مزید لکھتے ہیں :

"بلا شبہ یہ تیس سال حسن بن علیؓ کی خلافت پر پورے ہو گئے جب ربیع الاول ۴۱ ہجری میں وہ مستعفی ہو گئے تھے۔ آنحضرتؐ کے وصال سے لے کر اس وقت تک تیس سال بنتے ہیں کیونکہ جناب رسالت مآبؐ کا وصال ربیع الاول ۱۱ ہجری کو ہوا تھا۔

محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور مورخین و محققین نے بھی امام حسنؓ کے خلیفۂ راشد ہونے پر تاکید کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالسلام ترمانینی، ڈاکٹر ایس۔ ایچ ایم۔ جعفری اور شاہ معین الدین ندوی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ (۵) لیکن مجموعاً جن لوگوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس تیس سالہ دور میں امام حسنؓ کے چھ سے آٹھ ماہ پر مشتمل عہد خلافت کو بھی شامل کیا ہے اور اس کے بعد خلافت کا دروازہ بند کرنے کی صراحت کی ہے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

حافظ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ فی الاسلام)

ابن خلکان (وفیات الاعیان)

حافظ ابن عساکر (تاریخ دمشق الکبیر)
ابن صباغ مالکی (الفصول المہمہ)
مورخ مسعودی (مروج الذہب)
ابو بکر دواداری (کنز الدرو جامع الغرر)
عبد القادر بدران (تہذیب تاریخ دمشق)
ڈاکٹر سید محمد وکیل (الامویون بین الشرق والغرب) (۶)

امام حسنؑ کی خلافت پر مشتمل اس حدیث نبوی کا اعتبار مزید یوں بڑھ جاتا ہے کہ اسے صحاح ستہ کی مذکورہ ذیل کتابوں میں نقل کیا گیا ہے:

سنن الترمذی (کتاب الفتن) (۷)
مسند امام احمد بن حنبل (حدیث ابی عبد الرحمن سفینہ) (۸)
سنن ابی داؤد (کتاب السنن) (۹)

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور صراحت کے ساتھ اس کی وثاقت کی ہے۔ تاہم حدیث نقل کرنے کے بعد صحاح ستہ کے ناقلین اپنی جانب سے یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ خلافت راشدہ کا یہ تیس سالہ دور حضرت علیؑ کی چھ سالہ خلافت پر ختم ہو گیا۔ اگر یہ قول صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دو بنیادی مسائل پیش آتے ہیں:

۱۔ حضرت علیؑ کی شہادت اس قول کے مطابق ربیع الاول ۴۱ ہجری کو پیش آنی چاہئے حالانکہ تاریخ وسیرت میں اس ضمن میں رتی برابر بھی کوئی شبہ نہیں کہ حضرت علیؑ کی شہادت رمضان المبارک ۴۰ ہجری میں ہوئی تھی اور ان کا عہد خلافت پانچ سال کچھ ماہ پر محیط تھا۔

۲۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس حدیث میں فرمایا تھا کہ یہ تیس سالہ دور تکمل ہونے کے بعد ملوکیت کا آغاز ہو گا اس حوالہ سے روایت کے ناقلین کو عہد امام حسنؑ کو ملوکیت میں شامل کرنا پڑے گا حالانکہ ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی مسلمان چاہے اس کا تعلق کسی فرقے سے کیوں نہ ہو امام حسنؑ کے عہد خلافت کو ملوکیت میں شامل کرنے پر رضامند ہو۔

پس اگرچہ حدیث کے ناقلین نے اس حدیث کی تطبیق میں غلطی کی ہے جیسا کہ اس امر کی جانب مسند امام احمد میں بھی اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس سے حدیث کے نقل کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کو سند اور حجت کا درجہ حاصل ہے وہ صرف حدیث کے وہ الفاظ ہیں جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کئے گئے ہیں اور ان کے لئے راوی کا ثقہ اور قابل اعتماد ہونا کافی ہے لیکن اس تیس سالہ دور کی تطبیق کہ جسے روایت میں

نقل کیا گیا ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمائی بلکہ خود صحاح ستہ کے راوی نے کی ہے اور وہ اس میں غلطی کر سکتا ہے۔ مزید برآں حافظ ابن کثیر نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن اس میں راوی کی جانب سے اس تیس سالہ دور پر کئے گئے تجزیے کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ تیس سالہ دور کو تاریخ کی روشنی میں عہد امام حسنؑ پر منطبق کیا ہے اور اسی خلافت کو آخری اور پانچویں خلافت قرار دیا ہے۔ پس اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کی صحت و وثاقت ثابت ہونے اور صحاح ستہ اور حدیث کے دوسرے مجموعوں میں اس کے نقل کئے جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت صرف تیس سال تک رہے گی اور اس کے بعد ملوکیت شروع ہو جائے گی اور چونکہ تمام اہل تاریخ و سیر کا اتفاق ہے کہ اس تیس سالہ دور میں عہد امام حسنؑ بھی شامل ہے جس کے بعد سے ملوکیت کا آغاز ہوا لہٰذا صحاح ستہ میں راویوں کی طرف سے کئے گئے اس تجزیئے کو ہم تسلیم نہیں کرتے اور اس میں مختصر سی ترمیم کرتے ہیں لیکن اس ترمیم کا خود حدیث نبویؐ سے کوئی براہ راست تعلق نہیں جو اپنی صحت و وثاقت پر باقی ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث میں ایک اور امر قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تیس سالہ دور کو عہد خلافت کے نام سے یاد کیا اور اس کے بعد کے ادوار کو بادشاہی اور ملوکیت کا نام دیا۔ پس بہت سے اسلامی دانشوروں، مشائخ اور اہل نظر کی طرح باقی مسلمانوں کو بھی چاہئے تھا کہ ۴۱ھ کے بعد کے ادوار کو ملوکیت کا درجہ دیتے لیکن ان میں سے کچھ دانشوروں نے اس تیس سالہ دور کو خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار کو خلافت کے نام سے یاد کیا اور اس طرح اموی و عباسی خاندان کے حکمرانوں کو خلیفہ کا لقب دیا حالانکہ اسلامی ادب کا یہ تقاضا تھا کہ حدیث شریف پر عمل کرتے ہوئے اور سنت نبویؐ کو اصل قرار دیتے ہوئے انہیں ایسا کرنے اور ان حکمرانوں کو خلیفہ اور ان کی حکمرانی کے دور کو عہد خلافت کے نام سے یاد کرنے کا حق ہرگز حاصل نہ تھا۔ بہر صورت یہ ایک الگ بحث ہے جس میں ہم زیادہ وارد نہیں ہونا چاہتے لیکن اس مصدقہ حدیث نبوی کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ امام حسنؑ آخری خلیفہ یا آخری خلیفہ راشد ہیں جن کے بعد خلافت کے دروازے بند ہو گئے اور ملوکیت و شہنشاہی شروع ہو گئی۔ امام حسنؑ نے اس حقیقت کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا اور اپنے نانا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو سچا کر دکھایا۔ اپنی خلافت کے چھ سے آٹھ ماہ کامیابی سے گزار لینے کے بعد جب ربیع الاول یا جمادی الاول ۴۱ھ میں انہوں نے امیر معاویہ سے صلح کی تو امیر شام نے ان پر یہ اعتراض کیا کہ وہ خلیفہ بننا چاہتے تھے جبکہ نہ بن سکے۔

فرزند رسولؐ نے اس اعتراض کے جواب میں خلافت وملوکیت کی جامع تعریف کی جو بعد میں اسلامی دنیا کے لئے نمونۂ عمل بن گئی۔ آپؑ نے فرمایا:

"خلیفہ وہ ہوتا ہے جو سنت نبویؐ کو سر مشق بنائے اور طاعت الٰہی کو شعار قرار دے لیکن جو ظلم پر اپنی حکومت قائم کرے اور قوانین الٰہی کو معطل کرے وہ خلیفہ نہیں بلکہ بادشاہ ہوا کرتا ہے۔"(۱۰)

خلافت کی اس جامع تعریف میں فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح کر دیا کہ خلافت حق وانصاف کی بنیاد پر ایسی حکومت قائم کرنے کو کہتے ہیں جس کا بنیادی منشور قرآن و سنت ہو یعنی اس حکومت میں قرآن وسنت کے قوانین کو بالادستی اور حاکمیت حاصل ہو۔ پس خلافت کا تعلق سراغ رسانی کے محکمے قائم کرنے یا فتوحات وکشور کشائی سے نہیں بلکہ ایک ایسی حکومت کے قیام سے ہے جس کا محور صرف قرآن و سنت ہو۔ لیکن جس حکومت کی بنیاد ظلم و زیادتی پر ہو اور جس میں اقتدار کی رسہ کشی شامل ہو اسے خلافت نہیں بادشاہت کہتے ہیں یوں تو بعض مورخین نے اس ضمن میں غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے لیکن مستند اور مصدقہ تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تمام سیاسی اور عسکری دباؤ کے باوجود امام حسنؑ نے امیر معاویہ کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور پہلی بار بادشاہ یا ملک کا خطاب دیا۔ صلح کے موقع پر دیئے گئے اپنے تاریخی خطاب میں امام حسنؑ نے سمجھا دیا کہ قرآن و سنت اور اجماع و شوریٰ کی رو سے وہ مسلمہ خلیفہ تھے اور خلافت ان کا حق تھا لیکن امیر شام کی جانب سے کی گئی مزاحمت اور حالات کے پیش نظر انہوں نے امت مسلمہ کی بہتری اس میں دیکھی کہ اسلامی معاشرے کی ریاست وسربراہی سے دستبردار ہو کر زمام اقتدار امیر معاویہ کے حوالے کر دیں اور خلافت کا دروازہ بند کر دیں اس لئے کہ امیر شام نہ اس دینی مقام کے حقدار تھے اور نہ قرآن و سنت پر پابند تھے کہ خلافت ان کے حوالے کی جاتی۔ خلافت تو ایک دینی زعامت اور روحانی مقام تھا جس میں اقتدار شامل تھا لیکن صرف اقتدار کی طرح ایسی چیز نہ تھی جسے ہر کسی کو منتقل کر دیا جاتا۔ پس اس واقعہ کے بعد سے دنیاوی اقتدار کی سربراہی اور دینی امور کی امامت کے عہدے الگ الگ ہو گئے۔ پہلے یہ دونوں مقام ایک ساتھ تھے اس لئے کہ خلیفہ دینی رہنما بھی ہوتا تھا اور زمام اقتدار بھی اس کے ہاتھ میں رہتی تھی لیکن اس واقعہ کے بعد اب زمام اقتدار امیر شام کے حوالہ کر دی گئی تھی اور دینی امور میں لوگ فرزند رسولؐ امام حسن مجتبیٰ کی جانب رجوع کرتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار ابوہریرہ نے بھی اس موقع پر کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ امام حسنؑ نے جس طرح خلافت وملوکیت کی تعریف کی تھی بالکل اسی طرح ان کی خلافت شروع سے لے

کر آخر تک قرآن و سنت پر استوار رہی۔ اس کا نمایاں ثبوت تاریخ نے اس وقت فراہم کیا جب قیس بن سعد نے بہت سے سپاہیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اللہ کی کتاب اور سنت رسولؐ کے علاوہ اہل شام سے جنگ کو بیعت کی اساس قرار دیا تھا۔ لیکن امام حسن نے اس شرط کو غیر ضروری اور زائد قرار دیا اور فرمایا کہ اللہ کی کتاب اور سنت رسولؐ میں شریعت کا ہر حکم موجود ہے۔ اس کے بعد کسی اور شرط کی جگہ باقی نہیں رہتی۔ (۱۱) چنانچہ آپ نے صرف قرآن و سنت پر بیعت لے کر بتادیا کہ آپ کی خلافت کے یہی دو بنیادی منشور ہیں۔ آپ کی خلافت قرآن و سنت پر استوار ہوئی تھی اور قرآن و سنت کو لے کر آگے بڑھی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف اس حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت کہا جاسکتا ہے جس میں قرآن و سنت کو مرکزیت حاصل ہو۔ اس کے برخلاف امیر معاویہ کی حکومت نہ قرآن و سنت پر استوار ہوئی تھی اور نہ انہوں نے اس کا دعوی کیا۔ انہوں نے تو یہ اعتراف کیا کہ اب تک جو جنگیں انہوں نے لڑیں وہ لوگوں کے دین اور ان کی نماز و زکوۃ کی خاطر نہ تھیں بلکہ مقصود لوگوں پر اقتدار حاصل کرنا تھا۔ تاریخ میں ان کے یہ اظہارات موجود ہیں۔ (۱۲) امام حسنؑ نے اپنے قول و فعل سے خلافت و ملوکیت کے اس فرق کو واضح کرنے اور ان دونوں کے درمیان لکیر کھینچ کر اپنے نانا کی حدیث کو سچا ثابت کرنے میں کوئی کمی نہ رہنے دی۔ تعجب کا مقام ہے کہ اس کے باوجود کچھ دانشور ان دو متضاد چیزوں کو الجھا دیتے ہیں اور عباسی و اموی خاندان کے سلاطین کو خلفاء کا درجہ دیتے ہیں۔ کیا یہ ان کی ایک واضح غلطی نہیں ہے؟

اسلامی آثار سے استفادہ کرتے ہوئے علامہ ابو الاعلی مودودی نے بھی خلافت و ملوکیت کے فرق کو واضح کیا ہے اور اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یوں تو ان کی خدمات لائق تحسین ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ امام حسنؑ اگر تاریخ کے اس نازک دور میں جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قول اور فعل سے خلافت و ملوکیت میں فرق کرنا نہ سکھاتے تو اس دور کے اسلامی حلقے امیر شام کو خلیفہ تسلیم کر لیتے اور اس کے بعد خلافت و ملوکیت ایسا اختلافی اور متنازعہ امر بن جاتا جس کا تصفیہ ناممکن ہو جاتا اور مسلمان اس جھگڑے کو نپٹانے اور خلافت و ملوکیت کے فرق کو سمجھنے سے قاصر رہتے۔

لہذا یہ تعجب کا مقام ہے کہ انہوں نے خلاف و ملوکیت پر ایک کتاب لکھ دی لیکن نہ فرزند رسولؐ کے اس اقدام کا تذکرہ کیا اور نہ ہی امام حسنؑ کے عہد خلافت کو خلافت راشدہ میں شامل کیا۔ پس ایسے میں قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ مودودی کی نظر میں رمضان ۴۰ھ سے لے کر ربیع الاول ۴۱ھ تک کا دور کس میں شامل ہے خلافت میں یا ملوکیت میں؟

اگر خلافت میں تو انہوں نے اس کی صراحت کیوں نہ کی اور اگر ملوکیت میں تو انہوں نے امیر شام کو کیوں پہلا ملک قرار دیا۔۔۔؟

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن' حدیث اور سیرت پر نظر رکھنے والا کوئی عالم دین یا دانشور ہی نہیں بلکہ قرآن و سنت کا ادنی مطالعہ رکھنے والا مبتدی بھی اگر انصاف کی نگاہ اور تعصبات سے ہٹ کر دیکھے گا تو وہ ہرگز امام حسنؑ کے آخری خلیفہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔

اعتراضات

امام حسن علیہ السلام پر بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں۔ ان اعتراضات کا سلسلہ ان کی نجی زندگی سے لے کر ان کے سیاسی اقدامات تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر ان اعتراضات کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیا جائے اس لئے کہ انہیں کتابوں میں لکھ دیا گیا ہے تو پھر ایک خلیفہ کی حیثیت سے ان کا وقار خاصا مجروح ہوگا۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام دشمن عناصر نے اسلام کی مقدس شخصیات اور ان کے مثالی کردار کو جریحہ دار کرنے کی خاصی کوششیں کی ہیں۔
پس ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اعتراضات کی چھان بین کی جائے اور مکمل تحقیق کے بعد ہی انہیں قبول کیا جائے۔ ان اعتراضات میں سے ایک مشہور اعتراض یا الزام امام حسن کا کثرت سے شادیاں کرنے اور طلاق دینے کا مسئلہ ہے۔ اس قسم کی روایات کا شکار شیعہ اور سنی دونوں مکاتب فکر کے مصنفین ہوئے ہیں۔ انہوں نے روایات کی چھان بین اور صحت و سقم کو تولے بغیر انہیں اپنی کتابوں میں نقل کر دیا اور اس کی مختلف توجیہیں کیں حالانکہ وہ اس سے غافل ہو گئے کہ بہت سی روایتوں میں یہ تعداد افسانوی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس مسئلے میں دو نکات قابل غور ہیں۔

ا۔ اگر کثیر ازدواج پر مبنی یہ روایات صحیح ہوتیں تو ان میں یا دوسری تواریخ میں ان ازواج کے نام اور ان سے ہونے والی اولاد کی تفاصیل نقل کی گئی ہوتیں حالانکہ تاریخ آٹھ نو سے زیادہ ازواج کا نام ذکر نہیں کرتی جو کہ اس وقت کے معاشرے میں ایک عام سی بات تھی۔

۲۔ اگر امام حسنؑ کثرت سے طلاق دیتے جیسا کہ ان کمزور روایات میں نقل کیا گیا ہے تو طلاق جو اسلام میں ایک منفور و مکروہ عمل ہے اس پر ان کے خلاف اسلامی معاشرے میں صدائے احتجاج بلند ہوتی اور امام حسنؑ کے حریف آپ کی اس کمزوری کو اچھالتے اور آپؑ کی شخصیت اور وقار کو نقصان پہنچاتے۔ لیکن ہمیں اس قسم کی کسی چیز کا تاریخ میں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

ان دو نکات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی اتنی ہی ازواج تھیں جتنا کہ اس وقت کے معاشرے میں یہ کثرت رائج تھی اور اگر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا اعتراض کیا جائے تو یہ

پورے معاشرے پر عائد ہوتا ہے جس کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ کی ازواج کی تعداد دس کے اندر اندر تھی اس سے زیادہ نہیں تھی۔

امام حسنؑ کی صلح پر بھی اعتراضات کئے گئے ہیں۔ اپنے مقالے "صلح امام حسنؑ" اور کتاب "سیرت امام حسنؑ" میں ہم امام حسنؑ کے سیاسی اقدامات پر تفصیل سے گفتگو کرچکے ہیں۔ لیکن یہاں پر اتنا کہتے چلیں کہ صلح حسن پر صرف اعتراضات نہیں ہوئے بلکہ بہت سے دانشوروں نے اس کا دوٹوک جواب بھی دیا۔ ہم ان میں سے ڈاکٹر طہٰ حسین کی رائے نقل کرتے ہیں۔

"حسن علیہ السلام نے کسی قسم کے خوف یا فکری ضعف کے نتیجہ میں جنگ بندی نہ کی تھی بلکہ ایک طرف سے وہ خون خرابہ پسند نہیں کرتے تھے اور دوسری طرف انہیں اپنے ساتھیوں کی صلاحیتوں میں شبہ تھا۔ (۱۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی دانشور چاہے اس کا تعلق کسی خطہ اور مکتب فکر سے کیوں نہ ہو اگر انصاف سے تحقیق کرے گا تو اسے ان الزامات کی حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ اس نتیجہ تک پہنچے گا کہ امام حسنؑ کے حریف اپنی دیرینہ کوششوں کے باوجود نہ ان کی حیات طیبہ میں کوئی ایسی چیز ڈھونڈ سکے جو قرآن وسنت کے خلاف ہو اور نہ کسی ایسی چیز کو چپکا سکے جس سے ان کا وقار مجروح ہوتا ہو۔ پس جب ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم انہیں پانچویں اور آخری خلیفہ کی حیثیت سے تسلیم نہ کریں۔

مدارک

1- Dr S.H.J.M Jafri, the Origins & Early development of shia Islam, Qom: Ansariyan pub, p.135

۲۔ شاہ معین الدین ندوی، تاریخ اسلام

۳۔ ابن خلدون، مقدمۂ ابن خلدون، ترجمہ راغب رحمانی، کراچی: نفیس اکیڈمی ۱۹۸۶ء صفحہ ۳۰۔۲۰

۴۔ حافظ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ فی الاسلام، بیروت: مکتبۃ المعارف ۱۹۷۴ء، جلد ۶ صفحہ ۲۲۰، جلد ۸، صفحہ ۱۶

۵۔ عبدالسلام ترمانینی، احداث التاریخ الاسلامی، الکویت: مجلس الوطنی للثقافہ، ۱۹۸۸، جلد اول صفحہ ۴۲۰، قال ہو الحسن بن علی بن ابی طالب الہاشمی القرشی ابو محمد خامس خلفاء الراشدین و آخرہم ثانی الائمہ اثنی عشر عندالشیعہ

الامامیہ

۶۔ حافظ ابن کثیر 'البدایہ والنہایہ فی الاسلام' بیروت: جلد ۶ 'صفحہ ۲۲۰۔ جلد ۸ 'صفحہ ۱۶

ابن خلکان 'وفیات الاعیان' قم: منشورات الرضی '۱۹۸۵ء' جلد دوم صفحہ ۶۶

حافظ ابن عساکر 'تاریخ دمشق الکبیر' ترجمۃ الامام الحسن 'بیروت: موسسہ محمودی ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۷۱

ابن صباغ مالکی 'الفصول المہمۃ' نجف: دار الکتب 'صفحہ ۱۳۶

مسعودی 'مروج الذہب' بیروت: دار الفکر '۱۹۸۹ء جلد سوم صفحہ ۷

ابو بکر دواداری 'کنز الدرر وجامع الغرر' القاہرہ: مصادر تاریخ مصر '۱۹۸۱ء' الجزالثالث صفحہ ۳۱۲'

عبد القادر بدران 'تہذیب تاریخ دمشق الکبیر' بیروت: دار احیاء التراث '۱۹۸۷ء جلد چہارم صفحہ ۲۲۲'

ڈاکٹر سید محمد وکیل 'الامویون بین الشرق والغرب' بیروت: الدار الشامیہ '۱۹۹۵ء القسم الاول صفحہ ۲۵

۷۔ ابو عیسیٰ ترمذی 'سنن الترمذی' مصر: مکتبہ مصطفیٰ البابی '۱۹۷۲ء جلد چہارم 'کتاب الفتن (۴۸) حدیث نمبر ۲۲۲۶

۸۔ امام احمد بن حنبل 'مسند امام احمد' بیروت: دار الفکر 'جلد پنجم 'صفحہ ۲۲۰' صفحہ ۲۲۱

۹۔ ابو داؤد 'سنن ابی داؤد' بیروت: دار احیاء السنہ 'جلد چہارم 'کتاب السنن' صفحہ ۲۲۱ حدیث نمبر ۴۶۴۶

۱۰۔ S.H.M Jafri, The Origins & Early Development p.154

ابو الفرج 'مقاتل الطالبین' نجف: مطبعہ حیدریہ '۱۹۶۵' جلد اول 'صفحہ ۴۷

محب الطبری 'ذخائر العقبیٰ' قاہرہ: مکتبہ القدسی '۱۳۵۶ھ صفحہ ۱۴۰

البیہقی 'المحاسن والمساوی' مصر: محمد امین خانجی صفحہ ۶۳

ابن ابی الحدید 'شرح نہج البلاغہ' قاہرہ: دار احیاء الکتب 'جلد ۱۶ '۱۹۶۲ء' صفحہ ۴۹

کامل السلطاوی 'الامام الحسن بن علی' قاہرہ: جمہوریہ مصر العربیہ وزارۃ الاوقاف ۱۹۹۴ء 'صفحہ ۱۲۲

۱۱۔ طبری 'تاریخ الطبری' بیروت: دار الکتب العلمیہ '۱۹۸۸ء' جلد سوم 'صفحہ ۱۶۴

ابن اثیر 'الکامل فی التاریخ' بیروت: دار احیاء التراث العربی '۱۹۸۹ء' جلد دوم صفحہ ۴۴۳

ابن خلدون 'تاریخ ابن خلدون' بیروت : موسسہ الاعلمی '۱۹۷۱ء جلد دوم صفحہ ۱۸۶
۱۲۔ شیخ مفید 'کتاب الارشاد' تہران : انتشارات علمیہ 'جلد دوم صفحہ ۱۱
بلاذری 'انساب الاشراف' بیروت : دار التعارف '۱۹۷۷ء جلد سوم صفحہ ۴۶
ابو الفرج 'مقاتل الطالبین' نجف : مکتبہ الحیدریہ '۱۹۶۵ء جلد اول صفحہ ۴۵
۱۳۔ طہٰ حسین 'اسلامیات' الفتنۃ الکبریٰ '(علی وبنوہ) بیروت : دار العلم ۱۹۹۱ء
صفحہ ۹۷۸

صلح امام حسن علیہ السلام

صلح امام حسنؑ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا گیا۔ مختلف سطح اور رجحانات کے مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے اس تاریخی حقیقت پر قلم فرسائی کی۔ لیکن تحقیق کے اصولوں سے انصاف نہ ہو سکا اور عقیدے کا عنصر غالب رہا۔ اس باب میں ہم نے بہت سے ایسے مصدقہ تاریخی حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو پس پردہ چلے گئے تھے۔

کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے اس لئے صلح کی تھی کہ وہ راحت طلب، آرام پسند اور عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کے روادار تھے۔ یہ قول تاریخ میں کسی قسم کی اہمیت کا حامل نہیں اس لئے کہ مستشرقین (Orientalists) اور چند جدید دور کے لکھنے والوں نے انتہائی کمزور روایات کو بنیاد بنا کر اس طرح کی خیال آرائیاں کی ہیں۔ (۱) یوں تو اس صنف کے لوگ قارئین کو اپنے اس نقطہ نظر کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تاریخ اسلام کا ادنیٰ فہم رکھنے والا بھی اس قول کے بے بنیاد اور خلاف حقیقت ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس کے بر خلاف کچھ تاریخی ذرائع میں امام حسنؑ کو امن پسند، صلح کا حامی اور نرم خو انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو شروع سے سیاست و حکومت سے بیزار دکھائی دیتے ہیں اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان خون کا ایک قطرہ بہنے کے بھی مخالف ہیں۔ (۲) تاریخ کے ان دفاتر میں امام حسنؑ کا احترام کیا گیا ہے اور انہیں امت مسلمہ کے درمیان موجود اتحاد کے ایک داعی کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ وہ نتائج ہیں جنہیں تاریخ و سیرت پر قلم اٹھانے والوں نے صلح امام حسن اور اس سے متعلقہ واقعات سے اخذ

کیا ہے لہذا یہ آراء اتنی معتبر اور قیمتی نہیں جتنا اعتبار اور وزن خود ان تاریخی حالات و واقعات اور امام حسن کے سیاسی اقدامات کو حاصل ہے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں تاریخ میں سند کی حیثیت حاصل ہے۔ پس اس مختصر سے مقالے میں ہم کوئی جدید نظریہ پیش نہیں کرنا چاہتے بلکہ مستند تاریخ کی روشنی میں اس وقت کے حالات کا جائزہ لے کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا امام حسن ویسے ہی ہیں جیسا کہ ان مورخین نے ان کے بارے میں رائے قائم کی ہے یا حقیقت کچھ اور ہے۔ لہذا اس رائے کا وزن معلوم کرنے کے لئے جس میں امام حسنؑ کو صرف صلح و آشتی کا علمبردار بتایا جاتا ہے ہمیں اجمالی طور پر اس دور کی تاریخ یعنی رمضان المبارک ۴۰ ہجری سے لے کر جمادی الاول ۴۱ ہجری تک کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اور ان واقعات کی جانب اشارہ کرنا پڑے گا جن کا اختتام صلح پر ہوا۔

پس جس سوال کا جواب ہمیں مستند تاریخ یا تاریخی واقعات کے تجزیہ سے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہے کہ کن اسباب و عوامل کی بنا پر امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے صلح کی تھی؟

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہؑ کے بڑے فرزند تھے۔ مسجد کوفہ میں تلوار کی ضرب لگنے کے نتیجے میں ان کے والد حضرت علیؑ ۲۱ رمضان ۴۰ ہجری کو اس دار فانی سے وداع کر گئے تھے۔ اسی دن امام حسن کو دار الخلافہ میں موجود چالیس ہزار لوگوں نے ایک زبان ہو کر خلافت کے لئے منتخب کیا تھا جو دور دراز کے علاقوں سے حضرت علیؑ کی شہادت کا سوگ منانے اور نئے خلیفہ سے بیعت کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ یہ اتفاق صرف شہر کوفہ کے لئے نیا نہ تھا بلکہ اسلامی خلافت کی تاریخ میں نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد اس قسم کا اتفاق و اتحاد دیکھنے میں آیا تھا۔

استاد ایس۔ ایچ۔ ایم جعفری لکھتے ہیں:

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے صحابہ نے جو کہ ابھی تک کوفہ میں ساکن تھے اس انتخاب میں ضرور حصہ لیا ہوگا اور مستقبل کے خلیفہ کی حیثیت سے امام حسنؑ سے بیعت کی ہوگی اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ ضرور ہمیں اس انتخاب اور تقرر کے بارے میں ان کی مخالفت سے آگاہ کرتی۔ اس حقیقت میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح جب مکہ و مدینہ کے لوگوں کو اس واقعہ کی خبر ملی ہوگی تو انہوں نے تہہ دل سے اس انتخاب کو پسند کیا ہوگا یا اس پر اظہار رضایت کیا ہوگا اگر ایسا نہ ہوتا تو ان شہروں میں اس تقرر کے خلاف احتجاج کی صدا بلند ہوتی حالانکہ تاریخ میں اس حسن انتخاب کے خلاف ایک بھی اعتراض یا احتجاج کا پتہ نہیں ملتا۔ (۳)

تاریخ ابن اثیر میں نقل کیے گئے ایک اقتباس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مکہ و مدینہ کے لوگوں

نے طاقت کے زور پر امام حسنؑ سے بیعت کی تھی۔(۴) لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے۔اس کی دو وجوہات ہیں۔

ا۔ استاد جعفری کے بقول اگر ایسا ہوتا تو اسلام کی اس وسیع مملکت کے گوشہ وکنار میں کہیں تو اس تقرری کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونی چاہئے تھی۔

۲۔مکتہ المکرمہ اور مدینہ منورہ کے لوگ فرزند رسولؐ سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کی عبادت وریاضت' حسن خلق اور کمالات کے دلدادہ تھے۔وہ اس دور کو ہرگز نہ بھولے تھے جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دو بچوں سے غیر معمولی محبت وعطوفت کا اظہار کرتے تھے اور انہیں غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔سیرۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس پہلو کا انعکاس اہلسنت اور شیعہ احادیث کے دفاتر میں تواتر سے ہوا ہے۔نیز خلفائے راشدین کے دور میں بھی انہیں اسلامی معاشرے میں غیر معمولی مقام حاصل تھا یہاں تک کہ حضرت عمر انہیں بدری اصحاب کے برابر بیت المال میں سے حصہ دیتے تھے۔پھر حضرت علیؑ کے عہد خلافت میں انہوں نے جس حسن خوبی سے تمام ذمہ داریوں کو نبھایا اور مسلمانوں کی خدمت کی اور ان میں اسلامی اقدار اور سنت رسولؐ کو زندہ کیا یہ سب اچھی طرح ان کے ذہن نشین تھا۔لہذا کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ فارس' یمن' بصرہ اور دوسری ریاستیں بخوشی تو امام حسنؑ سے بیعت کرلیں لیکن حجاز کے لوگ یہ بیعت تلوار کی نوک پر کریں بلکہ انہوں نے تو اوروں سے بڑھ کر اس حسن انتخاب کی داد دی ہوگی۔

بہر صورت اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تمام ریاستیں امام حسنؑ کے تابع ہوگئیں جو ان کے والد حضرت علیؑ کے زیر نظر تھیں۔ صرف شام اور مصر آپ کی بیعت کے زمرے میں شامل نہ ہوئے۔ایک خلیفہ کی حیثیت سے اہل عراق کی جانب سے امام حسن کا انتخاب اور حجاز 'یمن' فارس اور دوسری اسلامی ریاستوں کی جانب سے اس کی تائید اور حمایت شام کے خود مختار حکمران امیر معاویہ کے لئے خوشایند نہ تھی جو خود اس مقام کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔امیر شام نے اس انتخاب کی مخالفت کی اور بہت جلد اس خلافت کے خلاف سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔ انہوں نے کوفہ میں موجود اپنے سے منسلک خبررساں حلقوں کو مزید سرگرم کیا اور فارس کے گورنر کو تہدید آمیز خطوط بھیجے لیکن وہاں کے گورنر زیاد بن ابیہ ان کی دھمکیوں میں نہ آئے اور صلح کے بعد تک امام حسنؑ سے وفادار رہے۔(۵)

امام حسنؑ کے خطوط

امام حسن علیہ السلام تاریخ اسلام کے انتہائی نازک دور میں خلیفہ بنائے گئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب کوفہ کی عسکری طاقت مفلوج ہو گئی تھی۔ اندرونی جنگوں اور بصرہ و حنین و نہروان اور دوسری لڑائیوں نے عراق کی اس فاتح افواج کی کمر توڑ دی تھی۔ یہ وہی فوج تھی جس نے فارس کی سپر پاور کو زیر کیا تھا' شکست کا ہر گز منہ نہ دیکھا تھا اور آخری وقتوں تک بھی جہاں کہیں اس کی ایک بٹالین حرکت کرتی تو چاروں طرف رعب' وحشت اور لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ سپاہ اب مضمحل' خستہ اور ناتواں ہو گئی تھی۔ ان تمام اندرونی معرکوں میں جو زیادہ تر عہد مرتضوی میں ہوئے تھے اس سپاہ کو کوئی مال غنیمت ہاتھ نہ آیا تھا بلکہ اس کے برخلاف قیمتی ترین انسانی اور مالی قربانیاں دینا پڑی تھیں۔ اور نہروان کی جنگ میں تو یہ عراق کی سپاہ آپس میں ایک دوسرے کے سامنے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس نے کسی جوان بیٹے یا گھر کے سرپرست و بوڑھے کا داغ نہ دیکھا ہو۔

امام حسنؑ جانتے تھے کہ اس سپاہ کو تنظیم نو کی ضرورت ہے اور دوسری طرف سے یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ امیر شام اس نازک وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور عراقی افواج کی تعمیر نو کی فرصت چھین سکتے ہیں لہٰذا انہوں نے سفارتی اور سیاسی حلقوں کے ذریعے سے امیر معاویہ پر یہ دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان سے بیعت کر لیں اور ان کی خلافت کو تسلیم کر لیں اس لئے کہ پوری امت مسلمہ ان سے بیعت کر چکی ہے۔ سیدنا امام حسنؑ نے امیر شام کے نام اپنے خطوط کا جو سلسلہ شروع کیا اس میں اسلامی قوانین اور قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی حقانیت اور اپنی خلافت کے قانونی ہونے کا مکمل اور ٹھوس ثبوت فراہم کیا گیا تھا۔ ان دلائل کی روشنی میں انہوں نے امیر معاویہ پر ثابت کر دیا کہ وہ سراسر غلطی اور گمراہی پر ہیں اور انہیں اس راستے کو ترک کر دینا چاہئے اور مسلمانوں کا خون بہانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ خطوط کے اس ردوبدل کے ذریعے انہوں نے ایک طرف امیر شام کی توجہ مشغول رکھی اور دوسری طرف ڈپلومیسی کے اس اصول اور امن پسند سیاست کے ذریعے سے رائے عامہ اور میڈیا کو اپنا حامی اور ہمنوا بنا لیا اس لئے کہ اسلامی دنیا کو معلوم ہو گیا کہ شام کے گورنر سے ہونے والی اس کش مکش میں وہ حق بجانب ہیں۔ اتمام حجت کے علاوہ اس طرح آپ اپنے حریف پر سیاسی دباؤ ڈالنے میں بھی کامیاب رہے اور آپ کو یہ فرصت بھی مل گئی کہ اپنی فوجوں کی تنظیم نو کی جانب توجہ دیں اور اپنی خلافت کے پانچ یا چھ ماہ کسی تلخ یا ناگوار حادثہ کے بغیر گزار سکیں۔ ابو الفرج اصفہانی لکھتے ہیں کہ آپ نے اپنے

سپاہیوں کی تنخواہ میں سو سو درہم کا اضافہ کیا۔ آپ کے بعد آنے والے تمام حکمرانوں نے اس کی پیروی کی اور اس طرح اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لئے اس حسنی سنت کو اپنایا۔(٦)

اس ضمن میں ہم امام مجتبیٰ کے ایک خط کا اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو آپ نے امیر شام کے نام لکھا:

"..... پس باطل اور جھوٹ کے راستے پر اڑنا چھوڑ دو اور باقی لوگوں کی طرح تم بھی میری بیعت کرلو اس لئے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور ہر ذی فہم انسان کی نظر میں یقیناً میں تم سے زیادہ خلافت کا سزاوار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو' اس سے ڈرو اور خود کو بغاوت کرنے اور ناحق' مسلمانوں کا خون بہانے سے بچاؤ۔"(٧)

اگرچہ یہ خط قدرے تلخ ہے لیکن امام حسن کی جرات و شہامت کا آئینہ دار ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام حسن کا دعویٰ حقانیت پر مبنی تھا اور وہ امت مسلمہ کو اختلاف اور خونریزی سے بچانا چاہتے تھے لہذا امیر معاویہ سے پرزور مطالبہ کرتے تھے کہ وہ بھی ان کی بیعت کرلیں تاکہ امت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔

آخری خلیفہ کو خلافت سنبھالے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا لیکن ان کے عزائم اور سیاسی و انتظامی امور پر ان کی گرفت سے امیر معاویہ نے مکمل اندازہ لگالیا تھا کہ وہ ہرگز ان کے سامنے تسلیم نہ ہوں گے اور ہرگز انہیں خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے قبول نہ کریں گے۔ امیر شام کے پاس اب صرف ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ کوفہ میں موجود سیاسی فضا' کوفہ کی سیاسی خستہ حالی' اقتصادی بحران اور عسکری نزاکت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عراق پر حملہ کردیں اور طاقت کے بل بوتے پر امام حسنؑ کو اپنے ارادوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیں۔ وہ ایک عرصۂ دراز سے ایک ایسی وسیع فوج کی تیاری میں مشغول تھے جو صرف ان کے حکم کے تابع ہو۔ لہذا ابھی امام حسنؑ کو خلافت سنبھالے چار یا پانچ ماہ نہ گزرے تھے کہ امیر شام ساٹھ ہزار مسلح سپاہیوں کے ساتھ عراق پر ایک وسیع حملے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

ظاہر ہے کہ یہ خبر ایک ایسے خلیفہ کے لئے ضرور پریشان کن ہوگی جو ایک نازک دور سے گزر رہا ہو اور خلیفہ بنے ہوئے اسے ابھی چند ماہ سے زیادہ نہ گزرے ہوں لیکن ایک اسلامی خلیفہ کی حیثیت سے اور اسلام کے وضع کردہ قوانین کی روشنی میں یہ امام حسنؑ کا فرض تھا کہ آپ ان لوگوں کے جان' مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کریں اور ان ریاستوں کی سالمیت اور خودمختاری کا دفاع کریں جنہوں نے آپ سے بیعت کی تھی اور باغیوں کے خلاف جنگ کریں اگرچہ آپ سے اس خلافت کو مستحکم کرنے اور اپنی افواج کی تنظیم نو کی فرصت چھین لی گئی

تھی اور اس تھکی ہاری فوج کو میدان جنگ میں نکال لانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ آپ نے صحابی رسولؐ حجر بن عدی کو مختلف ریاستوں کے سربراہوں کی جانب روانہ کیا تاکہ وہ اس مشکل کی ہر ممکنہ چارہ جوئی کریں۔ لوگوں کو مسجد کوفہ میں جمع ہونے کے لئے کہا گیا اور جب سب جمع ہو گئے تو امام حسنؑ نے اس نازک موقع پر تاریخی خطاب کیا۔ اپنے اس خطاب میں انہوں نے لوگوں کو امیر شام کے تجاوزات کا بھرپور مقابلہ کرنے اور اپنی جان، مال، عزت اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے نکل کھڑے ہونے کی ضرورت پر زور دیا۔ کوفہ کے لوگ سیاسی و معاشرتی زوال کا شکار تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ اب ان کی اخلاقی و روحانی حالت بھی چنداں بہتر نہ رہی تھی وہ درہم و دینار کے غلام بن چکے تھے اور انہوں نے آپ کے والد حضرت علیؑ کو بھی خاصا مایوس کیا تھا۔ نیز جھگڑے، پھوٹ، نفاق اور اختلافات بھی غیر معمولی حد تک بڑھ چکے تھے۔ لہٰذا ایسے میں امیر شام کے ہزاروں مسلح سپاہیوں کا خوف ان کے وجود پر چھا گیا اور انہوں نے فرزند رسولؐ کی اس دعوت کا استقبال نہ کیا بلکہ خاموشی ان کے وجود پر چھائی رہی۔ خوف اور ڈر کی اس فضا کو حاکم کرنے میں ان قبائلی سرداروں نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا جو اپنے مفادات کے تابع تھے۔ صفین کی لڑائی میں یہ لوگ غیر جانبدار رہے تھے لیکن اب ان کے رجحانات کسی اور جانب تھے۔ صحابی رسولؐ عدی بن حاتم نے اس سناٹے کو توڑا اور فرزند رسولؐ کی اجابت نہ کرنے پر اہل کوفہ کی سخت مذمت کی۔ انہوں نے ایک زبردست تقریر کی جس میں عراقیوں کی غیرت و حمیت کو للکارا۔ ان کے بعد سعد بن عبادہ کے فرزند قیس اور سعید بن قیس نے بھی جوشیلی تقاریر کیں اور لوگوں کو نواسۂ رسولؐ کی حمایت کرنے کا احساس دلایا۔ (۸) جنگ جمل میں بھی کوفہ اسی کش مکش کا شکار رہا تھا اور مختلف وفود بھیجنے کے باوجود بھی اس شہر نے حضرت علیؑ کی حمایت کا اعلان نہ کیا تھا۔ لیکن امام حسن کی تقریر اور ان کے جاذب نظر بیانات کے بعد اس شہر نے ہزاروں سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر حضرت علیؑ کی حمایت میں روانہ کیا تھا۔ پس کوفہ کے لوگ امام حسنؑ کو دل سے چاہتے تھے لیکن جنگ کے لئے ان حالات میں نکلنا آسان کام نہ تھا۔ بہر صورت اس طویل خاموشی کے بعد قدرے سستی سے کوفہ نے جنگ کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ اس فیصلے کو قبول کروانے میں امام حسنؑ کے ان باوفا اصحاب کی خدمات تاریخ میں محفوظ رہیں گی۔

مستشرقین میں سے کچھ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ امام حسنؑ کے کچھ ساتھیوں نے انہیں اہل شام کے خلاف جنگ کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن یہ مفروضہ حقیقت کے یکسر خلاف ہے (۹) اس لئے کہ قیس بن سعد جیسے نمایاں اور اہم سردار جن کی سرگردگی میں بہت سے بریگیڈ تھے جب وہ بیعت کے وقت امام حسنؑ کو جنگ پر مجبور نہ کر سکے اور امام نے ہر قسم کی مشروط بیعت کو

مسترد کردیا تو اب تمام امور کی زمام سنبھالنے کے بعد کون ایسا کر سکتا تھا۔ جو حقیقت تاریخ پیش کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کوفہ اور دوسری ریاستوں نے امام حسنؑ کے جنگ کے فیصلے کا اس طرح استقبال نہ کیا جو انہیں کرنا چاہئے تھا۔ سرد مہری کا رویہ حاکم رہا اور تمام کوششوں کے باوجود مجموعاً امام پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ سپاہی جمع نہ کر سکے۔

ہراول دستہ:

امام حسن علیہ السلام کی جنگی حکمت عملی' سیاسی اقدامات اور ان کے عہد خلافت میں رونما ہونے والے واقعات پر ہم اپنی کتاب "سیرت امام حسنؑ" (غیر مطبوعہ) میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ مذکورہ باب میں ہم اس موضوع کے تمام مسائل اور مختلف جوانب پر گفتگو نہیں کر سکتے بلکہ صرف ایک اشارہ کر سکتے ہیں۔

اپنی خلافت کے زیر اثر موجود سرحدوں کی حفاظت اور امیر شام کی پیشقدمی روکنے کے لئے امام حسنؑ نے اپنی افواج میں سے بہترین سپاہیوں کا انتخاب کیا اور بارہ ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر ترتیب دے کر اسے عبید اللہ بن عباس' قیس بن سعد اور سعید بن قیس کی سرکردگی میں روانہ کیا (۱۰) بظاہر ایسا لگتا ہے کہ شام کی ساٹھ ہزار مسلح افواج کے مقابلے میں ان بارہ ہزار سپاہیوں کی کیا حیثیت ہوگی لیکن بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کیا کہ یہ دستہ ان افواج کے مقابلے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔

ہراول دستہ (Vanguard) ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اگرچہ کچھ وجوہات کی بنا پر اس دستے کی قیادتی کونسل میں نمایاں حیثیت عبید اللہ بن عباس کو دی گئی تھی لیکن انہیں سختی سے پابند کیا گیا تھا کہ وہ قیس بن سعد اور سعید بن قیس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائیں گے۔ عبید اللہ بن عباس کو سختی سے گوشزد کیا گیا تھا کہ انہیں اس دستے میں موجود سپاہیوں سے تواضع' خاکساری اور محبت سے پیش آنا ہے' اپنی محفلوں اور نشستوں میں انہیں شامل کرنا ہے اور اپنے سامنے درپیش مسائل میں برابر کا شریک ٹھہرانا ہے اس لئے کہ ان میں حضرت علیؑ کے باقی ماندہ مخلص' باوفا اور جانثار مجاہد موجود ہیں جن کے بارے میں امام حسنؑ نے فرمایا تھا کہ ان میں کا ایک سپاہی پوری بٹالین کے برابر ہے۔ (۱۱) ہراول دستے کے چار ہزار سپاہی مخلص اور وفادار تھے اور ان میں سے ایک بڑی تعداد مذکورہ اوصاف کی حامل تھی۔ باقی لوگ قبائلی نظام کے تابع تھے یعنی اگر قبیلہ کا سردار ہراول دستے کی قیادت کا تابع رہے گا تو وہ بھی رہیں گے ورنہ نہیں۔ یہ سردار اسلام اور دین سے زیادہ اپنی ذات اور اپنے قبیلے کے مفادات کے غلام تھے۔

ہر اول دستے میں موجود سپاہیوں کی توصیف میں امام حسنؑ نے ہر گز مبالغے سے کام نہ لیا تھا اس لئے کہ اس دستے کی قیادت میں قیس بن سعد جیسے ماہر' کار آزمودہ اور آخری دم تک لڑنے والے جرنیل موجود تھے اور سپاہ میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اپنی صلاحیتوں کا امتحان دے چکے تھے۔ قیس بن سعد تو حضرت علیؑ کے زمانے میں شرطۃ الخمیس (Shorta-tul-Khamice) کے سردار بھی رہ چکے تھے۔ اس سپاہ کو مرتضوی فوج میں وہی حیثیت حاصل تھی جو کم و بیش آج کل کے دور میں (Presdential Guards) کو حاصل ہوتی ہے۔ جنگ صفین میں اس بریگیڈ نے جس کی اکثریت کا تعلق آذربایجان سے تھا' شام کی افواج پر نا قابل تلافی نقصانات وارد کئے تھے۔ انہیں پسپا کرتے ہوئے یہ لوگ خود امیر شام کے کیمپ تک جا پہنچے تھے۔ (۱۲) بہر صورت اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دستہ میں رزم کے ایسے ماہر شہسوار موجود تھے جن کے وجود سے امیر شام گھبراتے تھے۔ اپنے عسکری فرمان میں امام حسنؑ نے ہر اول دستہ کو اپنی جانب سے متعین کردہ راستہ پر اس وقت تک پیشقدمی جاری رکھنے کا حکم دیا تھا جب تک وہ شام کی فوجوں کے مدمقابل قرار نہیں پاتا۔ آپ نے انہیں اس سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ آپ مدائن شہر کے اطراف میں اپنا عسکری مرکز قرار دیں گے اور جیسے ہی مختلف علاقوں سے رسد پہنچے گی ویسے ہی ان سے آملیں گے۔ ہر اول دستے کو جنگ میں پہل کرنے سے منع کیا گیا تھا لیکن مدمقابل کی جانب سے جنگ شروع کرنے کی صورت میں جوابی کاروائی کا مکمل اختیار حاصل تھا۔

نبرد کا آغاز

امامؑ کے احکامات کے مطابق ہر اول دستہ نے پیشقدمی جاری رکھی اور بہت جلد عراق کی شمالی سرحدوں میں واقع ان سرسبز و شاداب علاقوں میں پوزیشنیں سنبھال لیں جہاں سے اس وقت شام کی سرحدیں شروع ہو جاتی تھیں۔ شام کی افواج کو بھی وہاں پہنچے زیادہ وقت نہ گزرا تھا۔ دونوں افواج کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔ اگلے دن دونوں فوجوں میں مختصر سی جھڑپ ہوئی اور جیسے ہی رات کا پردہ گرا ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قیس بن سعد کو دس لاکھ درہم کی پیشکش ہوئی اس شرط پر کہ وہ امام حسنؑ کی سپاہ کو ترک کر کے شام کی صفوں میں شامل ہو جائیں۔ قیس نے سختی سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ کیا معاویہ انہیں ان کے دین میں دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ (۱۳) اس سے قبل عبید اللہ بن عباس کو بھی اسی طرح کی پیشکش ہو چکی تھی جسے انہوں نے مسترد کر دیا تھا لیکن جب رات زیادہ ہوئی تو عبید اللہ بن عباس کو امیر شام کی جانب سے یہ پیغام موصول ہوا جسے کم و بیش تمام تاریخی ذرائع نقل کرتے ہیں:

"حسن علیہ السلام نے صلح کرنے اور زمام خلافت میرے حوالے کرنے کے بارے میں مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا ہے اگر تم اس وقت میرے زیر نظر آجاؤ گے تو ایک سربراہ کی حیثیت سے تمہارا استقبال کیا جائے گا ورنہ میں تمہاری فوجوں میں نفوذ کر کے تمہیں گرفتار کرلوں گا۔ اگر تم میری صفوں میں شامل ہو جاؤ گے تو تمہیں دس لاکھ درہم دیئے جائیں گے۔ پانچ لاکھ نقد اور باقی پانچ لاکھ کوفہ پہنچنے کے بعد دوں گا۔ (۱۴)

انتہائی معتبر اور مستند تاریخی ذرائع تصدیق کرتے ہیں کہ اس وقت تک امام حسنؑ نے مذاکرات یا صلح کی کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ مدائن میں فارس بصرہ اور دوسرے علاقوں سے مزید رسد پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور اگرچہ امیر معاویہ کی جانب سے صلح کے متعدد پیغامات بھیجے جاچکے تھے لیکن کیونکہ ان کی سپاہ نے ابھی وفاداریاں تبدیل نہ کی تھیں اور ہتھیار نہ ڈالے تھے لہذا انہوں نے ان تمام پیغامات کو مسترد کر دیا تھا اور کسی تاریخ میں ایسا کوئی قول نہیں ملتا کہ امام حسنؑ نے ابتداہی سے امیر معاویہ کو صلح کا پیغام بھیجا ہو نہ اس ضمن میں کوئی مستند اور صحیح روایت ہے اور نہ ہی کسی مورخ نے اس قسم کے کمزور اور بیجان اقوال پر اعتماد کیا ہے۔ پس اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ عبید اللہ بن عباس کو پریشان کرنے اور ہراول دستہ کو شکست دینے کے لئے امام حسنؑ پر یہ جھوٹ باندھا گیا تھا کہ وہ صلح کر رہے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صلح کر لینے کے بعد بھی انہوں نے کبھی امیر شام کو خلیفہ کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا حالانکہ روایت میں ان سے یہ ناروا نسبت دی گئی ہے۔ بہر صورت عبید اللہ اس دھوکہ میں آگئے یا دنیا کی لالچ نے انہیں راہ حق سے دور کر دیا یا ان باتوں کو باور کرنے کے بعد خوف و دہشت ان کے وجود پر چھا گیا۔ چنانچہ رات کے اندھیرے میں وہ اپنے خیمے سے فرار کر کے امیر شام کی صفوں میں شامل ہو گئے اور اپنی اس عجولانہ حماقت اور خیانت سے انہوں نے اس ہاشمی حکومت کو سرنگوں کر دیا جس کی حقانیت کی مہر پورا عالم اسلام لگا چکا تھا۔ اگر وہ امامؑ کی تعلیمات پر عمل کرتے اور قیس بن سعد اور سعید بن قیس کے سامنے اس مسئلے کو رکھتے تو وہ ضرور اس کا راہ حل تجویز کرتے اور انہیں اس مشکل سے نکال لیتے۔ مؤرخ یعقوبی اور مؤرخ بلاذری کے مطابق جانے والوں میں وہ اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ آٹھ ہزار سپاہی بھی اپنے خیموں سے فرار کر چکے تھے۔ (۱۵) یہ قول حقیقت کے قرین دکھائی دیتا ہے اس لئے کہ جب ان قبائلی سرداروں نے ہاشمی حکومت کو سرنگوں ہوتے دیکھا ہو گا اور جب انہیں معلوم ہوا ہو گا کہ ہراول دستہ کے سپہ سالار کی جانب سے غداری ہو رہی ہے اور امام کے چچا اور ہاشمی خاندان کے نمایاں فرد عبید اللہ ہی اپنے قول و قرار کے پابند نہیں تو اپنی جان و مال اور مفادات کے تحفظ کی خاطر انہوں نے بھی شام اور شامیوں

کے درمیان پناہ حاصل کرنا ضروری سمجھ لیا ہوگا۔ اگر عبید اللہ ذہانت کا مظاہرہ کرتے اور امام کی دی گئی تعلیمات پر عمل کرتے تو وہ ان قبائل کو بہتر طور پر استعمال کر سکتے تھے۔

صبح ہوئی اور معمول کے مطابق سپاہی نماز کے لئے جمع ہوئے۔ جب انہیں اندازہ ہوا کہ سپہ سالار اور فوج کا ایک بڑا حصہ غائب ہے تو ان میں خاصی بے چینی پھیلی۔ امام مجتبیٰ کی وضع کردہ ہدایات کے مطابق قیس بن سعد نے ہراول دستہ کی قیادت سنبھال لی۔ نماز کی امامت کرنے کے بعد انہوں نے ایک زبردست تقریر کی جس میں عبید اللہ کی بزدلی اور خیانت کی سخت مذمت کی۔ انہوں نے لشکر کے درمیان موجود ایسے بوالہوس اور ابن الوقت لوگوں کے نکل جانے کو ایک خوشایند امر قرار دیا۔ قیس نے حالات پر اس طرح قابو پایا کہ ابھی ان کی تقریر بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ سپاہیوں نے ایسے مضر افراد کے چلے جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور مرتے دم تک قیس کے ساتھ لڑنے کا عہد کیا۔

ادھر امیر معاویہ اس خیال میں تھے کہ ہراول دستہ کو شکست ہو چکی ہے لہذا انہوں نے بسر بن ابی ارطاۃ کی سرکردگی میں فوج کی ایک ٹکڑی بھیجی تاکہ رہے سہے سپاہیوں کا کام بھی برابر کر دے لیکن ان کی امیدوں کے برخلاف قیس بن سعد نے اس حملے کا وہ دنداں شکن جواب دیا کہ بسر کو پسپائی اختیار کر کے شام کے کیمپوں میں پناہ لینی پڑی۔ اگلے دن صبح ہوئی تو شام کے بیس ہزار سپاہی صفیں جمائے اس رہے سہے ہراول دستے کے سامنے تھے۔ (۱۶) ہراول دستے کے مجاہدوں نے اس مرتبہ بھی جرات و شجاعت کا ثبوت دیا اور شام کے لشکر کو ایک بار پھر ان کے کیمپوں میں پسپا کر دیا۔ اس مرتبہ امیر معاویہ کو مداخلت کرنا پڑی۔ انہوں نے قیس کو متعدد پیغامات بھیجے جن میں انہیں اہل شام سے مذاکرات کرنے اور جنگ بندی کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ قیس نے ان تمام پیغامات کو مسترد کر کے صاف کہہ دیا کہ صرف تلوار ان کے اور امیر شام کے درمیان فیصلہ کرے گی۔ اپنے کچھ پیغاموں میں امیر شام نے قیس کو یہودی ابن یہودی کا خطاب دیا تھا لیکن قیس نے بھی اسی انداز میں انہیں بت پرست ابن بت پرست کا جواب بھجوا دیا تھا۔ (۱۷) بہرحال یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ قیس انہی چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ جن کی توصیف میں امام مجتبیٰ نے کئی سطریں سپرد قلم کی تھیں، امیر شام کی ساٹھ ہزار مسلح افواج کے مقابلے میں ایک تسخیر نہ ہونے والے قلعے کی طرح ڈٹے رہے۔ لیکن اس دوران انہیں ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں مختلف واسطوں سے کثرت سے ایسی خبریں ملنے لگی تھیں جن میں امام حسنؑ کے خیمے پر حملہ ہونے اور ان کے زخمی کئے جانے کا اظہار کیا گیا تھا۔ یوں تو اس قسم کی افواہوں کا گشت کرنا معمول اور روزمرہ کی بات تھی لیکن اس مرتبہ خبروں کی نوعیت سے ایسا

لگتا تھا کہ ضرور امام حسنؑ کو مدائن میں ایک سنگین صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ قیس نے مناسب سمجھا کہ ہراول دستہ کو شام کی افواج پر حملے کے لئے تیار کر کے ان سے یہ فرصت چھین لیں کہ مبادا اس نوعیت کی خبریں ان کے سپاہیوں کے ارادوں کو پست کر دیں۔(۱۸)

یوں دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی اور طرفین کا بھاری نقصان ہوا لیکن اس مرتبہ بھی شام کی افواج ہراول دستہ کو شکست دینے اور ایک انچ بھی پیشقدمی کرنے میں ناکام رہیں۔ معاویہ کے کچھ نمایاں کارندے آگے بڑھے اور انہوں نے قیس کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ کس بنیاد پر ان سے لڑ رہے ہیں اور خودکشی پر تلے ہوئے ہیں اس لئے کہ مصدقہ ذرائع سے انہیں یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ ان کے امامؑ پر خنجر سے حملہ ہوا ہے اور بہت سے سپاہی انہیں چھوڑ کر فرار کر گئے ہیں۔ ان حالات میں قیس کے لئے جنگ جاری رکھنا ناگزیر ہو گیا اس لئے کہ سپاہیوں کو مکمل طور پر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جس محور کے گرد وہ لڑ رہے ہیں اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ چکا ہے اور لوگ اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ بہرصورت قیس کو جنگ بندی پر مجبور کر دیا گیا لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہراول دستہ کو شکست ہو گئی۔ بلکہ طے یہ پایا کہ دونوں فوجیں اس وقت تک اپنی مقررہ جگہوں پر باقی رہیں گی اور جنگ سے پرہیز کریں گی جب تک کہ قیس بن سعد اس ضمن میں خود امام حسنؑ سے کوئی خط یا تازہ ترین اطلاع وصول نہیں کر لیتے۔ پس یہ حقیقت ہے کہ خیانت اور ٹوٹ پھوٹ کے اس عمل کے باوجود ہراول دستہ اپنی ماموریت کو نبھانے میں مکمل طور پر کامیاب رہا۔

امامؑ کے خیمے پر حملہ

مورخ ابو حنیفہ دینوری "الاخبار الطوال" میں جو کہ تاریخ میں ایک منفرد اور اہم مقام سے برخوردار ہے لکھتے ہیں کہ جب امام حسنؑ شہر مدائن سے باہر ساباط نامی علاقے میں پہنچے تو انہوں نے یہ احساس کیا کہ ان کی مختصر سی فوج جنگ کے بارے میں غیر مستعد ہے اور سرد مہری کا رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگ نہیں لڑنا چاہتی۔ اسی دوران امیر شام نے امام حسنؑ سے مذاکرات کے لئے ایک وفد بھیجا۔ گفتگو کرنے کے بعد امام کے خیمے سے باہر نکلتے ہوئے اس وفد کے ارکان نے جاتے جاتے یہ افواہ اڑا دی کہ فرزند رسولؐ معاویہ سے صلح کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔(۲۰) اسی دوران یہ افواہ بھی گشت کرنے لگی کہ قیس بن سعد نے معاویہ سے صلح کر لی ہے(۲۱) لیکن جب یہ خبر پھیلی کہ قیس بن سعد کو شکست ہو گئی ہے اور لشکر والوں کو فرار کر جانا چاہئے(۲۲) تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ لوگوں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ جنگ سے بیزار ان

خستہ حال لوگوں کو ہر اول دستہ میں ہونے والی خیانت کی خبر نے بوکھلا دیا تھالہذا وہ اس طرح کی افواہوں کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کی ساری امیدیں قیس بن سعد سے تھیں لیکن جب قیس کی شکست کی جھوٹی خبر پھیلی تو اس بد حواس سپاہ نے اس خبر کے صحیح یا غلط ہونے کی تحقیق کئے بغیر ہی اسے باور کر لیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس بد نظمی اور انتشار سے خوارج نے بھرپور فائدہ اٹھایا جو کہ حضرت علیؑ کے بدترین دشمن تھے اور اس وقت کی منطق میں انہوں نے امام حسنؑ سے انتقام لینا تھا۔ چنانچہ موقع پا کر انہوں نے امام کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ ان کے نیچے سے بساط کھینچ لی اور ان کی ردا اور ذاتی اثاثہ لوٹ کر لے گئے۔ (۲۳) امام نے فوراً اپنی تلوار نکالی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے وفادار قبائل کو مدد کے لئے پکارا۔ ان کے ساتھی انہیں اس نفا نفسی کے عالم سے نکال کر لے جا رہے تھے کہ ایک خارجی نے جو پہلے سے مورچہ لئے بیٹھا تھا چھپ کر یکایک خنجر سے امام کی ران پر حملہ کیا۔ (۲۴) امام مجتبیٰؑ نے اس کی داڑھی کو اپنی گرفت میں لیا اور اسے اٹھا کر پٹخ دیا لیکن اس سے پہلے ہی خنجر اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ (۲۵) خارجی کو آپ کے ساتھیوں نے اس کے انجام تک پہنچا دیا اور امام کو گھیرے میں لے کر تیزی سے اور انتہائی احتیاطی اقدامات میں مدائن کے ایوان میں منتقل کر دیا۔ مدائن میں سعید بن مسعود ثقفی آپ کے گورنر تھے جو کہ آپ سے قبل حضرت علیؑ کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے سخت حفاظتی انتظامات میں آپ کا معالجہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں ان کی اور ان کے بھتیجے امیر مختار ثقفی کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

ان دو واقعات یعنی ہر اول دستہ میں ہونے والی خیانت اور امام حسنؑ پر ہونے والے حملوں نے ثابت کر دیا کہ بد نظمی اور بد حواسی کی شکار یہ سپاہ لڑنے کی توان سے مکمل طور پر فاقد ہے۔ جو سپاہ اپنے اس خلیفہ اور امام کی حفاظت نہ کر سکے جو اس کے رسولؐ کے فرزند بھی ہوں تو کیا اس سپاہ کے ساتھ ایک خطرناک حریف کے خلاف جنگ لڑی جا سکتی ہے؟ جن افواہوں کا شکار ہو کر عراقیوں میں خوف اور بد نظمی پھیلی انہیں باور کر لینے سے پہلے خود امام حسنؑ سے ان کی تصدیق کر لینی چاہئے تھی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی امام علیہ السلام نے انہیں اس طرح کی افواہوں پر کان دھرنے سے خبردار کیا تھا اور ان کے سنگین نتائج سے ڈرایا تھا (۲۶) لیکن ایک طرف وقت نے امام علیہ السلام کو اتنی مہلت نہ دی تھی کہ وہ صحیح سے ان کی تنظیم نو کر سکیں اور ان کے مردہ جسموں میں ایک نئی روح پھونک سکیں اور دوسری طرف سے عبید اللہ بن عباس کی خیانت نے ان افواہوں کے لئے ایک مکمل میدان فراہم کیا تھا۔ بہر صورت امام کی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں یہ سپاہ شکست کھا چکی تھی لیکن اس میں امام حسنؑ کا کوئی قصور نہ تھا اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اس سے پہلے بھی مسلمان جنگ احد میں پیغمبر اکرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں شکست کھا چکے تھے۔ پس جنگ کے میدان میں سپاہ کی شکست کے بہت سے اسباب و عوامل ہو سکتے ہیں۔ مستند اور مصدقہ تاریخی ذرائع انہی حقائق کو بیان کرتے ہیں جنہیں ذکر کیا گیا ہے لیکن کچھ تاریخی دفاتر میں امامؑ کے خیمے پر ہونے والے حملے کی کچھ اور وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ ان تاریخی مجموعوں میں نقل کیا گیا ہے کہ امام حسنؑ نے مدائن سے پیشقدمی کرتے ہوئے ساباط کے علاقے میں اچانک قیام کیا اور ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انہوں نے امیر شام سے صلح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر مجمع مشتعل ہو گیا اور انہوں نے آپ کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ (۲۷) یہ قول بذات خود معتبر نہیں لہذا تاریخ میں اسے چنداں اہمیت حاصل نہیں اور نہ ہی اہل تحقیق و نظر اسے اعتبار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قول میں امام کے اچانک قیام کرنے اور صلح کا ارادہ ظاہر کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امامؑ کو صلح ہی کرنا تھی تو اتنی طویل مسافت کیوں طے کی؟ جنگ کی تیاریاں، فوجوں کو جمع کرنا اور ہر اول دستے کو روانہ کرنا یہ سب ایک بے معنی اقدامات خیال کیے جائیں گے۔ (۲۸) نیز اس نقل میں امامؑ کے خیمے پر حملے کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی گئی اس لئے کہ عراق کی سپاہ اگرچہ عملی میدان میں امام کی اطاعت کرنے میں سستی دکھارہی تھی لیکن وہ آپ سے بے حد محبت کرتی تھی اور دل سے آپ کا احترام کرتی تھی۔ وہ نہ آپ کی دشمن تھی اور نہ جنگ پر اتنی مستعد تھی کہ جیسے ہی آپ صلح کا اعلان کریں تو وہ خود آپ کے خیمے پر حملہ کر دے۔ پس ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اس قول میں تاریخی حقائق کو الٹ کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے یعنی یہ کہ امام شروع سے صلح کرنا چاہتے تھے جبکہ ان کی سپاہ جنگ پر مستعد تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ امام کی سپاہ میں ایسے لوگ بھی تھے جن میں جنگی جوش اور ولولہ پایا جاتا تھا لیکن اکثریت صلح کی حامی اور امن و امان کی خواہشمند تھی اور بعد میں پیش آنے والے حقائق نے اس کی تصدیق کر دی۔ اس صنف کے زیادہ تر لوگ ہر اول دستہ میں شامل کیے جا چکے تھے لہذا مدائن میں امام حسنؑ کے ہمراہ ایسے لوگوں کا اتنی کثرت سے ہونا محال ہے کہ وہ امام کے خیمے پر حملہ کر دیں اور آپ کے سپاہی دیکھتے رہ جائیں۔۔۔؟

اگرچہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے لیکن اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عہد امام حسنؑ میں عراق کے حالات کا تجزیہ، جو کہ تاریخ اسلام کا انتہائی اہم اور نازک دور ہے، ایک تفصیلی مطالعے کا محتاج ہے جو اس باب کی حد سے باہر ہے۔

صلح کی جانب

اس صورتحال میں کہ جب امام حسنؑ شدید زخمی ہوئے تھے اور انہیں مدائن منتقل کر دیا گیا تھا یہ ایک طبیعی بات ہے کہ باقی قبائل کے سرداروں نے بھی امیر شام کی حمایت کا اعلان کر دیا ہو گا اور اپنے قبیلے کے لئے امان طلب کی ہو گی۔ امام حسنؑ مدائن میں تھے' آپ کا زخم خاصی حد تک بھر گیا تھا اور طبیعت بہتر ہو رہی تھی۔ قیس بن سعد نے خط لکھ کر امام کو ہراول دستے میں ہونے والی سازشوں اور سرداروں کے رجحانات سے آگاہ کیا تھا۔ لہذا یہ ایک واضح امر ہے کہ ان آشفتہ حالات میں عقل و شعور رکھنے والا دنیا کا کوئی سپہ سالار بھی جنگ کا خطرہ نہیں لے سکتا جبکہ وہ جان چکا ہو کہ اس کے زیادہ تر جرنیل دشمن سے مل چکے ہیں۔ اس سرکش اور نافرمان سپاہ کے ہاتھوں اتنا بڑا زخم کھانے کے بعد اب آپ کوئی نیا خطرہ مول نہ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ عراقی قبائل کے سرداروں اور سپاہ کے نمایاں چہروں کے سامنے ظاہر ہوئے اور ان سے خطاب کر کے صلح کرنے سے پہلے آپ نے ان پر حجت تمام کی۔ اس خطاب کے چند جملے یہ ہیں :

"اے عراق کے لوگو! مجھے تمہارے ان اشخاص کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے جو میرے ہمراہ ہیں؟ یہ قیس کا خط ہے جس نے مجھے آگاہ کیا ہے کہ تمہارے شرفاء تک معاویہ سے مل چکے ہیں۔ میرے والد کی وفات کے بعد تم خود سے میرے پاس آئے تھے اور تم نے اپنی پسند سے مجھ سے بیعت کی تھی۔ میں نے تمہاری بیعت کو قبول کیا اور معاویہ سے مقابلے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔۔۔ اے عراق کے لوگو! جو کچھ میں تم سے جھیل چکا ہوں وہ کافی ہے مجھے میرے دین میں دھوکہ مت دو اس لئے کہ میں اس اقتدار کو معاویہ کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔"(۲۹)

اپنے اس خطاب میں امام نے عراق کے شرفاء و عمائدین پر واضح کر دیا کہ ایک خلیفہ کی حیثیت سے انہوں نے اپنی مرضی سے ان سے بیعت کی تھی اور اس مقام کے تقاضے نبھانے میں انہوں نے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن خود ان سرداروں نے ان سے عدم تعاون کیا اور دشمن کو پر پھیلانے کا بھرپور موقع دیا اور حکومت ایک ایسی چیز ہے جو معاشرے کے افراد اور شرفاء کی حمایت کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتی لہذا امام صرف اسی دنیاوی اقتدار کو معاویہ کے حوالے کر رہے ہیں۔ صلح کا فیصلہ کرنے سے قبل آپ مدائن کے اطراف میں اپنی رہی سہی افواج کے سامنے بھی ظاہر ہوئے اور ان سے بھی خطاب کیا۔ اس خطاب میں آپ نے فرمایا :

"اس ذات کی قسم ہمیں اہل شام کے خلاف دوبارہ جنگ شروع کرنے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں اس لئے کہ ہم صبر و شکیبائی اور سکون واطمینان کے ساتھ ان سے جنگ کرتے آئے تھے

لیکن بعد میں اطمینان و دوستی کی جگہ دشمنی اور صبر و بردباری کی جگہ بے چینی اور اضطراب نے لے لی۔ کل جب تم میدان صفین کی جانب رہسپار تھے تو تمہارا دین تمہاری دنیا پر غالب تھا لیکن آج تمہارا یہ حال ہو گیا ہے کہ تمہاری دنیا تمہارے دین پر غالب آگئی ہے۔ یاد رکھو کہ معاویہ نے ہمیں ایک ایسے امر کی جانب دعوت دی ہے جس میں نہ عزت ہے نہ انصاف! پس اگر تم موت کو پسند کرو گے تو ہم شامیوں کے خلاف دوبارہ حملے کے لئے نکل کھڑے ہوں گے اور تلواروں کی دھار سے ان کا حساب صاف کریں گے اور اگر تم جنگ کو پسند کرو گے تو ہم تمہارے لئے (معاویہ سے) رضایت لے دیں گے۔ اس پر چاروں طرف سے صلح کی آوازیں اور زندگی کے نعرے لگنے لگے چنانچہ ان لوگوں سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ نے صلح پر رضامندی ظاہر کر دی۔ (۳۰)

یہ تاریخی اقتباس جو انتہائی معتبر ذرائع سے نقل ہوا ہے صلح کے بارے میں امام حسن کے موقف کی عکاسی کرتا ہے۔ آپ نے اس وقت تک صلح پر رضامندی ظاہر نہیں کی جب تک کہ آپ کی سپاہ نے اپنی نالائقی کا عملی ثبوت فراہم نہ کیا' اس کے سرداروں نے آپ سے خیانت نہ کی اور اس کے سپاہیوں نے آپ کی وضاحت کے باوجود کہ اس صلح میں نہ عزت ہے نہ انصاف' آپ سے صلح کرنے کا مطالبہ نہ کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا حقیقی نمائندہ کبھی بھی اپنی ذاتی رائے کو لوگوں کے سروں پر مسلط نہیں کرتا اگر وہ مکمل اتفاق کے ساتھ اسے مسترد کرنے پر رضامند ہوں۔ اسلام کا حقیقی نمائندہ طاقت کے بل بوتے پر یا جبر و زبردستی کے ذریعے سے لوگوں کو رام نہیں کیا کرتا بلکہ حق کی جانب ہدایت کرتا ہے۔ اس سے واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک آزاد معاشرہ ہوتا ہے اور اس میں افکار اور حقوق کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ پس واضح ہے کہ اس صورتحال میں جنگ پر اڑنا ایک حماقت ہوتی۔ اگر امام جنگ پر اڑے رہتے تو وہ خود اپنے لشکر میں موجود شر پسند عناصر کے حملوں سے محفوظ نہ رہتے اور انہیں اپنے تمام مخلص ساتھیوں سے ہاتھ دھونا پڑتا جبکہ اسلام اور دین کو اس قربانی سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا بلکہ یہ مکمل طور پر ضائع جاتی۔ لیکن اگر آپ کی افواج آپ کی اطاعت کرتیں اور آپ سے وفادار رہتیں تو آپ امیر شام کے تجاوزات کا مکمل اور بھرپور جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن موجودہ صورتحال میں اس صلح کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ آپ شام و عراق کے درمیان جاری اس کشمکش کو ختم کر کے امت مسلمہ میں اتحاد و اتفاق برقرار کرنا چاہتے تھے۔

صلحنامہ کی شرائط

صلحنامہ کی شرائط اور دوسرے امور کے بارے میں بہت سی چیزوں کو الجھا دیا گیا ہے۔ ان امور کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب "سیرت امام حسنؑ" میں کی ہے۔ یہاں اسی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ امام حسنؑ نے امیر شام سے کسی اصول پر سمجھوتہ نہ کیا۔ جب امیر شام نے ایک صلحنامہ ترتیب دے کر انہیں بھجوایا جس میں انہیں مال و دولت اور دوسرے امور کی پیشکش کی گئی تھی تو امامؑ نے ان پیشکشوں کو مسترد کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ امیر معاویہ کو بیت المال سے یہ پیشکش کرنے یا شرائط عائد کرنے کا حق حاصل نہیں۔ امیر شام امام حسن کے کچھ نمایاں سرداروں کو امان دینے کے لئے تیار نہ تھے لیکن امامؑ نے ایسی صلح پر اپنی عدم رضایت ظاہر کر دی اور امیر شام کو اپنی جانب سے املاء کردہ شرائط قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ (۳۱) امامؑ اس سے بھی غافل نہ تھے کہ امیر شام ان پر کس حد تک پابند رہیں گے لیکن ان حالات میں جبکہ آپ کی سپاہ کو میدان جنگ میں شکست ہو چکی تھی یہ آپ کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ ان میں سے نمایاں شروط یہ ہیں۔

۱۔ معاویہ قرآن کریم، سنت رسول اور نیک خلفاء کی پیروی کریں گے۔

۲۔ حضرت علیؑ پر سب و شتم نہ کیا جائے گا۔

۳۔ اللہ کی زمین میں اس کے بندوں کو چاہے وہ کہیں بھی ہوں مکمل تحفظ حاصل ہو گا۔

۴۔ معاویہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین معین نہ کریں گے چنانچہ ان کے بعد یہ عہدہ امام حسن کو واپس کر دیا جائے گا۔ (۳۲)

۵۔ حسنؑ بن علی، ان کے بھائی حسین اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان و اہل بیت کے دوسرے افراد کے خلاف کسی قسم کی خفیہ یا علانیہ سازش ترتیب نہیں دی جائے گی۔

۶۔ حضرت علی کے ماننے والوں کی جان، مال اور عزت کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ (۳۳)

امام حسنؑ نے صرف امیر معاویہ کے بھیجے ہوئے اور دستخط شدہ خالی صفحہ پر ان شرائط کو لکھنا کافی نہ سمجھا بلکہ دونوں طرف کے اعلیٰ وفود کی موجودگی میں جب امیر شام نے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ وہ ان شرائط کے پابند رہیں گے تب امامؑ نے صلحنامہ پر دستخط کئے۔ اس میں شک نہیں کہ امیر شام نے ان میں سے بعض شرائط کی عہد شکنی کی۔ انہوں نے زیاد بن ابیہ کو ابو سفیان کا بیٹا بنا کر اللہ تعالیٰ کے قانون کی کھلی خلاف ورزی کی۔ نیز حضرت علیؑ کو برا بھلا کہنے کی رسم کو اپنے زمانہ میں حکومت کے تمام ذرائع ابلاغ سے پھیلا دیا۔ یہ سلسلہ بعد تک جاری رہا اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس غلط رسم کو ختم کیا۔ ان شرائط کو عہد نامہ میں شامل کرنے

سے امام کی نظر میں مختلف وجوہات تھیں۔ مجموعاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی جانب سے املاء کی گئی شرائط پر عملدر آمد کرنے میں امامؑ کامیاب رہے تھے۔ امیر شام آپ کے جیتے جی یزید کو اپنا جانشین معین کرنے کی جرات نہ کرسکے لہذا صلح نامہ کے دس سال بعد آپ کوراستہ سے ہٹانے کے بعد ہی وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ اسی طرح امن عامہ کی صورتحال بھی اتنی خراب نہ ہوئی جس کا اندیشہ تھا اور حضرت علیؑ کے اصحاب اور چاہنے والوں کا عہد امام حسنؑ میں قتل عام نہ ہوا۔ امامؑ امت مسلمہ کے درمیان ایک واقعی صلح برقرار کرنے ناحق ان کے خون بہنے سے روکنے اور اپنے چاہنے والوں کی جانیں بچانے میں مکمل طور پر کامیاب رہے تھے اور ہمیں تاریخ میں ایک بھی ایسا حادثہ نہیں ملتا جو اس حقیقت کی تردید کرسکے۔ کچھ تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے کہ امام حسنؑ نے امیر معاویہ سے کوفہ کے بیت المال میں سے خطیر رقوم کی فرمائش کی تھی لیکن دوسری تواریخ میں اس قسم کی روایات کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر امام حسنؑ کو دنیا اور مال و دولت اتنی ہی عزیز ہوتی تو وہ ہرگز اقتدار معاویہ کے حوالے نہ کرتے۔

مزید یہ کہ اس قسم کی روایات معتبر نہیں ہیں اور اہل نظر نے ان میں یہ اعتراض کیا ہے کہ کوفہ کے بیت المال میں اتنی خطیر رقوم کا ہونا ہی محال ہے پس امام کا تقاضا کرنا ہرگز ممکن نہیں!! (۳۵) تاہم یہ صحیح ہے کہ امیر شام کی جانب سے کچھ رقوم کی پیشکش ہوئی تھی جسے امام حسنؑ نے مسترد کر دیا تھا۔

دوبارہ کوفہ

صلح کے بعد امام حسنؑ نے خط لکھ کر قیس کو کوفہ واپس ہونے کی ہدایات دی تھیں۔ ان ہدایات کے موصول ہونے کے بعد قیس نے جنگ یا صلح کا فیصلہ سپاہیوں پر چھوڑ دیا تھا اور جب سپاہیوں نے اس موقع پر بھی صلح کو پسند کیا تو وہ کوفہ واپس ہوگئے۔ (۳۶) امام المسلمین کے نمائندے اور سپہ سالار کے جانشین کی حیثیت سے انہیں امام کی اطاعت کرنی چاہئے تھی لیکن اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ان میں یہ کمی تھی کہ وہ تمام امور کی زمام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے حالانکہ حالات نے ثابت کیا اور ہراول دستے میں موجود سپاہ نے تصدیق کی کہ اس وقت کی شرائط میں امام کا فیصلہ بہترین اور مناسب ترین فیصلہ تھا۔ بہر صورت وہ سپاہ کو لے کر کوفہ آگئے جہاں امام حسنؑ پہلے سے موجود تھے۔ ادھر امیر معاویہ بھی پوری فوج کے ساتھ کوفہ میں داخل ہوئے تھے۔ فریقین نے نخیلہ کے مقام پر زبردست اجتماع تشکیل دیا۔ مفاد پرست طبقے نے امیر معاویہ سے بیعت بھی کی اور یہ چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں کہ امام حسنؑ امیر معاویہ کی

خلافت کا اعلان کریں گے۔ دوسری طرف عسکری میدان میں کامیابی حاصل کرنے اور عراق کی سپاہ کو شکست دینے کے بعد شام کے حلقوں کی جانب سے امام حسنؑ پر دباؤ بڑھ گیا تھا کہ جنگ کرنے کے بارے میں اپنے فیصلے پر عذر خواہی کریں اور معاویہ کو خلیفہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیں۔ (۴۷) لہذا جب امام حسن کو صلح کے بارے میں اپنے موقف کا اظہار کرنے کے لئے کہا گیا تو تاریخ ان کا یہ خطاب یوں نقل کرتی ہے:

"اے لوگو! اللہ سبحانہ و تعالی نے ہم سے پہلے (حضرت ختمی مرتبتؐ) کے ذریعہ تمہیں ہدایت دی اور ہم میں سے آخری (امام حسنؑ) کے ذریعے تمہاری جانوں کی حفاظت کی۔ بے شک یہ دنیاوی منصب وقتی چیزیں ہیں جو ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ یہ (صلح) تمہارے لئے ایک امتحان ہے یا ایک خاص وقت تک تمہاری مقررہ دنیاوی زندگی سے بہرہ مند ہونے کا ذریعہ ہے۔"

آپ نے مزید فرمایا:

"خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اللہ کی کتاب کے مطابق چلتا ہے اور سنت رسولؐ کی مکمل پیروی کرتا ہے لیکن جو دنیا کو اپنا سب کچھ بنالے اور ظلم و ستم کا بازار گرم کرے وہ صرف بادشاہ اور حکمران ہوا کرتا ہے۔ اس کی یہ بادشاہت چند دن باقی رہے گی جس سے وہ مزے اٹھا سکے گا اور بعد میں صرف اس کے مضرات باقی رہ جائیں گے۔" (۴۸)

امام حسنؑ کے اس تاریخی خطاب کو مسلمان دانشوروں نے بہت سراہا ہے۔ انہوں نے اس خطاب میں خاندان اہل بیت کی خدمات کو سراہا اور اپنی صلح کا اپنے نانا کی خدمات سے تسلسل برقرار کیا۔ اس نازک موقع پر بھی جبکہ امیر شام اپنی افواج کے ہمراہ کوفہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے کھڑے تھے انہوں نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو خاندان رسالت کی میراث تھی' امیر معاویہ کو واضح طور پر خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بادشاہ (ملک) کے نام سے یاد کیا۔ اس خطاب میں آپ نے خلافت، ملوکیت کی جو تعریف کر دی اور جس طرح ان دونوں کے درمیان لکیر کھینچ دی وہ قیام قیامت تک باقی رہے گی۔ آپ نے عالم اسلام کو بتلا دیا کہ خلافت عام دنیاوی مقامات کی طرح کا ایک مقام و منصب نہیں جو سراغ رسانی کے محکمے قائم کرنے اور تلوار کی نوک پر اقتدار چھین لینے سے حاصل ہو جائے بلکہ یہ ایک دینی مقام ہے جو ہر لحہ قرآن اور سنت کی مکمل پیروی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا آپ نے صرف اقتدار امیر معاویہ کے حوالے کر کے خلافت کا دروازہ بند کر دیا۔ آپ کا یہ جرات مندانہ قدم اسلامی حلقوں کے لئے مثال بن گیا اور انہوں نے امیر معاویہ کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تاریخ اس سلسلے میں کچھ صحابہ

کرام کے کلمات محفوظ کرتی ہے جن میں واضح طور پر سعد بن ابی وقاصؓ اور ابو ہریرہؓ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح آپ کے نانا کی پیشگوئی صحیح ثابت ہوئی اور ربیع الثانی یا جمادی الاول یا جمادی الثانی ۴۱ ہجری میں امیر شام سے صلح کرنے کے بعد یہ تیس سالہ دور خلافت ختم ہوا اور ملوکیت کا آغاز ہوا۔ اقتدار امیر معاویہ کے پاس چلا گیا اور مذہبی امور کی زعامت فرزند رسولؐ امام مجتبیٰ کے پاس رہی۔ اس بات کا ثبوت کہ امام حسن نے امیر شام کو خلیفہ کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے امیر شام سے اپنے بعد اپنا جانشین معین کرنے کا حق بھی چھین لیا تھا۔ اسی طرح صلح کے بعد جب وہ مدینہ جا رہے تھے اور امیر معاویہ نے انہیں خوارج سے لڑنے کے لئے کہا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ اگر انہیں کسی سے لڑنا ہوتا تو وہ سب سے پہلے امیر شام سے لڑتے۔ (۶۹) پس اگر وہ خلافت ان کے حوالے کر دیتے تو معنی نہیں رکھتا کہ ان سے آئندہ خلیفہ کے تقرر کا حق چھین لیتے یا ان سے جنگ کرنا جائز سمجھتے اور ان کی مخالفت کرتے۔

بہر حال صورتحال کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امام حسن کی صلح پر خود ان کے قریبی دوستوں کی جانب سے بھی شدید اعتراضات ہوئے لیکن صلح کے علل و اسباب اور حالات کی نوعیت واضح کرنے کے بعد یہ اعتراضات رضایت میں بدل گئے۔ مدینہ واپس جا کر امام حسنؑ نے ایک آرام دہ اور راحت طلب زندگی نہیں گزاری بلکہ اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کی نشر و اشاعت کی۔ انہوں نے حد اکثر امیر شام سے تعرض نہ کیا' امت مسلمہ کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا' انہیں ایک مرکز پر جمع رکھا اور ان میں ایک ایسی جماعت کو تیار کیا جو لوگوں میں اسلامی اخلاق و کردار کو زندہ کرے۔ انہوں نے ملوکیت' دین میں بے راہ روی اور جہالت و بے تقوائی کے خلاف اپنی سرگرمیوں کو زیر زمین سطح پر جاری رکھا۔ امام حسنؑ کی ظاہری شکل و صورت' خدوخال ہو بہو ان کے نانا جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتے تھے اور ان کی سیرت' ان کا کردار' ان کی سخاوت اور جاذب نظر شخصیت ہر ملنے والے کو متاثر کرتی تھی۔ لوگ دور دراز سے ان سے ملنے آتے اور بہت کچھ حاصل کر کے سیکھ کر واپس جاتے تھے۔ عالم اسلام میں ان کی عظیم شخصیت کے اثرات اور ان کی ہیبت کے باعث امیر شام بھی کسی مسئلے میں ان سے تعرض نہ کرتے تھے۔ اس طرح خاصی حد تک امن و امان برقرار ہو گیا تھا اور یہ حدیث نبویؐ بھی صادق ثابت ہوئی تھی کہ میرا یہ بیٹا مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کروائے گا۔ پس عہد امام حسنؑ کے تاریخی مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ امام حسن کو صرف صلح و آشتی کا علمبردار سمجھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اس لئے کہ امام حسنؑ کے سیاسی اقدامات کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آگئی کہ انہوں نے جنگ بھی کی اور صلح بھی کی۔ جس طرح سے کہ ان کے نانا جناب رسول خدا

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جنگ بھی کی تھی اور صلح بھی کی تھی اور اسی سنت رسولؐ کو ان کے والد نے بھی اپنایا تھا اور امیر معاویہ سے صرف صفین کے میدان میں جنگ نہ کی تھی۔ بلکہ جب حالات نے پلٹا کھایا تھا تو انہوں نے بھی تحکیم کی صورت میں ہونے والی صلح کو قبول کیا تھا البتہ خاص شرائط کے ساتھ۔ اسی طرح امام حسنؑ کے بعد ان کے بھائی امام حسینؑ بھی صلح حسنؑ پر پابند رہے تھے۔ پس امام حسن نے بھی ایک زبردست جنگ لڑی لیکن ان کی سپاہ نے اپنی نا لائقی سے حالات کو جس نہج پر پہنچادیا تھا اس میں صلح سے بہتر اور کوئی صورت نہ تھی۔ لہذا انہوں نے امت مسلمہ کے درمیان وسیع پیمانے پر خون خرابہ ہونے سے روک لیا۔ وہ اپنے چاہے والوں کی جان و مال اور عزت و ناموس کو تحفظ فراہم کرنے میں کامیاب رہے اور انہوں نے قرآن و سنت کے کسی مبینہ اصول سے انحراف بھی نہ کیا۔ اگر یہ سپاہ انؑ کا ساتھ دیتی تو دینی ریاست کی طرح آپ زمام اقتدار بھی اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ مسلمانوں کو امام حسنؑ کی صلح اور ان کے دوسرے اقدامات سے سبق حاصل کرنا چاہئے کہ انہوں نے کس طرح ملوکیت کی سرگرمیوں کو محدود کر دیا اور اپنے قول و فعل کے ذریعے سے لوگوں کو قرآن و سنت سے دور نہ ہونے دیا۔ ان کا اخلاق ان کا کردار یہاں تک کہ ان کی آخری وصیت بھی مسلمانوں کو قرآن و سنت پر جمع رہنے اور تفرقہ سے پرہیز کرنے کا درس دیتی رہی۔

مدارک

ثابت الفندی و احمد شنتناوی 'دائرۃ المعارف اسلامیہ' مصر: وزارۃ المعارف العمومیہ ۱۹۳۳ء جلد ہفتم صفحہ ۴۰۰

H.A.R .Gibb & Kramers, Shorter Encyclopedia of Islam, Leiden: E. J.Brill, 1974, p . 135

S.H.M Jafri, theOrigins & Early development of shia Islam , Qom :Ansariyan pub, P . 131

۲۔ صحیح البخاری 'بیروت: دار المعرفہ' جلد دوم۔ ص ۱۱۴

حاکم نیشاپوری 'المستدرک' بیروت: دار المعرفہ 'جلد سوم۔ ص ۱۷۰

دیار بکری 'تاریخ الخمیس' بیروت: موسسہ شعبان' جلد دوم۔ ص ۳۹۰

3- S.H.M. Jafri The Origins p.131

۴۔ابن اثیر' الکامل فی التاریخ' بیروت :احیاء التراث' ۱۹۸۹ء' جلد دوم۔ ص ۴۳۱

۵۔الکامل فی التاریخ جلد دوم۔ ص ۴۲۹۔ ۴۵۳

یعقوبی' تاریخ یعقوبی' بیروت :دار صادر' جلد دوم۔ ص ۲۱۸

۶۔ابوالفرج' مقاتل الطالبین' نجف' مطبعہ حیدریہ' ۱۹۶۵ء جلد اول۔ ص ۳۴

ابن ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ' قاہرہ :احیاء الکتب' ۱۹۶۲ء' جلد ۱۶۔ ص ۳۳

۷۔مقاتل الطالبین۔ ص ۳۴

ابن اعثم' الفتوح' حیدر آباد :دائرۃ المعارف العثمانیہ' ۱۹۷۱ء جلد چہارم۔ ص ۱۵۱

بلاذری' انساب الاشراف' بیروت :دار التعارف' ۱۹۷۷' جلد سوم' صفحہ ۳۰

ابن ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ جلد ۱۶۔ ص ۲۴

۸۔ مقاتل الطالبین صفحہ ۳۹' شرح نہج البلاغہ' جلد ۱۶ صفحہ ۳۸ ؛بلاذری' انساب الاشراف جلد سوم ۳۲۔ راضی آل یاسین' صلح الحسنؑ' صفحہ ۱۰۱۔۱۰۰

9-Shorter, Encyclopedia of Islam; Leiden: p.135

۱۰۔مقاتل الطالبین صفحہ ۴۰' بلاذری انساب الاشرف' جلد سوم صفحہ ۳۳

ابن ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ جلد ۱۶۔ ص ۴۰ ؛ شیخ آل یاسین' صلح الحسن' صفحہ ۱۰۱۔۱۰۰

۱۱۔حاشیہ نمبر(۱۰) ملاحظہ فرمائیں۔

۱۲۔ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ جلد نمبر ۷۔ ص ۱۰۲۔۴۱

راضی آل یاسین' صلح الحسن۔ ص ۹۴

۱۳۔ تاریخ یعقوبی جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۴

۱۴۔ابوالفراج' مقاتل الطالبین' جلد اول۔ صفحہ ۴۲

ابن ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ' جلد ۱۶ صفحہ ۴۲

شیخ مفید' کتاب الارشاد' تہران :انتشارات علیہ' جلد دوم صفحہ ۹

آل یاسین صلح الحسن۔ صفحہ ۱۴۷

۱۵۔بلاذری' انساب' جلد سوم۔ ص ۳۸ ؛یعقوبی تاریخ یعقوبی' جلد دوم۔ ص ۲۱۴

۱۶و۱۷۔مقاتل الطالبین صفحہ ۴۳ ؛انساب الاشراف جلد سوم صفحہ ۳۸

۱۸۔ابن اعثم' الفتوح' جلد چہارم صفحہ ۱۵۶

۱۹۔گذشتہ حوالہ جات کو دیکھیں۔

۲۰و۲۱۔ تاریخ یعقوبی جلد دوم صفحہ ۲۱۴

۲۲۔ طبری' تاریخ الطبری (الرسل والملوک) بیروت : دار الکتب العلمیہ ۱۹۸۸ء' جلد سوم صفحہ ۱۶۵' ابن اثیر الکامل' جلد دوم' صفحہ ۴۴۵' تاریخ ابن خلدون' بیروت : مؤسسہ علمیہ' ۱۹۷۱ء جلد دوم صفحہ ۱۸۶

ابن عساکر' تاریخ دمشق ترجمة الامام الحسن' محمودی' بیروت :۱۹۸۰ء صفحہ ۱۲۷

ابن حجر' الاصابہ فی تمییز الصحابہ' قاہرہ : مصطفیٰ محمد پبلشرز ۱۹۳۹ء' جلد اول صفحہ ۳۲۹' تاریخ الخمیس جلد دوم صفحہ ۳۸۹' ابن کثیر' البدایہ و النہایہ' بیروت : مکتبۃ المعارف' ۱۹۷۴ء' جلد ہشتم' صفحہ ۱۴' ابو علی مسکویہ' تجارب الامم' تہران : دار سروش' ۱۹۸۷ء' جلد اول' صفحہ ۳۸۶

۲۳۔ گذشتہ حوالہ کو ملاحظہ کریں اور اس کے علاوہ دیکھیں :

ابن اعثم' الفتوح' جلد چہارم' صفحہ ۱۵۶۔ ۱۵۴' حاکم' المستدرک جلد سوم صفحہ ۱۷۴

دینوری' الاخبار الطوال' صفحہ ۲۱۶ و ۲۱۷۔ ابو الفرج' مقاتل الطالبین' جلد اول' صفحہ ۴۱

شیخ مفید' کتاب الارشاد' جلد دوم' صفحہ ۷

حافظ ذہبی' تاریخ الاسلام' بیروت: دار الکتب العربی' ۱۹۸۷' عہد خلفاء الراشدین' صفحہ ۶

ابن صباغ مالکی' الفصول المہمۃ نجف : دار الکتب' صفحہ ۱۴۴۔

۲۴۔ حوالہ نمبر ۲۲ اور ۲۳ کو ملاحظہ کریں۔

۲۵۔ تاریخ یعقوبی' جلد دوم صفحہ ۲۱۵

حاکم نیشاپوری' المستدرک' بیروت : دار المعرفہ' جلد سوم' ۱۷۴

۲۶۔ مسعودی' مروج الذہب' بیروت : دار الفکر' ۱۹۸۹ء جلد سوم صفحہ ۱۰

۲۷۔ ابن اعثم کوفی' الفتوح' حیدر آباد : دائرۃ المعارف العثمانیہ' ۱۹۷۱' جلد چہارم صفحہ ۱۵۴

دینوری' الاخبار الطوال' قاہرہ : دار احیاء الکتب' ۱۹۶۲ء' صفحہ ۲۱۷

ابن ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ' قاہرہ : دراحیاء الکتب' ۱۹۶۲ء جلد ۱۶ صفحہ ۴۰

ابن صباغ مالکی' الفصول المہمۃ' نجف : دار الکتب صفحہ ۱۴۴

شیخ مفید' کتاب الارشاد' تہران' انتشارات علمیہ' جلد دوم صفحہ ۷

28- S.H.M.Jafri, The Origins & Early development of Shia Islam, Qom :Ansariyan Publication, p . 145

۲۹۔ بلاذری' انساب الاشراف' جلد سوم صفحہ ۳۹ ؛ ابن اعثم الفتوح' جلد چہارم صفحہ ۱۵۷ ؛ باقر قرشی' حیاۃ الامام الحسن' نجف : مطبعۃ الآداب' ۱۹۷۳ جلد دوم صفحہ ۹۴ ؛ ابن

ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ' جلد ۱۶ صفحہ ۲۲

۳۰۔ تاریخ ابن خلدون" جلد دوم صفحہ ۱۸۷۔ حافظ ذہبی' تاریخ اسلام' عہد خلفاء الراشدین' صفحہ ۶۔ تہذیب تاریخ دمشق' بیروت: داراحیاء التراث: تاریخ ابن عساکر' ترجمة الامام الحسن' صفحہ ۱۷۹' صفحہ ۱۷۸' باقر قرشی' حیاۃ الحسن بن علی' جلد دوم' صفحہ ۱۰۹

۳۱۔ ابن اعثم' الفتوح جلد چہارم' صفحہ ۱۵۹' محب الطبری' ذخائر العقبی قاہرہ: مکتبہ القدسی' ۱۳۵۶ھ' صفحہ ۱۳۹: حسین دیار بکری' تاریخ الخمیس بیروت' موسسۂ شعبان' جلد دوم صفحہ ۳۹۰

۳۲۔ حافظ ذہبی' العبر' بیروت: دارالکتب العلمیہ' ۱۹۶۸ء جلد اول صفحہ ۳۴ و ۳۵

حافظ سیوطی' تاریخ الخلفاء' قم: انتشارات الرضی' ۱۴۱۱ھ صفحہ ۱۹۱

حسین دیار بکری' تاریخ الخمیس' بیروت: موسسۂ شعبان' جلد دوم صفحہ ۳۹۰

بلاذری' انساب الاشراف' صفحہ ۴۲: دینوری' الاخبار الطوال صفحہ ۲۱۸

طہٰ حسین' اسلامیات' الفتنة الکبری' بیروت: دار العلم' ۱۹۹۱ء صفحہ ۹۷۹

دکتور عبدالسلام ترمانینی' احداث التاریخ السلامی' الکویت: مجلس الوطنی للثقافہ ۱۹۸۸ء جلد اول صفحہ ۴۲۰۔ عبدالقادر بدران' تہذیب تاریخ دمشق صفحہ ۲۲۴ امیر علی' مختصر تاریخ العرب' العنیف بعل بکی' بیروت: دار العلم' ۱۹۶۱ صفحہ ۷۹۔۷۸

ابن حجر عسقلانی' الاصابہ فی تمییز الصحابہ' مصر: مطبعة السعادة ۱۳۲۸ھ صفحہ ۳۳۱

۳۳۔ ابن اعثم' الفتوح" جلد چہارم صفحہ ۱۶۱: بلاذری انساب الاشراف' جلد سوم' صفحہ ۴۲' تاریخ ابن خلدون' جلد دوم' ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۸۶' ابن صباغ مالکی' الفصل المہمة نجف: مطبعة دار الکتب' ۱۴۵' دینوری' الاخبار الطوال' صفحہ ۲۱۸

S.H.M Jafri, The Origins.......pp .149 - 153

ابن ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ' قاہرہ جلد ۱۶ صفحہ ۲۲

۳۴۔ بلاذری' انساب الاشراف' جلد سوم' صفحہ ۴۲' ابن اعثم الفتوح' جلد چہارم' صفحہ ۱۵۹

۳۵۔ رجوع کریں ایس ایچ ایم جعفری The Origins & Early....

۳۶۔ ابن اثیر الکامل جلد دوم صفحہ ۴۴۷' ابن اعثم الفتوح' جلد چہارم صفحہ ۱۶۰' تاریخ طبری' بیروت: دارالکتب العلمیہ ۱۹۸۸ء' جلد دوم' صفحہ ۱۶۶

۳۷۔ حوالہ نمبر (۳۳) دیکھیں۔

۳۸۔ ایس۔ ایچ۔ ایم جعفری۔ The Origins .... p .154

ابن اثیر' الکامل' جلد دوم صفحہ ۴۴۷' ابن قتیبہ الامامہ والسیاسہ' قم: انتشارات

رضی ۱۹۹۲ء صفحہ ۱۸۵؛ ابوالفرج' مقاتل الطالبین جلد اول صفحہ ۴۷ ؛ بلاذری 'انساب الاشراف' جلد سوم صفحہ ۴۳ ؛ دیار بکری' تاریخ الخمیس' جلد دوم صفحہ ۳۹۰ و ۳۹۱ ؛ عبدالقادر تہذیب تاریخ دمشق' جلد چہارم صفحہ ۲۲۶ و ۲۲۷۔ تاریخ طبری' جلد سوم صفحہ ۱۶۷' ابن اعثم الفتوح جلد چہارم صفحہ ۱۶۳ ؛ محب الطبری 'ذخائر العقبیٰ' قاہرہ : مکتبہ القدسی' ۱۳۵۶ھ 'صفحہ ۱۴۰۔ مسعودی 'مروج الذہب' بیروت : دار الفکر' ۱۹۸۹ جلد سوم صفحہ ۹۔ عبدالعزیز سالم' تاریخ الدولہ العربیہ' اسکندریہ : موسسۂ شباب الجامعہ' ۱۹۹۳ء جلد دوم' صفحہ ۳۴۷ ؛ راضی آل یاسین' صلح الحسن ؛ ابن خلدون' تاریخ ابن خلدون' بیروت : موسسہ الاعلمی' ۱۹۷۱ء جلد دوم' صفحہ ۱۸۷

۳۹۔ ابن اثیر' الکامل' جلد دوم صفحہ ۴۴۹؛ بلاذری' انساب الاشراف صفحہ ۴۶۔

جابر بن حیان

جابر بن حیان ازدی مسلمانوں کے مشہور سائنس دان اور دنیا کے پہلے کیمیا دان (Father of Chemistry) ہیں۔ وہ خلقت کے عجائبات میں سے ہیں اور ان کی تصانیف کی بہتات اور ان کی شخصیت میں موجود علم کا بہتا ہوا دریا دیکھ کر دنیا کے دانشور حیران و پریشان ہیں۔ وہ یورپ میں (Geber or Geberus) کے نام سے مشہور ہیں اور علم کیمیا (Chemistry) علم منطق (Logic) فلسفہ (Phliosphy / Metaphysics) طبیعیات (Physics) ریاضیات (Mathematics) علم ہندسہ (Geometry) علم ہیئت (Astronomy) علم نجوم (Astorlogy) علم طب (Medicine) اور علم عرفان و باطنی علوم میں غیر معمولی اور ناقابل تصور احاطہ رکھتے ہیں۔ ان کی مختصر اور تفصیلی تصانیف اور تحقیقی مقالہ جات مجموعاً تین ہزار سے زیادہ ہیں۔ ہارون الرشید کے وزراء یعنی برامکہ سے ان کا قریبی تعلق تھا اور وہ امام جعفر صادقؑ کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں اس حقیقت کا اظہار بھی کیا ہے کہ انہوں نے ان علوم کو امامؑ سے حاصل کیا تھا۔ ان کے بہت سے کام لاطینی زبان میں رومیوں نے اس وقت ترجمہ کئے جب یورپ جہالت و تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مشہور فرانسیسی کیمیادان برتھیلوٹ (Berthelot 1827-1907) انہیں کیمسٹری میں وہی مقام و منزلت دیتا ہے جو منطق میں ارسطو کو حاصل ہے۔ یاد رہے کہ ارسطو (Aristotle) کو منطق میں معلم اول کا درجہ حاصل ہے لہذا انہیں بھی پہلا کیمیادان (Father of chemistry) تسلیم کر لیا گیا۔ ابن ندیم کے نقل کے مطابق ان کا تعلق خراسان سے تھا۔ ابن خلکان (Ibn-e-Khalliqan)

انہیں طرسوسی بتاتے ہیں۔ ان کی وفات ایک نقل کے مطابق ۱۶۰ ہجری میں ذکر کی گئی ہے۔ تاریخ الفکر العربی میں اسے ۱۸۰ھ بتایا گیا ہے یعنی وہ مامون کے خلیفہ بننے سے پہلے تک قید حیات میں تھے۔ آقا بزرگ طہرانی نے اسے ۲۰۰ھ میں روایت کیا ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے مشہور کیمیادان ابن امیل (وفات ۳۵۰ھ) اپنی تصانیف میں ان کے نظریات کو نقل کرتے ہیں اور ان کی تصانیف سے استفادہ کرتے ہیں۔ یورپی ماہرین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ جابر بن حیان کی کیمیا (Chemistry) اور سائنسی نظریات اس وقت کی رائج قدیم کیمیا پر مشتمل نہ تھے بلکہ جابر کی کیمسٹری ایک تجرباتی سائنس تھی جو فلسفہ کی بنیادوں پر استوار کی گئی تھی۔ وہی فلسفہ جس کی عمارت کی پہلی اینٹیں ارسطو نے رکھی تھیں۔ اس دور میں جبکہ ابھی تجربہ اور تجرباتی علوم (Experimental Sciences) کے لئے دنیا کو صدیاں درکار تھیں جابر اپنی کیمسٹری کو نئی بنیادوں پر استوار کر چکے تھے۔ ان کی کیمسٹری صرف تجربہ کی اینٹوں سے تعمیر نہیں ہوئی بلکہ اس کا ڈھانچہ فلسفہ کے مستحکم اصولوں پر قائم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یورپ آج تک ان علوم سے صحیح اور مکمل واقفیت حاصل نہ کر سکا جن کی ابتداء یونان سے ہوئی تھی اور سقراط و افلاطون وارسطو جس کے بانی تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس وقت یورپ خواب غفلت میں ڈوبا ہوا تھا اور بعد میں جب بیدار ہوا تو یہ علوم عربی زبان میں منتقل ہو چکے تھے۔ بعد ازاں صرف مسلمانوں کے ذریعے سے ان علوم سے آشنا ہو سکا اور اس نے ان علوم کی جانب خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یعنی اسلامی دائرۃ المعارف میں مستشرقین (Orientalists) نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے:

Granted that we are frequently ill informed regarding the corresponding branches in ancient science, the writings of Djabir still enable us to restore to Greek science some interesting aspects which were thought to have been lost.

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ گذشتہ علوم کی شاخوں اور مسائل کے بارے میں ہماری اطلاعات بے حد ناقص ہیں تاہم جابر کے نوشتہ جات نے ہمیں اس قابل کر دیا کہ یونانی علوم کے ان دلچسپ مسائل میں اس کمی کا ازالہ کر سکیں جس کے فاقد ہونے کا تصور کیا جاتا تھا"

ان کے اس آخری دعوی کو کہ وہ اس کمی کا مکمل طور پر ازالہ کر چکے ہیں ہم قبول نہیں کرتے یورپ آج بھی فلسفہ، منطق اور اس جیسے دوسرے علوم سے بیگانہ ہے جس کا منشاء یونان تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ علوم عربی زبان میں تھے اور ان علوم کی اصطلاحات و رموز

(Terms and Abbreviations) سے (خاص کر جابر کے نوشتہ جات میں) آشنا نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان علوم سے محروم رہ گئے۔ وہ جابر کی بھی زیادہ تر تصانیف کا ترجمہ نہ کر سکے اور ان کی ایک بڑی تعداد غیر ترجمہ شدہ اور غیر مطبوعہ صورت میں آج بھی دنیا کے مشہور کتب خانوں میں موجود ہے۔

جابر بن حیان کی تصانیف

جابر بن حیان کے تحقیقی آثار غیر قابل شمار ہیں۔ ان کی بہت سی کتابوں کی فہرست ذکر کی گئی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ابھی تک ان کے زیادہ تر نوشتہ جات مغرب و مشرق کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ جابر کے نوشتہ جات کی تقسیم کچھ یوں ہے :

ا۔ ایک سو بارہ مختصر کتابوں پر مشتمل تصنیف جس میں کیمسٹری پر جابر کے نظریات بیان کئے گئے ہیں اور عہد قدیم کے کیمیادانوں مثلاً ڈیمو کریٹس (Demokritos) وغیرہ کی آراء کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

۲۔ کتاب السبعین (The Book of Seventy)

کیمیاء میں جابر کے اپنے اصول و نظریات کا تفصیلی مجموعہ۔ یہ چالیس کتابوں پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں تیس مقالے ضمیمہ کئے گئے ہیں۔ بیس مقالے جمادات کے بارے میں اور دس نباتات کے بارے میں ہیں۔ یہ کتاب لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

۳۔ کتاب المیزان (الکبیر) (The Book of Balances)

ایک سو چوالیس کتابوں کا مجموعہ جس میں کیمیاء، فلسفہ، منطق اور باطنی علوم کے بارے میں جابر کی آراء شامل ہیں۔ انہی میں کتاب المیزان الصغیر ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ان میں دس تحقیقی مقالے ہیں جن میں جابر ایک ایک کر کے یونان کے مشہور فلاسفرز کی آراء کی تصحیح کرتے ہیں۔ انہی میں عناصر اربعہ یعنی پانی، ہوا، آگ اور مٹی پر مشتمل مقالے ہیں اور دو مستقل کتابیں الگ سے ان کی شرح میں لکھی گئی ہیں۔

۴۔ تین سو مختصر کتابیں فلسفہ پر اور پانچ سو کتابیں فلاسفرز کے جواب میں۔

۵۔ اسلحہ (جنگی آلات)، جنگی فنون اور عسکری ٹیکنالوجی پر ایک ہزار تین سو مختصر کتابیں۔

۶۔ ایک ہزار تین سو کتابیں حیل (باطنی علوم) پر۔

۷۔ علم طب (Medicine) پر دو تفصیلی کتابیں۔ ان کے علاوہ مختصر کتابیں اور مقالہ

جات جن کی کل تعداد پانچ سو ہے۔

اس کے علاوہ بھی منطق، زہد اور فلسفہ پر کتابیں اور مقالے شامل ہیں۔

شائع شدہ کتابیں

جابر بن حیان کی کچھ کتابوں کے تراجم بھی ہوئے ہیں اور ان میں کچھ شائع بھی ہوئی ہیں۔ برتھیلوٹ (Berthelot) نے لیڈن (Leiden) کے کتب خانہ سے ان کی کچھ کتابوں کے نسخے حاصل کر کے مندرجہ ذیل کتابوں کو شائع کیا:

(۱) کتاب الزئبق الشرقی والزئبق الغربی (۲) کتاب الموازین (۳) کتاب الملک (۴) کتاب ارض الاحجار (۵) کتاب الرحمتہ (۶) کتاب الرحمتہ الصغیر (۷) کتاب التجمیع۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۸ء میں ھولیارد نے جابر کے گیارہ تحقیقی مقالے شائع کئے۔ نیز کراوس نے قاہرہ میں جابر کی بہت سی کتابوں اور تحقیقی مقالوں کا خلاصہ کر کے اسے ۵۵۵ صفحات میں شائع کیا۔ (۱۳۵۴ھ۔ ب۔ کراوس) اس کتاب میں جابر کی بیس کتابوں کی تلخیص کی گئی ہے اور ان کی تفصیل کو آقا بزرگ طہرانی نے بھی ذکر کیا ہے (۲۴۴۴۔ الذریعہ جلد ۲۰)۔ آخری کتاب جو جابر کی تصانیف میں سے شائع ہوئی۔ رسالۃ فی دفع السموم و مضارھا۔ زہر اور اس کے مضر اثرات کو ختم کرنے کے بارے میں مقالہ۔ اسے عربی کے متن اور جرمنی زبان میں ترجمہ کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ کتاب رسائل جعفر صادق ہے جو پانچ سو رسالوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ہزار صفحات میں دو مرتبہ یورپ میں شائع ہو چکی ہے (رجوع کریں۔ کشف الظنون) تراجم میں کتاب الوجیہ اور کتاب السبعین لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اور اسی طرح کتاب المحسطی بھی لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس کا ایک نسخہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی لائبریری میں ابھی تک موجود ہے (کوریس کرستی) نیز کشف الاسرار وھتک الاسرار کو بھی انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۸۹۲ء میں شائع کیا گیا۔ نیز کتاب النار بھی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی جس کا ایک نسخہ مکتبہ آصفیہ میں ہے (کیمیاء۔ ۶۰)

جابر کی کتابوں کے نسخہ جات

جابر کی کچھ تصانیف ابھی تک مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں کچھ برٹش میوزیم لائبریری میں ہیں کچھ پیرس کی اہلیہ لائبریری (مکتبہ الاھلیتہ) میں کچھ لیڈن (Leiden) اور باقی برلن اور قاہرہ کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں جابر کی کچھ تصانیف کو سائیکلو اسٹائل (زنکوغرافی) کرا کے ہندوستان لے جایا گیا۔ ان میں مندرجہ ذیل کتب

شامل ہیں۔

۱۔ کتاب الاسطقس الاس الاول الی البرامکہ
۲۔ کتاب الاسطقس الاس الثانی الی البرامکہ
۳۔ کتاب الکمال
۴۔ کتاب النور
۵۔ کتاب البیان
۶۔ کتاب الاحجار
۷۔ کتاب الرحمتہ الصغیر
۹۔ کتاب التجرید

ان کتابوں میں سے آغا بزرگ تہرانی کے مطابق کتاب النور کو فخر الدین نصیری نے مرزا علی منجم باشی سے لے کر اس کی نسخہ برداری کی۔ اس کے علاوہ کتاب الرحمتہ الصغیر جو کیمیاء کے بارے میں ہے بمبئی میں ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔

برٹش میوزیم لائبریری میں خطی نسخوں کی فہرست

ہماری اطلاعات کے مطابق مذکورہ ذیل کتابیں اس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ممکن ہے کہ جابر کے نوشتہ جات میں ان کے علاوہ بھی مزید کتابیں محفوظ ہوں۔

کتاب التبویب ' کتاب الدرة المکنونه ' کتاب الاسرار ' کتاب الخواص ' کتاب التذکیر ' کتاب السبعین ' کتاب الوجیه ' کتاب کشف الاسرار و هتك الاسرار ' کتاب التجمیع ' کتاب الصافی ۔

مکتبہ اہلیہ پیرس میں

کتاب الواحد الصغیر ' کتاب الشمس (الذهب) کتاب الترکیب ' کتاب الترکیب الثانی ' کتاب الضمیر ' خواص اکسیر الذهب ' کتاب الرحمته الصغیر

مکتبہ قاہرہ میں

کتاب الحدود ' کشف الاسرار و هتك الاسرار۔ رساله فی علما بصنعته الالهیه و الحکمته الفلسفیه۔

اس کے علاوہ کچھ کتابیں Leiden' برلین اور آکسفورڈ کے (Trinity College) کی

لائبریری میں بھی محفوظ ہیں۔ کتاب الرحمتہ الکبیر کے دو نسخے لآ صفیہ میں ہیں۔ مذکورہ بالا کتابوں میں سے مستشرقین صرف ۲۲ کتابوں کی موجودگی اور ان میں سے پانچ کے شائع کئے جانے کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کے دوسرے اقوال کی طرح یہ قول بھی اعتبار نہیں رکھتا۔

ابن ندیم نے الفہرست میں ان کتابوں کی فہرست اور ان کی تفصیلات نقل کی ہیں۔ اعیان الشیعہ میں ان کی ۳۶۰ کتابوں کے نام ذکر کئے گئے ہیں۔ انہی میں کتاب السموم (The Book of Poisons) بھی شامل ہے۔ توجہ رہے کہ کیمسٹری اور طب میں زہر کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مکتبہ تیموریہ مصر میں ہے۔ ۵۰۳ھ شیراز میں اس کی ایک نقل لے کر محفوظ کی گئی۔ علی بن یوسف قفطی "تاریخ الحکماء" میں لکھتے ہیں کہ ابن مشاط اصطرلابی اندلسی نے مصر میں جابر بن حیان کا اصطرلاب (Astrolobe) یعنی چاند اور سورج کی مسافت اور درمیانی فاصلوں کی پیمائش پر ایک مقالہ (رسالہ) دیکھا ہے جس میں ہزار ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں وہ کسی قسم کی اطلاع نہ رکھتے تھے۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا (Britannica) اور امریکانا (Americanna) میں جابر کی مندرجہ ذیل کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے:

1- The sum of Perfection / Summa Perfectionis 1678
2- The investigation of Perfection,De investigatione perfectioins, 1678
3- The Invention of Truth
4- The Book of Furnaces
5- The Book of Seventy
6- The Book of Balances
7- The Invention of Verity/De Inventione Veritatis 1678

کتاب المیزان الصغیر (The Book of Seventy)

کتاب المیزان الصغیر کو جابر کے نظریات کی بنیاد بتلایا گیا ہے اور اس کا مختصر سا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب مطبوعہ ہے جس میں جابر میزان کے کئے معنی ذکر کرتے ہیں:

(الف) کشش ثقل (Specific gravity)

(ب) مرکب اشیاء میں اجزاء یا مختلف مادوں کی مقدار کا تناسب

(Law of reciprocal proportion)

(ج) میزان الحروف یعنی چار مختلف طبیعتوں یا مزاجوں یعنی سردی و گرمی اور رطوبت و خشکی کے بارے میں نظریہ۔ نظریہ میزان الحروف صرف اس دنیا میں موجود طبیعی اشیاء پر ہی گو نہیں ہوتا بلکہ عقل، نفس یا روح جیسی غیر مادی اشیاء کو بھی شامل کر لیتا ہے جن کا شمار مابعد الطبعیات (Metaphysics) میں ہوتا ہے۔

(د) میزان۔ مادے سے منزہ ذات یعنی خالق کائنات کے لئے استعارہ ہے اور میزان جابر کے توحیدی نظریات کا محور ہے۔

(ذ) میزان یعنی آیات کی تاویل اور ان کے حقیقی اور باطنی معنی اس لئے کہ خود قرآن کریم میں قیامت کے دن میزان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کے ذریعے جابر سائنسی علوم کو مذہبی علوم سے منسلک کرتے ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صرف تجربہ اور مشاہدہ (Observation) علوم کی پیدائش کا منشاء نہیں ہے بلکہ قرآن کریم اس ضمن میں تقویٰ کو ایک مستقل راستہ اور علوم کا منشاء بتاتا ہے (و اتقوا اللہ و یعلمکم اللہ۔ بقرہ: ۲۸۲) ہم سید جمال الدین کی تعلیمی آراء کے ضمن میں مشہور فلسفی فارابی کے نظریہ کو نقل کر چکے ہیں جس میں وہ صرف تجربہ کو علوم کا منشاء نہیں سمجھتے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے ذرائع ذکر کرتے ہیں جن میں آسمانی کتابیں خود ایک مستقل حیثیت سے برخوردار ہیں۔ اس کا ثبوت اسلام سے پہلے بھی ملتا ہے جب توریت و انجیل اپنی اصل حالت میں باقی تھیں اور علماء ان کی صحیح معرفت سے برخودار تھے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن اور اس باطن کی حقیقت تک وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جن کے پاس کتاب کا پورا علم ہو من عندہ علم الکتاب (رعد۔ ۴۳) اور جو اس کی تاویل اور اس کے چھپے ہوئے حقائق سے باخبر ہوں الا اللہ و الراسخون فی العلم (آل عمران۔ ۷) نیز جس کتاب میں ہر چیز کا بیان اور ہر مسئلہ کی وضاحت ہو اس کی اصل حقیقت کو صرف پاک و پاکیزہ اور طہارت سے سرشار لوگ ہی مس کر سکتے ہیں و لا یمسہ الا المطہرون (واقعہ۔ ۷۹) یہی وجہ ہے کہ علم عرفان شروع سے مسلمانوں کے درمیان چلا آرہا ہے اور سچے اور نیک اولیاء کی کرامات اس کا نتیجہ تھیں۔ یہ حقائق تمام علماء کے نزدیک قابل قبول ہیں۔ ان تمام آیات کے مصداق اور مظہر کامل سرور کائنات جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو کتاب و حکمت کے استاد تھے۔ انہوں نے خود کو علم کا شہر اور حضرت علی علیہ السلام کو اس کا دروازہ بتلایا۔ صحابہ کرام اور امت مسلمہ اپنے بھرپور اتفاق کے ساتھ ان کی اس علمی برتری کو

تسلیم کرتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے بعد قرآن و سنت میں انہیں اعلم کا درجہ دیتی ہے۔ وہ ان علوم کو مسلمانوں اور اہل بیت میں منتقل کرتے رہے اور دوسری صدی ہجری میں اہل بیت کی ایک نمایاں شخصیت امام جعفر صادقؑ کو ان علوم کی اشاعت کا خاصا موقع ملا۔ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہونے والوں کی ایک کثیر تعداد تھی جن میں ایک جابر بن حیان بھی تھے۔ لیکن اس نظریہ کا یورپ کے لئے ہضم کرنا خاصا مشکل ہے جو تجربہ و مشاہدہ کی عینک سے ہی ہر چیز کو دیکھنے کا عادی ہے اور علم اور مذہب میں تضاد کا قائل ہے۔

جابر کے تحقیقی آثار پر ایک نظر

جابر کی چھوٹی بڑی تصانیف اور مقالوں کی مجموعی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ توجہ رہے کہ عربی زبان میں کتاب کا لفظ ایک مختصر کتابچہ یا ایک تفصیلی کتاب کے ضمن میں موجود باب (Chapter) پہ بھی اطلاق ہوتا ہے۔ یوں تو مستشرقین اور اہل مغرب نے ابن ندیم کی ذکر کردہ جابر کی تصانیف کی فہرست کو قبول کر لیا ہے جسے خود جابر نے ذکر کیا تھا لیکن جو کتابیں ذکر کی گئیں ان میں سے پہلی تین کتابوں یعنی کتاب المائۃ و اثنی عشر، کتاب السبعین اور کتاب المیزان کو دائرۃ المعارف میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انہی علوم کے بارے میں ان کے پانچ سو مقالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان چار نوشتہ جات (مجموعوں) پر مشتمل تقسیم ہولمیار دنے کی ہے۔ انہوں نے جابر کی باقی تصانیف سے غفلت کی ہے جنہیں موثق ذرائع سے نقل کیا گیا ہے۔ لیکن خود جابر کی ذکر کردہ فہرست کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اتنی کثیر تعداد میں تصانیف ایک اکیلے دانشور یا فرد واحد کے تحقیقی آثار میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ اس سوال کے جواب میں مستشرقین نے ان آثار کو جابر سے نسبت دینے میں خاصے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔ جہاں تک اہل فن کا تعلق ہے تو وہ صراحت و قاطعیت کے ساتھ ان تمام آثار کو جابر بن حیان سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ جابر کی کتابوں کی طویل فہرست ذکر کرنے سے پہلے ابن ندیم لکھتے ہیں کہ یہ کتابیں انہوں نے یا بذات خود دیکھی ہیں یا ان موثق افراد سے نقل کی ہیں جنہوں نے انہیں دیکھا ہے۔ ابن خلکان امام صادقؑ کے شرح حال کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ امام صادقؑ نے کیمیاء اور دوسرے علوم میں کچھ اصول تعلیم دیئے تھے۔ ان کے شاگرد جابر نے ایک ہزار صفحات پر مشتمل کتاب تدوین کی جس میں امام کی آراء اور ان سے منقولہ احادیث شامل کی گئیں۔ تیزیافعی اور صاحب روضات الجنات نقل کرتے ہیں کہ جابر نے امام صادقؑ سے نقل کی جانے والی احادیث پر مشتمل پانچ سو رسالے تصنیف کیے۔ جابر بن حیان کی کتابوں سے محمد بن زکریا رازی

نے استفادہ کیا' ان کی آراء کو نقل کیا اور انہیں اپنا استاد قرار دیا۔ توجہ رہے کہ مغربی دانشور زکریا رازی کی علم طب پر تصانیف کو کچھ حوالوں سے ابن سینا کی القانون سے بہتر سمجھتے ہیں اور انہیں ایک بہتر طبیب (Clinician) قرار دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جابر صرف کیمیاء دان نہیں تھے بلکہ طب میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور رازی جیسا فلسفی اور طبیب انہیں اپنا استاد تسلیم کر رہا ہے اس کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور و معروف سائنسدان اور فلسفی سلیمان المنطقی (وفات ۳۷۰ھ / ۹۸۰ء) نے اپنی "تعلیقات" میں ایک یادداشت لکھی ہے جس میں وہ اس امر کی تصدیق کر دیتے ہیں کہ یہ تمام تصانیف جابر بن حیان کی ہیں۔ وہ بذات خود تحقیقات انجام دینے کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے ہیں اور ان نوشتہ جات کے مصنف کی شناخت کر چکے ہیں۔ سلیمان المنطقی کی اس یادداشت کی تردید مستشرقین بھی نہ کر سکے لیکن انہوں نے یہ شرط ضمیمہ کر دی کہ یہ تمام نوشتہ جات ایک فرد کے نہ ہوں۔ مستشرقین جابر کی تصانیف کی اس فہرست کو جسے ابن ندیم نے پیش کیا ہے اور جس میں خود جابر کی ذکر کردہ فہرست کا حوالہ ہے' صحیح اور ناقابل تردید سمجھتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں یہ اعتراف بھی کرتے ہیں :

``No al-Chemical work on Islam reveals such vast knowledge of ancient literature or has such an encyclopaedic character as the writings of Djabir.``

"عالم اسلام میں آج تک کسی کیمیاء دان کے نوشتہ جات قدیم علوم پر اتنا وسیع احاطہ نہیں رکھتے اور نہ ہی دائرۃ المعارف نما حیثیت سے برخوردار ہیں جو کہ جابر کے نوشتہ جات کو حاصل ہے۔"

اگر وہ انصاف سے کام لیتے تو انہیں یہ اعتراف کرنا چاہئے تھا کہ سرزمین مغرب میں بھی کسی کو یہ حیثیت حاصل نہیں! بہر حال ان اعترافات کے باوجود بھی وہ اس ضمن میں شکوک و شبہات کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس مفروضہ کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے دانشوروں نے کتابیں لکھ کر جابر کے نام سے منسوب کر دیں۔ اور باوجودیکہ ابن ندیم نے سختی کے ساتھ اس کی تردید کی ہے اور اہل علم دانش کے بارے میں اس پستی کو ناروا قرار دیا ہے لیکن وہ ابن ندیم کی رائے کو بھی غلط صورت دینے کی سعی پیہم کرتے ہیں۔ دراصل اس ضمن میں ان کے سامنے دو مشکلات ہیں :

۱۔ اسلام میں علم کی تاریخ

۲۔ اتنی وافر مقدار میں کتابوں کو فرد واحد سے نسبت دینا

جہاں تک پہلی مشکل کا تعلق ہے تو وہ تیسری صدی ہجری کو اسلام اور عرب دنیا میں یونانی

علوم کے آغاز کی صدی قرار دیتے ہیں۔ اپنے اس مفروضہ کی تائید میں وہ حنین بن اسحاق نامی نصرانی طبیب (وفات ۸۷۷ء) کو پیش کرتے ہیں جس نے مامون کے دور میں اور اس کے زیر نظر یونانی علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا۔ اور چونکہ جابر بن حیان سے منسوب کتابوں میں بھی وہی اصطلاحات موجود ہیں جنہیں حنین ابن اسحاق نے رائج کیا تھا لہٰذا یہ تصانیف تیسری صدی ہجری کی ہیں نہ دوسری صدی ہجری کی جب جابر بن حیان حیات تھے۔

جو دلیل مستشرقین نے پیش کی ہے اس سے ہرگز ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا اس لئے کہ عین ممکن ہے کہ جابر بن حیان کی تصانیف میں استعمال شدہ اصطلاحات سے حنین ابن اسحاق نے استفادہ کیا ہو جو زمانہ کے لحاظ سے لاحق تھے اور تیسری صدی ہجری میں تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کا یہ مفروضہ ہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ علوم مامون کے دور میں ترجمہ ہونے کے بعد منتقل ہوئے اس لئے کہ اولاً تو وہ علوم کے مرکز اور سرچشمہ ہی سے غافل ہیں۔ ثانیاً یہ کہ علم و تمدن کے حوالہ سے ہارون الرشید کے دور کو بھی ایک یادگار دور سمجھا جاتا ہے اور مشرق و مغرب کے الحادی نظریات اور زندیقوں سے عرب دنیا کی آشنائی اس سے بہت پہلے ہی ہو چکی تھی جب مسلمان ہر روز اپنی فتوحات میں اضافہ کر رہے تھے۔ کچھ مغربی دانشوروں نے اس ضمن میں یہ مفروضہ بھی قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ جابر چودہویں صدی کا ایک مغربی کیمیاء دان تھا جس نے اپنی کتابوں کا اعتبار بڑھانے کے لئے اسے عرب کیمیادان جابر بن حیان کے نام سے منسوب کر دیا۔ اس مفروضہ کو پیش کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یورپ کیمیاء میں موجود ان مسائل پر چودھویں صدی میں پہنچ سکا تھا جبکہ عرب کیمیا دان جابر بن حیان آٹھویں صدی عیسوی میں تھے۔ جہاں تک دوسری مشکل کا تعلق ہے کہ کیا اتنی ساری تصانیف کو فرد واحد سے نسبت دی جا سکتی ہے۔ اگرچہ عام طور پر یہ ایک نہ ہونے والی بات ہے لیکن انسانیت کی تاریخ میں ایسے بہت سے غیر معمولی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے عام طور پر بہت سے نہ ہونے والے کام کر دکھائے ہیں۔ عملی طور پر ایسا ممکن ہے اور خداوند عالم جسے چاہتا ہے اسے علم اور توانائی عطا کرتا ہے۔ پھر یہ توجہ رہے کہ ایک کتاب اگر مختصر ہو تو دو تین صفحات کی بھی ہو سکتی ہے مخصوصاً اگر وہ کسی تصنیف کا باب ہو۔

مستشرقین نے اپنے شکوک و شبہات کا دائرہ یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ جابر کو ایک افسانوی کردار بتانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ابن ندیم اس قسم کے خدشات کا بڑا ٹھوس جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ شخصیت وجود رکھتی تھی اور ان کا کام ہر چیز سے زیادہ واضح و روشن ہے۔ معیار اور تعداد

دونوں میں ان کی تصانیف ہر اہل قلم سے کہیں زیادہ ہیں۔ انہوں نے شیعہ مذہب پر بھی کتابیں لکھیں جنہیں ہم اپنے مقام پر نقل کر چکے ہیں اور دوسرے علوم میں بھی ان کی وافر مقدار میں کتابیں ہیں۔ ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ ذکر کیا ہے۔"

مستشرقین ان تمام حدوں سے تجاوز کرتے ہوئے جابر بن حیان کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کے گرد الزامات اور ناروا تہمتوں کا پہاڑ کھڑا کرنے کے خواہاں ہیں تاکہ مختلف ٹھپے لگا کر عالم اسلام کو علم و دانش کے اس مرکز سے محروم کر دیں۔ وہ عالم اسلام کی عظیم شخصیات کے بارے میں اپنا یہ حربہ ضرور آزماتے ہیں اور اس کی کامیابی پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ جابر کو کبھی قرامطہ و اسماعیلیوں سے نسبت دیتے ہیں (کیونکہ جابر کی تصانیف اور قرامطہ کی کتابوں میں ملتی جلتی اصطلاحات ہیں) کبھی نصیریوں سے اور کبھی بت پرستوں سے ان کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ وہ ان کے شیعہ ہونے اور امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں شمولیت کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ کچھ شیعہ کتب میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے شیعہ ہونے یا نہ ہونے سے وہ کیا نتیجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اس سے کیا مقصد۔ ؟ جہاں تک جابر کا تعلق ہے تو وہ ایک سچے مسلمان تھے جو امام صادقؑ کے حلقہ درس میں شامل تھے۔ اس کی تصدیق اہل فن کر چکے ہیں اور رہا شیعہ کتب کا مسئلہ تو ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے لیکن اگر کسی کو شوق ہو تو وہ اعیان الشیعہ 'طب الآئمہ (ابنی بسطامی)' معجم الرجال الحدیث' روضات الجنات' اور ابن طاؤس کی فرج الهموم بمعرفته علوم النجوم کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

ابن خلدون کی غلط رائے

جابر بن حیان کے بارے میں مستشرقین سے کہیں زیادہ ابن خلدون (وفات ۸۰۸ھ / ۱۴۰۶ء۔ Ibn-e-Khallidoon) کی رائے پر حیرت و افسوس کرنا چاہئے جو جابر بن حیان جیسے علم و دانش کے آسمان کو ایک جادوگر قرار دیتے ہیں۔ وہ کیمیاء پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے صنعت ماننے سے انکار کرتے ہیں اور روحانی نفوس کے اثرات میں سے قرار دیتے ہیں۔ ان کی تنگ نظری کا یہ حال ہے کہ وہ پوری کیمسٹری کو صرف اس مسئلہ میں محدود کر دیتے ہیں کہ آیا دھاتوں کو سونے سے بدلا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ان کی یہ لاعلمی غیر قابل معافی ہے اس لئے کہ وہ جابر بن حیان سے تقریباً چھ صدیوں بعد معرض وجود میں آئے اور اس وقت تک کیمسٹری خاصی ترقی کر چکی تھی۔ وہ جابر کے کچھ باطنی علوم علم جفر (سیمیاء) اور اسی طرح علم نجوم پر بھی اعتراض

کرتے ہیں۔ جہاں تک علم جفر کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ان کی رائے اس لئے حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی کیونکہ ضروری نہیں کہ وہ اس کی اصل و حقیقت سے واقف ہوں اور جس علم کی وہ تردید کر رہے ہیں وہی جابر نے استعمال کیا تھا۔ رہا علم نجوم کا مسئلہ تو فریقین کے علماء اور فقہاء علم نجوم کو مطلقاً حرام قرار نہیں دیتے بلکہ سمتیں معلوم کرنے، قمری تاریخیں دریافت کرنے اور اس جیسے دوسرے کاموں کے لئے اسے صحیح سمجھتے ہیں اور قرآن کریم نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے۔ "وعلامات و بالنجم هم يهتدون" (نحل۔ آیت نمبر ۱۶)

"اور نشانیاں اور ستاروں کے ذریعے سے وہ ہدایت پاتے ہیں۔" (راستوں کی ہدایت)

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تمام علوم و فنون میں جابر کی ہزاروں کتابوں کو نظر انداز کر کے ایک دو کتابوں کو پکڑ لیا جائے اور بغیر تحقیق و جستجو کے انہیں اہل علم و جادو قرار دیا جائے۔ اسلامی دنیا کی یہ ستم ظریفی ہے کہ اس کے دانشور انہی جزوی مسائل کا شکار ہو کر اپنے بڑوں کے فیض سے محروم ہو جاتے ہیں اور دوسری قومیں آ کر ان کے افکار و نظریات سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

یوں تو اسلامی دنیا میں اور عربوں میں بھی بہت سے دانشوروں نے جابر بن حیان پر قلم اٹھایا ہے اور ان میں ڈاکٹر محمد یحییٰ ہاشمی اور تاریخ الفکر العربی کے مصنف اسماعیل مظہر اور دوسرے حضرات شامل ہیں لیکن ہم ان میں سے ڈاکٹر احمد فواد اہوانی کی آراء کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جو انسان اس دنیا میں اتنی شہرت کمائے بجا ہے کہ اس کے گرد افسانے گھڑے جائیں اور کچھ مورخ و محقق اس کے بارے میں اس حد تک مبالغہ سے کام لینے لگیں کہ سرے سے اس کے وجود اور اس کی حقیقت ہی میں شک کرنے لگیں اور اس میں بھی کہ آیا وہ ہی ان تمام تصانیف کے صاحب اور مالک تھے یا کسی اور نے ان تصانیف کو مرتب کر کے ان کے نام سے منسوب کر دیا۔ پہلا شخص جس نے جابر کے وجود میں شک کیا احمد بن نباتہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علم کیمیا کا سرے سے منکر تھا۔ علمائے عرب کے درمیان (Chemistry) کیمیا کے وجود پر صرف ایک مسئلہ کی وجہ سے اختلاف ہوا کہ آیا کیمیا کے ذریعے سے چاندی، تانبے یا دوسری دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے یا نہیں"۔۔۔؟

ہم جابر بن حیان کی شخصیت کو اس کی اصل حقیقت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے اور ان کی شخصیت پر ہونے والے اعتراضات اور ان کے کردار کے اطراف میں موجود گرد و غبار کو برطرف کرنے کے خواہاں تھے تاکہ اسلامی دنیا انہیں آنکھیں کھول کر دیکھ سکے اور علوم و فنون میں اپنے لئے نمونۂ عمل اور آئیڈیل بنا سکے۔ شاید اس طرح انہیں یہ باور ہو جائے کہ جب

ہزار سال پہلے وہ علم و دانش میں اتنی عظمت اور سربلندی حاصل کر سکتے تھے تو آج کیوں نہیں کر سکتے؟ اگر مسلمان دانشور جابر کے نوشتہ جات اور علمی آثار پر اپنی تحقیقات کا خود سے آغاز کریں اور جابر کی تصانیف کا وہ حصہ جو اصطلاحات و رموز سے عدم واقفیت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا تھا' اسے آج کی دنیا میں پیش کریں تو وہ ان علوم پر ایک جدید باب کھولنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اس لئے کہ یورپ آج بھی فلسفہ و منطق اور دوسرے اصولوں پر قائم ان علوم سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہے!

مدارک

قرآن کریم

B.Lewis Ch.Pellat... The Encyclopedia of Islam, Leiden E.J. Brill, 1991, Vol. II, PP, (357-359)

أحمدشنتناوی ابرہیم زکی' دائرۃ المعارف الاسلامیہ' مصر: وزارۃ المعارف العمومیہ' ۱۹۳۳' جلد ششم' صفحہ ۲۳۲' ۲۲۸ ; احمد امین عاملی' اعیان الشیعہ' بیروت : ۱۹۸۳' جلد چہارم صفحہ ۳۰

ابوالقاسم خوئی' معجم الرجال الحدیث' قم : مرکز نشر آثار شیعہ ۱۹۹۰ء

ابن الندیم' کتاب الفہرست' ترجمہ' رضا تجدد' ایران: چاپخانہ بانک بازرگانی' ۱۹۴۷ء' ص ۶۴۰-۶۳۶ ؛ ابن خلدون' مقدمہ ابن خلدون' کراچی : نفیس اکیڈمی' ۱۹۸۶ء' حصہ دوئم' صفحہ ۲۲۸' ۴۴۹' ۴۰۱ ؛ المنجد فی اللغۃ والعلوم' بیروت : منشورات دار المشرق' ۱۹۹۲' آقا بزرگ طہرانی' الذریعہ الی تصانیف الشیعہ بیروت : دار الاضواء جلد بیستم صفحہ ۱۷۱' کتاب نمبر (۲۴۴۴) و جلد ۲۴' ۱۹۸۷ء صفحہ ۳ کتاب نمبر (۲۴) و جلد دھم' ۱۹۸۲ء صفحہ ۱۷۱ و کتاب نمبر (۳۴۰-۳۳۹)

سید امیر علی' روح اسلام (Spirit of Islam) ' ترجمہ محمد ہادی حسین' لاہور : ادارہ ثقافت اسلامیہ' ۱۹۹۰ء' ص ۸۱ (ضمیمہ نمبر ۳)

The Encyclopedia Americanna, USA:
Grolier Incorparated, 1991, vol. 12, p .359

New Encyclopedia Britannica, USA : 1997.
Ready Reference vol. V, p.160

سید جمال الدین افغانیؒ

انیسویں صدی کی ایک جانی پہچانی شخصیت جو اہل نظر کے لئے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشہور شخصیات قدر دان لوگوں کی عدم موجودگی اور پڑھے لکھے طبقے کی غفلت کے باعث آنے والی نسلوں کے لئے گمنام بن جاتی ہیں۔ گاندھی جی نے افریقا کے ایک محدود علاقے میں آزادی کی تحریک چلائی اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو نتیجہ تک پہنچادیا تو انہیں ہندو قوم نے مہاتما کا لقب دیا۔ سید جمال الدینؒ نے پوری اسلامی دنیا میں تہلکہ مچادیا، آزادی کی تحریکیں چلائیں، اسلامی افکار کو زندہ کیا اور مشرقی اقوام کو مغرب کی غلامی سے نکالا لیکن انہیں عالم اسلام میں شایان شان رتبہ نہیں دیا گیا۔ ان کی زندگی کی مختصر سی کتاب لکھنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس دور کے لوگ آزادی کی نعمت کو غنیمت سمجھیں، اسلامی اقدار کو زندہ کریں اور گذشتہ ایام سے سبق اور عبرت حاصل کر کے انحطاط اور پسماندگی کے اسباب کو خود سے دور کریں اور عزت، عظمت و سربلندی کے لئے قدم اٹھائیں اور اگر اس دور کے لوگ ایسا نہ کریں گے تو کبھی بھی بیرونی اقوام کی غلامی سے مکمل طور پر نجات حاصل نہ کرپائیں گے۔ مسلمان اس وقت صحیح معنوں میں دین اسلام پر عمل کر سکتے ہیں اور عزت و شرافت حاصل کر سکتے ہیں جب ہر دور اور ہر وقت کے فرعون کی غلامی سے رہائی پائیں۔

یہ درس آزادی ہمیں سید جمال الدین کی مجاہدانہ زندگی کی کتاب کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس کتاب کی ورق گردانی سے پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے بارے میں ان کے سرسخت دشمنوں کے تاثرات کی طرف مختصر سا اشارہ کرتے چلیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

میں مندرجہ ذیل سطریں ان کے بارے میں موجود ہیں:

Al-Sayiyid Muhammad B.Safdar, one of the most remarkable figures in the muslim world in the XIX century. He was in the opinion of E.G.Brown at once philospher, author, orator and journalist but above all he was a poltician regarded by his opponents as a dangerous agitator DJmal-al-din was one of the most convinced champions of the pan Islamic idea with tongue and pen.

السید محمد بن صفدر، مسلمان دنیا میں انیسویں صدی کی نمایاں ترین شخصیت ای۔جی براؤن کی نظر میں وہ ایک فلسفی، مصنف، خطیب اور صحافی تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک ایسے سیاستدان تھے کہ جنہیں ان کے حریف اپنے لئے اشتعال پھیلانے والا ایک شورشی سمجھتے تھے جو لوگوں کو مشتعل کردے۔ جمال الدین کے قلم اور ان کی زبان نے انہیں نظریۂ اتحاد اسلامی کے نمایاں ترین رہنما کی سطح تک لاکھڑا کیا تھا۔

وطن

سید جمال کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کابل کے اطراف میں واقع کنرنامی علاقے میں ساکن ایک ایسے خاندان میں ان کی ولادت ہوئی جس کا سلسلہ سید علی ترمذی سے ملتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دلائل نہیں اور انہوں نے اس ضمن میں سید جمال کے بیانات پر اکتفا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ان کے عہد طفولیت اور ان کی ابتدائی تعلیم کی تفصیلات سے یکسر ناواقف ہیں۔ سید جمال یا تو عرب دنیا میں کام کرنا چاہتے تھے یا قومیت کے بھوت سے نکلنا چاہتے تھے یا ایران کی سفارتوں سے محفوظ رہنا چاہتے تھے بہر حال وجوہات کچھ بھی ہوں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ افغانی کا اضافہ کرلیا تھا اور خود کو اہل افغان متعارف کرایا تھا۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ ایران میں پیدا ہوئے یا نہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ ایرانی ہر بڑے دانشور اور مفکر کو ایرانی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دلائل اور اسناد و مدارک بخوبی ثابت کرتے ہیں کہ ان کی ولادت ایران کے ایک شہر اسد آباد میں ہوئی جو ہمدان کے قریب واقع ہے۔ لیکن اس سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ایران کو اپنا وطن قرار دیتے تھے۔ ایک ایرانی مصنف نے انصاف سے کام

لیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نہ ایران کے تھے نہ افغانستان کے بلکہ تمام اسلامی ممالک کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اپنا نام سید جمال الدین حسینی لکھتے تھے اور رسول پاک کی پاکیزہ نسل سے ہونے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔

تعلیم

سید جمال کی ولادت ۱۲۵۴ھ.ق 1838 A-D اسد آباد میں سیدان نامی محلہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید صفدر اور والدہ کا نام سکینہ بیگم تھا۔ ان سے ایک بڑے بھائی سید مسیح اللہ اور دو بہنیں طیبہ بیگم' مریم بیگم تھیں اور وہ اپنے گھر کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کے بھائی کے بیٹے سید کمال الدین اور بہنوں کے بیٹے مرزا لطف اللہ اور مرزا شریف ان کے بعد سالہا سال تک زندہ رہے لیکن ان سب میں مرزا لطف اللہ اپنے ماموں کے علم و دانش اور ذکاوت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ مرزا لطف اللہ کو جوانی میں اپنے ماموں کو قریب سے دیکھنے اور ان کی زندگی کے واقعات کو مختصر طور پر لکھنے کا موقع ملا۔ لطف اللہ کی تصنیف کردہ کتاب (شرح حال و آثار سید جمال) محققین کے لئے سید جمال کی زندگی پر قیمتی دستاویزات فراہم کرتی ہے۔

سید جمال کے والد ماجد سید صفدر خود اہل علم میں سے تھے لیکن زراعت کرتے تھے۔ جب سید جمال کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو ان کے والد نے انہیں قلم و کتاب سے آشنا کیا اور عربی زبان کے اصول و قواعد (گرامر) کے ساتھ ساتھ قرآن کریم پڑھنا سکھایا۔ وہ عہد طفولیت ہی سے کلام پاک کی آیات پر غور و فکر کرتے اور آیات کے صحیح معنی' مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ ان کے والد الم نشرح کا لفظی ترجمہ کر رہے تھے تو وہ اپنے والد سے اصرار کرتے ہیں کہ وہ اس آیہ کریمہ کی حکمت واضح کریں اور بتائیں کہ وہ کون سا بوجھ تھا جو نبی کریم کی کمر توڑ رہا تھا۔ ان کے والد نے مختصر طور پر اس کی وضاحت کی لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے کہا کہ جب تک اس کے معنی واضح نہ ہوں گے وہ درس نہیں پڑھیں گے۔ تین چار دن اسی حالت میں گزر گئے والد اصرار کرتے لیکن وہ نہ مانتے۔ اسی اثناء میں جبکہ وہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھے وہ والد کے پاس آ کر کہتے ہیں کہ آج کے دن اس سورہ مبارکہ کی حقیقت میرے لئے واضح ہو گئی ہے اور یہ کہنے کے بعد والد کے سامنے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ والد فرط محبت سے ان کا ماتھا چوم لیتے ہیں اور سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں۔ ان کی ذکاوت اور غیر معمولی استعداد سے متعلق اس جیسے بہت سے واقعات نقل کئے گئے ہیں۔

۱۲۶۴ھ.ق/۱۸۴۸ء میں جب ان کی عمر دس سال کی ہوئی تو مزید علوم کی تحصیل کے

لئے ان کے والد انہیں قزوین نامی شہر لے گئے۔ مرزا لطف اللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"حصول علم کا انہیں اس حد تک ذوق و شوق تھا کہ جمعہ اور عید کے دن بھی چھٹی نہ کرتے۔ والد بہتیرا اصرار کرتے کہ شہر کی تفریح کے لئے چلو تو وہ جواب دیتے کہ مٹی کے بنے ہوئے گھروں کو دیکھ کر وہ کیا کریں گے۔ ناچار والد گھر کا تالا لگا کر چلے جاتے جب واپس پلٹتے تو دیکھتے کہ کتابوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے اور اس انبار میں ان کا نونہال بیٹھا مطالعہ میں غرق ہے"

قزوین میں دو سال گزارنے کے بعد ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں جبکہ ان کی عمر کے صرف بارہ سال گزرے تھے ان کے والد انہیں تہران لے آتے ہیں اور اپنے دوست سلیمان خان کے گھر ٹھہراتے ہیں جو اسد آباد کے سابق حکمران بھی تھے۔ تہران میں سید جمال الدین اس وقت کی مشہور شخصیت سید صادق مجتہد کو اپنی ذکاوت و نبوغ سے متاثر کرتے ہیں اور پھر وہ اپنے والد کے ساتھ عراق کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں تاکہ اسلامی علوم کے مرکز نجف میں باقی علوم حاصل کر سکیں۔ راستہ میں شہر بروجرد میں ان کی ملاقات حاجی مرزا محمود مجتہد سے ہوتی ہے سید جمال تین ماہ ان کے گھر مقیم رہتے ہیں اور ان کے سامنے بھی زانوئے تلمذ طے کرتے ہیں اور پھر نجف میں اپنے والد کے ہمراہ شیعوں کے عالمی پیشوا شیخ مرتضیٰ انصاری کی خدمت میں پہنچتے ہیں۔ شیخ انصاری اس کم سنی میں یہ نبوغ اور تعلیم و تعلم کی اتنی غیر معمولی استعداد دیکھ کر ان کے لئے ایک گھر کا انتظام کرتے ہیں۔ تین ماہ قیام کرنے کے بعد ان کے والد واپس اسد آباد چلے جاتے ہیں لیکن سید جمال چار سال تک اسلامی و غیر اسلامی علوم کی تحصیل کرتے رہتے ہیں۔ وہ علم تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام اور عقلی علوم یعنی منطق، فلسفہ یا حکمت الٰہیہ، علم طبیعی (Physics) ریاضی اور ہیئت و نجوم میں مہارت حاصل کرتے ہیں اور ان کے تمام ماٰخذ کو کھنگال ڈالتے ہیں۔ ان کے اساتذہ میں شیخ انصاری اور صوفی آخوند ملا حسین ہمدانی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اب وہ ایک طالب علم نہ رہے تھے بلکہ ایک کمسن مفکر اور ایسے اہل نظر بن گئے تھے جس کے سینے میں علوم و افکار کا ایک سمندر تھا اور جو ہر خشک و تر کے بارے میں ایک گہری نظر رکھتا تھا۔ ان کی شہرت نجف کے علمی حلقوں تک پہنچ گئی تھی اور اب ہر محفل میں ان کا چرچا تھا۔ ان کے افکار کی زد میں کچھ ایسے علماء بھی آ گئے جو فکری جمود کے حامل تھے اور ہر طرح کی اصلاحات کے مخالف تھے۔ اس طرح بحث و مباحثہ کا دروازہ کھل گیا اور سید جمال پوری جرات کے ساتھ اپنی بات کہتے تھے۔ یہ مباحثے شیخ انصاری کی موجودگی میں بھی ہوتے اور بسا اوقات وہ سید جمال کی حمایت کرتے لیکن جب علم کے لباس میں موجود چند پست فطرت لوگ عالم اسلام کے اس عظیم نابغہ

کے وجود کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئے تو شیخ انصاری نے انہیں ایک سن رسیدہ بزرگ کے ہمراہ ہندوستان روانہ کر دیا تاکہ وہاں جدید طرز پر باقی علوم حاصل کریں اور مسلمانوں کے حالات و مسائل کو نزدیک سے دیکھیں۔

۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں بمبئی میں مغربی طرز پر وہ جدید علوم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ایک سال اور کچھ ماہ تک بمبئی میں رہتے ہیں اور پھر حج کی نیت سے مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ہندوستان خود کو جنگ آزادی کے لئے تیار کر رہا ہے۔ ہمارے لئے یہ واضح نہیں کہ اس جنگ آزادی میں انہوں نے کیا کردار ادا کیا لیکن اتنا واضح ہے کہ ان کی غیر معمولی شخصیت اور افکار و نظریات نے اس تحریک کے سرکردہ افراد کو ضرور متاثر کیا ہو گا۔

مختلف ملکوں کی سیاحت کے بعد ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں ہم انہیں مکہ المکرمہ میں دیکھتے ہیں جو خانہ کعبہ کے حج کے لئے آئے ہیں' وہ مدینہ منورہ میں روضہ رسولؐ کی زیارت کرنے کے بعد شام و فلسطین سے ہوتے ہوئے عراق پہنچتے ہیں اور وہاں سے ایران آتے ہیں۔ یہ ایران کا پہلا غیر رسمی سفر ہے۔ وہ بمشکل چند دن اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارنے کے بعد تہران آتے ہیں اور چند مہینے وہاں رہنے کے بعد خراسان کے راستے افغانستان چلے جاتے ہیں۔

افغانستان۔

۱۲۷۸ھ ق / ۱۸۶۲ء میں ہم انہیں افغانستان میں دیکھتے ہیں جو وہاں کے بادشاہ امیر دوست محمد خان کے حضور شرفیاب ہو چکے ہیں۔ امیر دوست محمد خان حال ہی میں برطانیہ کے شکنجے سے نکل کر آزاد ہو چکے ہیں اور جلال آباد پر قابض ہیں۔ لیکن اپنے چچازاد بھائی سلطان احمد خان کے حملوں سے امان میں نہیں۔ ہرات کے محاصرہ میں جو امیر دوست محمد خان کی جانب سے کیا جاتا ہے' سید جمال ان کے ہمراہ ہوتے ہیں اور ان جیسے وزیر باتدبیر کی ہمراہی میں بغیر کسی جنگ کے ہرات کی مہم سر ہو جاتی ہے۔ لیکن اتفاق سے اسی سال یعنی ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خان وفات پا جاتے ہیں اور ان کے چار بیٹوں میں سے شیر علی خان ان کا ولی عہد بن جاتا ہے۔ دوست محمد خان کا ایک اور بیٹا محمد اعظم خان شیر علی خان کی بیعت نہیں کرتا اور اس بادشاہت کو اپنے سب سے بڑے بھائی محمد افضل خان کا حق سمجھتا ہے لیکن حالات کی نزاکت اور دوسرے دلائل کی بنا پر سید جمال اسے تیار کر لیتے ہیں کہ وقتی طور پر کیوں نہ سہی وہ شیر علی خان کی بیعت کر لے۔ محمد اعظم خان نے دکھانے کے لئے تو بیعت کر لی تھی لیکن دل سے راضی نہ تھا۔ لہذا ۱۸۶۶ء / ۱۲۸۲ھ میں وہ بغاوت کا پرچم بلند کرتا ہے اور اپنے بھائیوں کو جمع کر کے

کابل پر چڑھائی کرتا ہے لیکن کابل کے اطراف میں شیر علی خان کی سپاہ سے مختصر سے مقابلے میں اسے شکست ہو جاتی ہے اور وہ جنوب افغانستان کی طرف فرار کر جاتا ہے۔ اس کے بعد امیر شیر علی خان محمد رفیق خان لودھی اور سید جمال کے ہمراہ کابل میں وارد ہوتے ہیں اور محمد رفیق کو اپنا صدر اعظم اور سید جمال کو مشیر خاص قرار دیتے ہیں۔ محمد رفیق خان سید جمال کے مقام و موقعیت سے حسد کرتا ہے اور اسے یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ سید جمال اس کی صدارت نہ چھین لیں لہذا وہ سید جمال کے افکار و اصلاحات کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ چنانچہ سید جمال افغانستان میں مزید وقت صرف کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستان چلے گئے ہیں لیکن اس کے بر خلاف وہ ایران آتے ہیں اور افغانستان واپسی کے لئے ایک مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔

اس دوران شیر علی خان اپنے بھائی محمد اعظم خان کے حملوں کی زد میں ہوتا ہے۔ آخر کار اسے شکست ہو جاتی ہے اور وہ قندھار بھاگ جاتا ہے۔ اس کے صدر اعظم محمد رفیق خان لودھی کو قتل کر دیا جاتا ہے اور محمد اعظم خان سب سے بڑے بھائی محمد افضل خان کو بادشاہ بناتا ہے۔ وہ قندھار پر حملے کا پروگرام ترتیب دے رہا ہوتا ہے کہ سید جمال ہرات اور کوئٹہ کے راستے سے قندھار پہنچتے ہیں اور اس مرتبہ محمد اعظم خان کا ساتھ دیتے ہیں۔ قندھار کی مہم سر کرنے کے بعد وہ محمد اعظم خان کے ہمراہ کابل چلے جاتے ہیں۔ افضل خان کی وفات کے بعد جب محمد اعظم خان امیر بن جاتا ہے تو اس کے دربار میں سید جمال الدین کا رتبہ اور مقام بہت بلند ہو جاتا ہے۔ برطانیہ اس میں صلاح نہیں دیکھتا کہ افغانستان میں کوئی ایسی حکومت پیر جما سکے جس کے وزیر با تدبیر سید جمال الدین جیسے مفکر ہوں لہذا شیر علی خان کی مکمل حمایت اور پشت پناہی کرتا ہے اور کابل ایک بار پھر شیر علی خان کے قبضے میں آجاتا ہے۔ محمد اعظم خان فرار کر جاتا ہے لیکن سید جمال الدین کابل میں باقی رہتے ہیں۔ ان کی گذشتہ خدمات اور دیانتداری کے سبب انہیں معاف کر دیا جاتا ہے لیکن گویا یہ ان کی زندگی کے تلخ ترین ایام ہوتے ہیں جب چاروں طرف سے انہیں تہمتوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ہر سیاسی پارٹی' فرقہ' عوام اور گروہ ان کے بارے میں ایک الگ عقیدہ رکھتا ہے۔ کوئی انہیں شیعہ سمجھتا ہے تو کوئی وہابی' کوئی زندیق' کوئی ایرانی' کوئی حنفی۔ اپنے ایک خط میں وہ ان حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں اور شیر علی خان سے خانۂ کعبہ کی زیارت کی اجازت لے کر ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء میں افغانستان سے چلے جاتے ہیں۔ ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ ایران سے عبور نہ کریں کہ مبادا محمد اعظم خان سے ان کی ملاقات ہو۔

افغانستان میں اصلاحات

افغانستان میں سید جمال الدینؒ کی جانب سے کی جانے والی اصلاحات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ ان اصلاحات پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنی اقامت کے دوران انجام دیں۔ انہوں نے افغانی قوم میں شعور پیدا کرنے اور بیداری کی روح ڈالنے کیلئے افغانستان پر ایک مختصر سی تاریخ لکھی جس کا عنوان ہے "تتمة البیان فی تاریخ الافغان" اس کے علاوہ شمس النہار نامی جریدے کو شائع کیا اور اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے افغانیوں کو برطانیہ کی سازشوں سے آگاہ کیا اور ان کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

دوسرا حصہ ان اصلاحی آراء پر مشتمل ہے جنہیں وہ روانگی سے قبل امیر شیر علی خان کے سپرد کر گئے تھے تاکہ انہیں عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ غلام جیلانی اور قاسم رشتیا دو افغانی مؤرخ مجلۂ کابل میں ان اصلاحی تجاویز کی تفصیل یوں پیش کرتے ہیں:

"سیاسی استقلال کا اعلان، دربار کے امور کی اصلاح، وزراء پر مشتمل کابینہ کی تشکیل، فوج و سپاہ کی تنظیم، فوجی اور سول امور کی نگرانی کے لئے تعلیمی اداروں کا قیام، قومی زبان پشتو کی طرف توجہ، فوجی و عسکری القابات و اعزازات کو بیرونی زبان سے افغانی زبان میں منتقل کرنا، اخبار و جرائد کا قیام، شفاخانہ، ڈسپنسری ہوٹل، مسافر سرا اور پوسٹ آفس جیسے اداروں کا قیام عمل میں لانا اور نئے شہر کی بنیاد ڈالنا شامل ہے۔

ان کی یہ اصلاحات افغان قوم کو ایک مقصد کے قریب لانے میں بہت موثر ثابت ہوتی ہیں اور کچھ سال گزرنے کے بعد اسی افغانستان میں برطانیہ کے قونصل جنرل سمیت دس ہزار سے زیادہ سپاہیوں کو قتل عام کر دیا جاتا ہے اور یوں افغانستان اپنی شجاعت اور حریت کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے۔ شاید یہ بھی ایک بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے ابھی تک بیرونی اقوام اسے اپنی تقدیر کا فیصلہ خود سے نہیں کرنے دیتیں اور آپس میں الجھائے رکھتی ہیں۔

ہندوستان

افغانستان کو خیر باد کہہ کر سید جمال سر زمین ہند کی جانب رہسپار ہوتے ہیں۔ وہ بغیر کسی شور شرابہ کے اس سر زمین میں وارد ہونا چاہتے ہیں لیکن انگریز حکومت ان کی آمد سے باخبر ہو جاتی ہے اور ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ میں جب وہ بمبئی میں قدم رکھتے ہیں تو ہندوستان کی برطانوی حکومت بظاہر ان کا شایان شان استقبال کرتی ہے۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت چاہتے ہیں تو انگریز ان سے کہتے ہیں کہ حکومت برطانیہ نے ان کے لئے ایک الگ گھر کا انتظام

کیا ہے۔ ان سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ وہ ہندوستان میں کتنا عرصہ قیام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ دو ماہ ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ حکومت قبول تو کر لیتی ہے لیکن ان پر اور ان سے ملاقات کرنے والوں پر کڑی نظریں رکھتی ہے۔ تاہم بعد میں یہ کام مشکل ہو جاتا ہے اس لئے کہ پہلے دن دس لوگ ملنے آتے ہیں دوسرے اور تیسرے دن سینکڑوں کی تعداد میں لوگ ان سے ملاقات کرنے آتے ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گذرتا کہ ہندوپاک جیسی وسیع مملکت انگڑائی لیتی ہے اور معاشرے کے مختلف طبقات کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ان ملاقاتوں کا بنیادی سبب یہ تھا کہ برصغیر کے مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کو ایک مسیحا مل گیا تھا۔ ایک ایسا ہادی اور رہنما جو ان کے تمام امراض کا مداوا اور ان کی مشکلات کا جامع حل پیش کر سکتا تھا۔ یہ رہنما حضرت موسیٰ کی طرح انہیں برطانیہ کی فرعونیت سے نجات دلانے آیا تھا۔ لہذا یہ ملاقاتیں صرف خیریت دریافت کرنے اور سلام دعا پر ختم نہ ہوتیں بلکہ ان میں سوالات کئے جاتے 'اہم ترین مسائل پر گفتگو ہوتی 'اصلاحات کے نسخے دیئے جاتے اور نجات کا راستہ بتایا جاتا۔ ایک دن انہی لوگوں کا انبوہ کثیر ان کے گھر کی طرف رواں دواں تھا کہ ہندوستان کی حکومت نے اپنے ایک اعلیٰ افسر کو بھیجا۔ اس نے جو یہ منظر دیکھا کہ دانشور 'شاعر 'ادیب 'روشن فکر 'علماء 'تاجر حضرات 'نوابین 'راجہ 'مہاراجے اور عام سطح کے لوگ کثرت سے موجود ہیں تو سید جمال سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگرچہ ہندوستان کی حکومت ان کے دو ماہ قیام کے انتظامات مکمل کر چکی تھی لیکن موجودہ حالات میں ان کا یہاں مزید رہنا مناسب نہیں۔ حاضرین میں سے کچھ اس افسر کی بیجا مداخلت کا جواب دینا چاہتے تھے کہ سید جمال نے ان سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود کھڑے ہو کر اس انگریز افسر کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں ہندوستان میں نہیں آیا کہ برطانیہ کی عظیم سلطنت کو خوفزدہ کروں۔ نہ اس کی طاقت رکھتا ہوں کہ ایک انقلاب برپا کروں اور نہ ہی اس کے سیاسی اقدامات پر نکتہ چینی کرنے کے درپے ہوں۔ اس سب کے باوجود مجھ جیسے گوشہ گیر اور عزلت پسند سیاح (Tourist) سے حکومت خوفزدہ ہے اور ان لوگوں کو مجھ سے ملنے سے روکتی ہے جو مجھ سے زیادہ ناتواں ہیں۔ یہ خود سب سے بڑا ثبوت ہے کہ برطانیہ کی حکومت کے ارادے کمزور ہو چکے ہیں اور اس کی عزت و شوکت خاک میں مل چکی ہے۔ یہاں پر نہ عدالت کار فرما ہے اور نہ امن و امان برقرار ہے دراصل یہاں پر وہ حکومت برسر اقتدار ہے جو قوم و ملت سے بھی زیادہ کمزور ہے۔"

یہ کہہ کر ایک مرتبہ وہ اپنا چہرہ اس عظیم الشان مجمع کی طرف پھیرتے ہیں اور ان سے مخاطب ہو کر انہیں حق و عدالت کا درس دیتے ہیں۔

"اے ہندوستان کے لوگو! حق و انصاف کی قسم! وہ برطانیہ جو صرف دکھانے کے لئے تمہاری حمایت کرتا ہے لیکن در پردہ وہ تمہارے جوانوں کو اپنی نوکرشاہی کے لئے استعمال کرتا ہے تاکہ انہیں اسلحہ تھما کر تمہاری آزادی و استقلال کو ختم کر دے اور تمہاری دولت کو نیست و نابود کر دے حالانکہ ان کی کل تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں۔ لہٰذا جب بھی تم دس کروڑ مچھر بن کر برطانیہ کے کانوں میں بھن بھن کرنے لگو گے تو اس کے سب سے بڑے سیاستدان گلیڈ سٹون کے کانوں تک اپنی زوردار آواز پہنچا سکو گے۔"

ابھی سید جمال کی تقریر جاری تھی کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سید جمال نے جو انہیں روتے دیکھا تو پکار کر کہا "رونا عورتوں کا کام ہے۔ سلطان محمود غزنوی ہندوستان روتا ہوا نہیں آیا تھا بلکہ اسلحہ کے ساتھ وارد ہوا تھا۔ جو قوم اپنے استقلال و آزادی کی حفاظت کے لئے دشمن پر حملہ آور ہوتی ہے اور موت کو گلے لگاتی ہے وہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ و تابندہ رہ سکتی ہے۔ اس تقریر سے واضح ہے کہ سید جمال نے ہندوستان کو سیاسی میدان اور اسلحہ دونوں طریقوں سے اپنی آزادی حاصل کرنے اور برطانیہ کے ظلم سے نکلنے کی دعوت دی تھی۔ وہ اگر اس صدی میں ہوتے تو مشرقی اقوام کو امریکہ کی غلامی سے نکلنے کی دعوت دیتے جس نے ابھی تک مشرق کے لوگوں کو اپنا غلام بنایا ہوا ہے۔ ان کی اسی شعلہ بیانی، شجاعت اور لوگوں میں مقبولیت سے سلطنت برطانیہ خوفزدہ رہتی تھی۔

بہرحال وہ ہندوستان چھوڑنے کی حامی بھر لیتے ہیں۔ اس دن انہیں مزید قیام کی اجازت مل جاتی ہے اور اگلے دن سمندری جہاز میں بٹھا کر شہر سوئیز کی جانب روانہ کر دیا جاتا ہے جہاں سے وہ مصر چلے جاتے ہیں۔ وہ اس مرتبہ صرف ایک مہینہ ہندوستان میں قیام کر سکے۔

مصر

سید جمال سلطنت برطانیہ کے ایک مفتوحہ علاقے سے باہر نکلے تو دوسرے میں داخل ہوئے۔ یوں تو خلیج کی تمام ریاستوں سمیت عراق اور مصر بھی خلافت عثمانیہ کے زیر اثر تھے لیکن اب خلافت کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی اور برطانیہ ایک عقاب کی طرح سرزمین مصر میں اپنے پنجے گاڑھ چکا تھا۔ یوں تو وہ ۱۲۸۵ھ میں پہلی بار مصر میں قدم رکھ رہے تھے لیکن اب عالمی شہرت کے مالک بن چکے تھے۔ ان سے ملاقات کے لئے آنے والے لوگ ان کی شخصیت کے خدوخال پہچانتے تھے۔ ایک دن وہ اسلامی علوم کی جامعہ جامعۂ ازہر تشریف لے گئے تو وہاں کے کچھ طالب علموں نے ان سے شرح الاظہار رشرح الاظہار نامی کتاب پڑھانے کا مطالبہ کیا۔ وہ

خان خلیلی کے علاقے میں واقع اپنے گھر میں اس کتاب کی تدریس کرتے اور ان طالب علموں کو سماجی و معاشرتی مسائل سے بھی آگاہ کرتے ۔ ان کی آمد و رفت ' ملاقاتیں اور دھواں دار تقریریں ہرگز برطانوی نواز حکومت کے لئے خوشایند نہ تھیں لہذا انہیں نکالنے کے لئے حکومت ایک بہانہ کی تلاش میں تھی ۔ اسی اثناء میں ایک دن مصر کے اخباروں میں یہ سرخیاں لگیں کہ ایک مسیحی پادری سید جمال سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے ہیں ۔ اس پر مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان خاصی لے دے ہوئی ۔ چنانچہ اس مسئلے کو بہانہ بنا کر خدیو مصر نے انہیں مصر سے چلے جانے کا حکم دیا ۔ یوں چالیس دن گزرانے کے بعد انہیں مصر سے رخت سفر باندھنا پڑا ۔

استنبول

خانہ کعبہ کی زیارت کرنے اور مکہ المکرمہ کے علماء سے ملاقات کرنے کے بعد سید جمال ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء میں استنبول میں وارد ہوتے ہیں ۔ ان کی آمد کی خبر بہت تیزی سے شہر میں پھیلتی ہے اور استنبول کے ترک دانشور ' ادیب اور مفکرین اس عظیم مرد مجاہد اور مصلح سے ملاقات کرنے کے لئے بڑھتے ہیں جس کی شخصیت اب کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ کچھ دن بعد صدر اعظم عالی پاشا ان سے ملاقات کرتے ہیں اور ان کی لیاقت و قابلیت کے فریفتہ ہو جاتے ہیں ۔ شاید اسی وجہ سے سیاسی شخصیات ' وزراء اور امراء بہت جلد ان کے قیمتی افکار و آراء سے استفادہ کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ وہ چھ مہینے تک اس ملک کی زبان سیکھتے ہیں اور آداب و رسوم سے آشنائی حاصل کرتے ہیں اور پھر انجمن دانش و معارف کے رکن بن جاتے ہیں ۔ شروع ہی سے ان کا شمار انجمن کے سرکردہ افراد میں ہونے لگتا ہے اور ان کے اصلاحی افکار کی وجہ سے انجمن ترقی کرتی ہے ۔ من جملہ وہ تعلیم کو عام کرنے کی بات کرتے ہیں ۔ سید جمال عام معاشرے کی سطح تک بھی اپنے افکار پھیلاتے ہیں ۔ وہ سلطان احمد اور ایا صوفیہ نامی مسجدوں میں جوشیلی تقریریں کرتے ہیں اور اس قوم کے فکری و عملی جمود کو توڑنے کی کامیاب کوششیں کرتے ہیں ۔ ان کی تقریریں سننے والوں کو اتنا متاثر کرتی تھیں کہ انہیں "سحر القلوب" کا نام دیا گیا ۔ لیکن ان افکار کی زد میں وہ رجعت پسند درباری ملا بھی آ گئے جنہیں اپنے مفادات اور اپنا منصب بہت پیارا تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ اگر اسی تیزی سے سید جمال ترکی کے اسلامی معاشرے میں رسوخ کر جائیں تو پھر وہ کیا کریں گے ۔ حسن فہمی آفندی جو کہ خلیفہ عثمانی کی جانب سے شیخ الاسلامی کے رتبہ پر فائز تھے اور اوقاف کے متولی ہونے کے علاوہ لوگوں کے دینی و شرعی مسائل حل کرنے کے پابند

تھے' سید جمال کے سخت مخالف تھے۔ مدرسہ دار الفنون کے ہال میں دی گئی ایک تقریر میں سید جمال نے نبوت اور حکمت الہیہ کے فرق کو واضح کیا تھا اور پھر علم و صنعت کے فوائد بیان کئے تھے لیکن حسن فہمی آفندی نے ان پر الزام لگایا کہ وہ نبوت کی بے احترامی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس مسئلے کو انہوں نے اپنے زیر اثر علاقوں کے ذریعے تشہیر کر کے ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ سید جمال نے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ اپنے افکار کی وضاحت اہل نظر کے سامنے کر سکتے ہیں اور شیخ الاسلامی کے ہر اعتراض کا جواب دیں گے تا کہ انصاف پسند علماء فیصلہ کریں کہ انہوں نے کوئی بات بھی اسلام کے اصولوں کے خلاف نہیں کی ہے۔ روشنفکر علماء' دانشور' ادیب' صحافیوں پر مشتمل ان کے حامیوں نے ان کی شخصیت کا بھرپور دفاع کیا لیکن اخباروں میں یہ مسئلہ اچھل چکا تھا۔ لہذا خلافت کی طرف سے ان سے کہا گیا کہ وہ کچھ عرصے کے لئے استنبول کو ترک کر دیں۔ ان کی یہ تقریر اور اس پر ہونے والا اعتراض اور اس کا جواب ان کے شاگرد مفتی شیخ محمد عبدہ نے ان کے تحقیقی مقالے نیچریہ کے جواب میں شامل کیا ہے۔

دوبارہ مصر

محرم ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء میں ایک بار پھر وہ مصر کا رخ کرتے ہیں جہاں کی حکومت نے چالیس دن قیام کرنے کے بعد انہیں نکال باہر کیا تھا۔ مصر کے صدر ریاض پاشا ان سے ملاقات کرتے ہیں اور ان کے کمالات اور صلاحیتوں کے معترف و قدر داں ہو جاتے ہیں۔ ریاض پاشا انہیں مصر کے بادشاہ خدیو اسماعیل کے پاس لے جاتے ہیں جو ان کے لئے ماہانہ دس مصری پونڈز کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔

جب دانشور' طالب علم اور اہل علم کو سید جمال کی آمد کی خبر ملتی ہے تو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے درس و تدریس کا تقاضا کرتے ہیں۔ سید جمال روزانہ تین درس دیا کرتے تھے۔ وہ دن میں اپنے گھر میں پہلے جامعۂ ازہر کے طالب علموں کو درس دیتے اور پھر اپنے گھر میں دانشور' ادیب اور ڈاکٹر سمیت معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے کو اپنے افکار سے متاثر کرتے۔ رات کو وہ قہوہ خانہ تشریف لے جاتے جہاں مختلف طبقات و اصناف کے لوگ ان کے پاس بیٹھتے اور ان سے سوالات کرتے۔ سوالات کا یہ سلسلہ ایک حلقہ درس میں تبدیل ہو جاتا اور صبح ہونے سے پہلے وہ گھر واپس آتے۔ وہ جامعۃ الازہر کے طالب علموں کو علم منطق' فلسفہ (حکمت الہیہ) کلام' فقہ' نجوم' جغرافیہ اور جدید علوم بھی پڑھاتے تھے۔ سید جمال یوں تو جامعۂ ازہر کی بہت سی رائج کتابیں پڑھاتے تھے لیکن ان کے پڑھنے اور تعلیم دینے کا انداز و طریقہ کار

یکسر مختلف تھا۔ وہ پہلے کتاب میں موجود مسائل کو بیان کرتے پھر اس کے اطراف میں پائی جانے والی تمام مفید اطلاعات پر روشنی ڈالتے اور پھر ان کے بارے میں قاطعیت سے فیصلہ کرتے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط ہیں۔ اس طرح وہ طالب علموں کے ذہنوں میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہنے دیتے اور نہ ہی انہیں تردید و تشویش میں مبتلا کرتے۔ وہ دلائل کی زبان میں گفتگو کرتے اور کتاب کے مطالب کو آسمانی وحی سمجھ کر ذہنوں میں فکری جمود پیدا کرنے کے بجائے انہیں ناقدانہ نگاہ سے دیکھ کر طالب علموں میں ایک فکری تحول پیدا کرتے۔ وہ علم کو پر پیچ اور تنگ وادیوں میں الجھانے کے بجائے زندگی کے عملی میدان میں لے آتے اور کسی کی پروا کئے بغیر علوم کے فوائد یا نقصانات کو واضح کرتے۔ شروع میں ان کے درس گھر میں ہوتے تھے جو بعد میں جامعتہ الازہر میں منتقل کر دیئے گئے۔ ان کے شاگردوں میں شیخ عبدالکریم سلیمان، شیخ ابراہیم اللقانی، شیخ سعد زغلول پاشا (جو بعد میں مصر کے صدر بنے) شیخ ابراہیم الھلباوی اور ادیب اسحاق سر فہرست ہیں لیکن ان سب میں شیخ محمد عبدہ (الاستاذ الامام) کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔

سید جمال نے اپنی اصلاحات کا دائرہ صرف دینی و تعلیمی اداروں کی حد تک محدود نہ رکھا بلکہ پورے معاشرے میں افکار و آراء کی تبدیلی لانا چاہی۔ اس حوالہ سے انہوں نے ادب و صحافت کی دنیا میں خاص توجہ دی جو بہت مختصر سے عرصے میں ایک بڑی تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ان اصلاحات سے پہلے ادب صرف بادشاہوں کے گیت گانے، سلطنت کے چرچے کرنے اور ان کے مقاصد کو آگے بڑھانے کا ذریعہ تھا۔ یہ بادشاہ دسیوں افراد پر ظلم و ستم کرتے تو کوئی نہ بولتا لیکن اگر کسی ایک کو تھوڑا بہت نواز دیتے تو ان کی سخاوت کو آسمان تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ سید جمال نے مصر کے اس عربی ادب کو غلامی سے نکال کر حریت و آزادی کی راہ دکھائی۔ انہوں نے اپنے سے متاثر دانشوروں، ادیبوں اور اہل ذوق کو جدید طرز پر مقالہ جات تحریر کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد ادیب اسحاق کو مصر نامی اخبار کی بنیاد رکھنے کے لئے تیار کیا اور شروع میں خود بھی مختلف ناموں سے اس میں مقالے لکھے۔ شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں کہ دس سال بعد اہل قلم، صحافی اور مقالہ نگاروں میں سے کوئی بھی قدیم طرز کا لکھنے والا باقی نہ رہا تھا۔ ان سب کی جگہ نئے لکھنے والوں نے لے لی تھی جو یا سید جمال کے شاگرد تھے یا ان کے شاگردوں کے زیر اثر رہ چکے تھے۔ اپنی ان اصلاحات میں سید جمال نے اس کا بیڑا اٹھایا کہ لوگوں کے عقیدہ و افکار کی اصلاح کی جائے اور غلط اور غیر حقیقی و خیالی باتوں کو ان کے دماغ سے نکال کر باہر پھینک دیا جائے۔ مثلاً اس طرح کے خیالات کو کہ شیعہ و سنی ہمیشہ ایک دوسرے کی مخالفت کرتے رہیں گے یا یہ سوچنا کہ سامراجی طاقتوں سے مقابلہ کرنا ان کی توان سے باہر ہے یا یہ کہ معاشرے کی اصلاح کے لئے

مختصر لوگوں سے کچھ نہیں بن سکتا۔ ایک طرف انہوں نے اس طرح کی خرافات کو لوگوں کے ذہنوں سے نکالا اور دوسری جانب انہیں اسلام کی روح اور اس کی سچی تعلیمات سے آشنا کیا اور اتحاد و اتفاق کا درس دیا۔ وہ اپنی اصلاحات میں جدید علوم کی جانب بھی خاصی توجہ دیتے لیکن اپنے مخصوص افکار کے سائے میں زبان اور قلم سے آزادی کا بیج بوتے رہے اور احیائے اسلام کے لئے سعی بلیغ کرتے رہے۔

فری میسن (Free-Mason)

فری میسن ایک زیر زمین تنظیم کا نام ہے جس کی بنیاد برادری، برابری اور آزادی جیسے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس تنظیم کے مختلف ملکوں میں شعبے ہیں اور دکھانے کے لئے کچھ بھی ہو لیکن عملی طور پر یہ تنظیم سامراجی طاقتوں کے مقاصد کو کامیابی سے بڑھاتی رہی ہے اور مشرقی اقوام کو شکار کرنے میں خاصی سرگرم رہی ہے۔ ۱۲۹۲ ھ میں سید جمال اس خطرناک تنظیم کی رکنیت کا تقاضا کرتے ہیں جسے ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۷ء میں قبول کر لیا جاتا ہے۔

ہمارے لئے واضح نہیں کہ کن وجوہات کی بنا پر سید جمال نے اس کی رکنیت اختیار کی۔ کیا وہ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے سلطنت برطانیہ کے خلاف محاذ آرائی کا ادارہ رکھتے تھے یا اس کی رکنیت اختیار کر کے برطانیہ کے شر سے آزاد ہونا چاہتے تھے جو ایک عرصہ سے سائے کی طرح ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ یا مصر کے روشن فکر اور مغرب زدہ دانشوروں کو باور کرانا چاہتے تھے کہ سید جمال فری میسن کا نزدیک سے مطالعہ کرنے کے بعد بھی اس کی مذمت کرتے ہیں اور اس کی پالیسیوں سے یکسر اختلاف رکھتے ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے بتایا کہ یہی آزادی برادری و برابری کے عنوانات تھے جن کی وجہ سے وہ اس گروہ کے زمرے میں شامل ہوئے تھے تاکہ انسانیت کو فیض پہنچا سکیں اور آمریت کو شکست دے کر حق اور انصاف کو برقرار کر سکیں۔ بہر حال انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۸ء میں انہیں کوکب الشرق لوج کا سربراہ منتخب کر لیا گیا۔ سید جمال الدین نے یہاں بھی حق و صداقت کا پیغام پھیلانے سے دریغ نہ کیا اور جرات و شہامت کے ساتھ فری میسن کی دکھانے کی اور حقیقی سیاست میں فرق واضح کیا۔ وہ اس تنظیم کے رکن بن گئے تھے جس کے ڈھانچے اور جس کی اندرونی ساخت میں لوگ اپنی حقیقت بھی بھول جاتے تھے یا انہیں بھلا دی جاتی تھی اور نتیجتاً یہ لوگ اس تنظیم کے سرکردہ افراد کے تابع محض بن جاتے تھے لیکن سید جمال ان کے روساء پر تنقید کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے اس تنظیم میں برطانیہ کی سیاست اور مظالم کے خلاف تقریر

کی توان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ فری میسن ایک انسانی تنظیم ہے اور سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر آزادی و برابری کی آرزو کو فری میسن کو زمین میں دفن کر دینا چاہئے۔ خلاصہ کلام یہ کہ انہوں نے فری میسن کے آزادی و برابری کے نعروں کو ایک ڈھکوسلا قرار دیا۔ فری میسن یہ خیال کر رہی تھی کہ وہ سید جمال کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے گی لیکن جب انہوں نے یہاں دوسرا نقشہ دیکھا تو سید جمال پر یہ الزام عائد کر کے کہ وہ خدا کے منکر ہیں' انہیں اس تنظیم سے نکال باہر کیا۔ کچھ اسناد میں یہ عندیہ دیا گیا ہے کہ ستارہ مشرق (جو برطانیہ کے لوج کے زیر نظر تھا اس) سے نکلنے کے بعد انہوں نے فری میسن میں اپنی سربراہی میں ایک جدید لوج قائم کیا اور اسے فرانس کے مشرق اعظم کے زیر نظر قرار دیا۔ بہر صورت ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء میں ایک تنظیم سے باہر نکلنے کے بعد سید جمال نے فری میسن کی حقیقت اور اس کے سازشی چہرے کو بے نقاب کرنے کے لئے عربی زبان میں ایک کتاب لکھی اور اس کا نام "ماسون" رکھا۔ ماسون عربی زبان میں خود فری میسن کو کہتے ہیں)۔ انہیں اس کتاب کو شائع کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ لہذا اسے اپنے شاگرد عزیز شیخ محمد عبدہ کے حوالے کر دیا۔ مصر سے ان کی جلاوطنی کے بعد حکومت کے کارندوں نے اس کتاب کو بمع سید جمال الدین کی ایک تصویر کے ضبط کر لیا۔ یہ واضح رہے کہ اس کے بعد فری میسن جیسی خطرناک تنظیم سید جمال کے دشمنوں کی صف میں نمایاں طور پر شامل ہو گئی۔

انجمن وطنی کا قیام

اسلامی ممالک کی بگڑتی ہوئی صورتحال کی اصلاح کرنا' مسلمانوں کو فرنگیوں کی غلامی سے نجات دلانا اور ظلم و ستم کی زنجیر کو کاٹنے کے لئے برطانیہ کی مصر سے واپسی کا راستہ ہموار کرنا اور مصر کے نوجوانوں کو جہالت و نادانی سے نکال کر ان میں جنگ و جہاد کا عزم اور انقلابی جوش وولولہ پیدا کرنا سید جمال کے بنیادی مقاصد تھے۔ ان مقاصد کی برآوری کے لئے فری میسن سے نکلنے کے کچھ عرصے بعد ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء میں انہوں نے انجمن وطنی یا حزب الوطنی کی بنیاد رکھی۔ تفسیر المنار کے مصنف رشید محمد رضا اپنے استاد شیخ محمد عبدہ پر لکھی جانے والی اپنی ایک اور کتاب "تاریخ الاستاذ الامام" میں اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ ہی اس جماعت کے رکن رکین تھے۔ شہرت طلبی اور مغربی تہذیب کی غلاظتوں سے پاک و صاف ہونا' اخلاقی برائیوں سے پرہیز کرنا اور سادگی کو اپنانا اس انجمن کی رکنیت حاصل کرنے کی بنیادی شرائط تھیں۔ شروع میں انجمن کے ارکان کی تعداد چالیس تھی۔ اس انجمن کو ان جوانوں نے مل کر

تشکیل دیا تھا جو اصلاح کے جذبہ سے سرشار' آزادی کے طرفدار اور مسلمانوں کی ترقی کے طالب تھے۔ ابتدائی جلسوں میں موضوع بحث یہ ہوتا کہ اسلام کی ترقی کے اسباب اور مسلمانوں کے انحطاط کے عوامل کیا ہیں۔۔۔ ؟ اس موضوع پر کچھ عرصہ تبادلہ خیال کے بعد یہ تنظیم اس نتیجہ تک پہنچی ہے کہ مسلمان جب تک اسلام کے رہنما اصولوں پر عمل پیرا رہے تو ترقی و تکامل کے راستے کو طے کرتے رہے لیکن جب سے انہوں نے ان اصولوں کو نظر انداز کیا اس وقت سے وہ انحطاط و پسماندگی کی تاریک گھاٹی میں گرتے گئے۔ ان کے تمام مسائل کا حل اور بیماریوں کا علاج قرآن کریم کے نسخہ کیمیا پر عمل کرنے میں مضمر ہے جو آواز دے رہا ہے کہ

ان اللہ لا یغیّر ما بقوم حتی یغیّروا ما بأنفسھم

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت کے بدلنے کا

انجمن وطنی کے پندرھویں جلسہ میں سید جمال نے زبردست تقریر کی۔ انہوں نے قرآن کریم کی محکم و واضح آیات کی روشنی میں حزب الوطنی کے ارکان کے دلوں کو جلاء بخشی' انہیں اللہ اور رسولؐ کے احکامات پر عمل کرنے کی جانب توجہ دلائی اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے قرآنی وعدوں کی یاد دہانی کرائی۔ انہوں نے کہا کہ خداوند عالم نے حق اور سچ کہا ہے کہ "جو لوگ ہماری راہ میں کوشش و مجاہدت کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی جانب ہدایت کرتے ہیں" اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتے ہیں تو پروردگار عالم انہیں خود ان کی حقیقت سے بھی غافل کر دیتا ہے۔ اس تقریر کے نتیجہ میں ارکان پر غیر معمولی رقت طاری ہوتی ہے اور طے پاتا ہے کہ انجمن کے ارکان قرآن کریم کی تعلیمات پر سختی سے کاربند رہیں گے اور خود کو نفرت' حسد' بخل' لالچ اور عیش و عشرت سے دور رکھیں گے اور حلال و حرام میں تمیز کریں گے۔ انجمن کے ارکان نے ایثار کا پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپنی زندگی کا سامان تعیش' زیورات اور سجاوٹ کی چیزوں کو بازار میں فروخت کر کے اس سے حاصل ہونے والی رقوم کو انجمن کے کھاتہ میں جمع کرایا۔ اور سادہ ترین طریقے پر زندگی گزارنا شروع کر دی۔ بعد میں متفقہ طور پر انجمن یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس کا ہر رکن ۲۴ گھنٹہ میں ایک بار قرآن کریم کا کم از کم ایک حزب (سپارے کا آٹھواں حصہ) غور و فکر کے ساتھ پڑھے گا اور اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کرے گا:

۱۔ فرائض و نوافل کی پابندی۔
۲۔ نیکی کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا (امر بالمعروف و نہی عن المنکر)
۳۔ اسلام کی جانب دعوت دینا۔

۴۔ نصرانی پادریوں اور مشنریوں سے عمدگی سے گفتگو کرنا۔
۵۔ ناداروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔
۶۔ محتاج و ضرورت مند افراد کی بقدر امکان اعانت کرنا۔
۷۔ رشتہ داروں سے اچھے تعلقات برقرار رکھنا۔
۸۔ بیماروں کی عیادت کرنا۔
۹۔ گمشدہ افراد کو ڈھونڈنا۔
۱۰۔ سیاحوں اور دوسرے شہر سے آنے والوں سے ملاقاتیں کرنا۔
۱۱۔ دینی اموال (خمس و زکوٰۃ و عشر) کی جمع آوری کرنا۔
۱۲۔ غافل و خود باختہ افراد کی رہنمائی کرنا۔
۱۳۔ خود کو ناپسندیدہ صفات مثلاً خود خواہی و عجب و انانیت کے خول سے باہر نکالنا۔
۱۴۔ لوگوں کی غلطیوں سے عفو و در گزر کرنا۔
۱۵۔ غصہ کو پی جانا۔
۱۶۔ بیکار و بیہودہ باتوں سے پرہیز کرنا۔
۱۷۔ ہر ممبر کے پاس ایک نوٹ بک ہو جس میں وہ چوبیس گھنٹے میں ان کاموں میں سے انجام دینے والے کام کو اپنی نوٹ بک میں درج کرے اور پھر ہر روز انجمن کے رجسٹر میں لکھے جو تمام ممبران سے متعلق ہے تاکہ مجموعاً تمام ارکان کی سرگرمیاں معلوم ہو سکیں۔

یوں یہ انجمن سید جمال کی تجربہ کار اور دیانتدار قیادت میں ان اصولوں پر کاربند رہی۔ شروع میں اس کے ارکان کی تعداد چالیس تھی جو بڑھ کر تین سو اور پھر بیس ہزار ایک سو اسی افراد تک پہنچ گئی۔ انجمن کے ارکان کی دس ماہ کی کارکردگی کی شرح حسب ذیل ہے:

۱۵۰۰۰۔ (پندرہ ہزار) پونڈز اسٹرلنگ انجمن کے کھاتہ میں جمع کر دیئے گئے۔
۱۵۰۰۔ (پندرہ سو) بیماروں کی مزاج پرسی کی گئی۔
۲۷۰۰۔ (دو ہزار سات سو) سیاحوں اور باہر سے آنے والوں سے ملاقاتیں کی گئیں۔
۵۰۰۔ (پانچ سو) گمشدہ افراد کو ڈھونڈ لیا گیا۔
۱۲۰۰۔ (بارہ سو) ضرورت مند افراد کی ضرورتوں کو پورا کیا گیا۔
۸۰۰۔ (آٹھ سو) شرابی انجمن کے اعضاء کی تبلیغات کے نتیجہ میں پشیمان ہو گئے اور انجمن کے ہمنوا بن گئے۔
۱۳۰۰۔ (ایک ہزار تین سو) تارک الصلاۃ امر بالمعروف کے نتیجہ میں توبہ کر چکے ہیں۔

۴۰۰۔(چار سو) فحاشی و عریانی میں مبتلا عورتوں نے اس لعنت سے نجات حاصل کی۔
۸۰۔(اسی) افراد نے برطانیہ کی نوکر شاہی یا ملازمت سے استعفی دے دیا۔
۵۰۰۔(پانچ سو) اشراف یا مالدار افراد نے تعیش پسند زندگی گزارنے سے پرہیز اختیار کر لیا۔
۷۵۔(پچھتر) تنگدست اور بے روزگار افراد کی مالی اعانت کی جا رہی ہے۔
۲۰۶۔(دو سو چھ) فقیر یا مانگنے والوں کو ان کے سالانہ اخراجات فراہم کئے جا رہے ہیں۔
۳۵۔(پینتس) مسیحی تبلیغ کے نتیجے میں اسلام قبول کر چکے ہیں۔
۱۵۔(پندرہ) یہودی حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔
۷۰۔(ستر) بت پرست دعوت اسلام پر لبیک کہہ چکے ہیں۔
۴۴۔(چوالیس) جلسے مصر کے اندر و باہر مسیحیوں اور غیر مسلموں کے ساتھ منعقد کئے گئے ہیں۔

برطانیہ کے اقتصادی امور کے مشیر لورڈ کرومر نے ایک مرتبہ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ برطانیہ کے اثر و رسوخ میں نقصان کی شرح = ۴۵ فیصد

تجارت اور خرید و فروخت میں خسارے کی شرح = ۳۵ فیصد

مزید برآں مسیحی پادریوں اور مشنریوں کی ۳۵ سالہ محنتیں نقش بر آب ہو گئیں۔ دوسری طرف سے سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں رؤسا کی داد و فریاد بلند ہے کیونکہ افسران کے استعفی کے بعد ان کے سارے کام معطل ہو گئے ہیں۔ تجارتی ادارے اور تعیشات و آرائش کا ساز و سامان تیار کرنے والی برطانوی کمپنیاں خریدار نہ ہونے کے باعث اپنی بساط جمع کر رہی ہیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ انجمن وطنی کے ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ تھا کہ صرف ملکی مصنوعات کو استعمال کیا جائے گا۔ رفتہ رفتہ شراب خانے، تھیٹر اور فحاشی و عریانی کے اڈے بھی بند ہو رہے ہیں۔ دس ماہ کے مختصر عرصے میں انجمن وطنی کی اس غیر متوقع ترقی نے پورے مصر کو ہلا دیا۔ یوں تو اس کارکردگی پر سرکاری و غیر سرکاری رپورٹیں مرتب کر کے بھیجی گئیں لیکن ہم صرف لورڈ کرومر کی رپورٹ پر اکتفا کرتے ہیں جو اس انجمن کی ترقی کو صدر اسلام کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ترقی پر بہترین دلیل سمجھتے ہیں۔ جو رپورٹ انہوں نے لندن روانہ کی اس میں لکھتے ہیں :

"اگر انجمن وطنی مزید ایک سال تک باقی رہ گئی اور اگر مغربی و مرکزی ایشیا اور مشرقی و شمالی افریقہ کے روح رواں اور محرک اصلی سید جمال الدین ہمدانی اسی سہولت سے مصر میں اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہے تو نہ فقط براعظم افریقہ میں برطانیہ کی سیاست و تجارت ختم

ہو جائے گی اور اس کا نام و نشان باقی نہ رہے گا بلکہ کچھ بعید نہیں کہ یورپ کی بادشاہی اس عجیب و غریب انجمن کے توسط سے صفحہ ہستی سے محو ہو جائے اور صرف تاریخ کے اوراق میں اس کا نام و نشان باقی رہ جائے۔"

انجمن وطنی کی سرگرمیوں پر مشتمل رپورٹیں اور دستاویزات سید جمال سے متعلق کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان متواتر رپورٹوں کی وجہ سے لندن سے ان کی جلاوطنی کا حکم بھیج دیا گیا تھا۔ بہر صورت اگر ہمارے ملک اور دوسرے ممالک کی اسلامی تنظیمیں مذہبی منافرت کو ہوا دینے یا چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھنے کے بجائے انجمن الوطنی کی طرح ایک جامع پروگرام ترتیب دیتیں اور سچائی کے ساتھ قرآن کریم اور اسلامی قوانین پر عمل شروع کر دیتیں اور اسی طرح ان تنظیموں کے قائدین سید جمال کی دیانتداری اور اسلام سے وفاداری کو اپنے لئے نمونہ عمل بناتے تو آج ہمارا یہ حال نہ ہوتا۔۔۔!

سید جمال نے اپنے افکار اور صلاحیتوں کو اس انجمن تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ ہر دیوار و حصار کو توڑتے ہوئے معاشرے کے ہر طبقے تک اپنی آواز پہنچاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ مصر کے ایک بڑے شہر اسکندریہ میں تھے اور گزر کھیتوں سے ہو رہا تھا کہ انہوں نے کسانوں اور مزدور پیشہ افراد سے خطاب کر کے کہا:

"اے مصر کے بدحال کسان تو زمین کے سینہ کو تو چاک کرتا ہے تاکہ اس سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات کا سامان فراہم کر سکے لیکن تو ان لوگوں کا سینہ کیوں نہیں پھاڑتا جو تجھ پر ظلم کرتے ہیں۔ تو ان کا شکم کیوں نہیں چاک کرتا جو تیری محنت کے پسینہ سے حاصل ہونے والی کمائی کو لوٹ لیتے ہیں۔۔۔؟"

اس طرح وہ صرف چند جملوں میں ان شہر کے کسانوں اور مزدور پیشہ افراد کے دلوں میں ظلم و ستم کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے ہیں اور ایک عظیم انقلاب کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں اتنی تاثیر تھی کہ اسی دن حکومت کے خلاف مظاہرات ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اب مصر ایک تبدیلی اور ایک انقلاب کے لئے خود کو تیار کر رہا ہے۔ حکومت سے استعفیٰ دینے والے افسران کھلے عام حکومت سے مستعفی ہونے کے مطالبے کر رہے ہیں۔ ان کے مطالبات کے دباؤ میں آکر خدیو اسماعیل نے کابینہ توڑ دی اور ایک نئی کابینہ کا انتخاب کیا۔ سلطنت برطانیہ اور فرانس دونوں نے خدیو کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں انہیں اقتدار سے برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ توفیق پاشا نے لے لی۔ توفیق پاشا نے اصلاحات اور آزادی کے مطالبات سنے تو قوم کو پارلیمنٹ تشکیل دینے کی

پیشکش کی لیکن سید جمال اس طرح کی پارلیمنٹ یا قانونی مجلس کو ایک دھوکہ خیال کرتے تھے۔ وہ ایک ایسی قانون ساز مجلس کے خواہاں تھے جن میں لوگوں کے حقیقی نمائندے جائیں اور قوم و ملت کے مسائل کو پیش کریں لیکن جو پارلیمنٹ توفیق پاشا کی سرکردگی میں اور برطانیہ کے زیر نظر تشکیل دی جائے وہ عوام کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے برطانیہ اور بیرونی عوامل کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہوگی۔ سید جمال کی اصلاحات اور ان اختلاف نظر کی وجہ سے خدیو توفیق پاشا سے ان کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو گئے تھے۔ ان مشکلات میں ایک اضافہ یہ بھی ہوا کہ ایک دن جامعۃ الازہر کے جامد اور رجعت پسند ملاؤں نے انہیں الازہر میں جدید علوم سکھانے سے منع کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جغرافیہ کی تعلیم دینے کے لئے دنیا کا گلوب اپنے ساتھ کلاس روم میں لے جاتے تھے۔ بہرحال ۶ رمضان ۱۲۹۶ھ .ق. میں جب وہ محمد بیگ عطار کے گھر سے اپنی رہائش گاہ واپس جا رہے تھے تو انہیں گرفتار کر کے مصر سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کی جلاوطنی میں سب سے اہم کردار فری میسن نے ادا کیا۔

فری میسن مصر کے حساس اداروں میں اپنا خاص اثر رکھتی تھی۔ ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ لندن سے ان کی جلاوطنی کا حکم موصول ہونے کے بعد فری میسن نے اپنا کردار ادا کیا اور خدیو مصر توفیق پاشا کو ان سے سخت بددل کر دیا۔ اور ان کے بارے میں طرح طرح کے جھوٹ بولے یہی وجہ ہے کہ انہیں بہت سختی کے ساتھ مصر سے نکالا گیا۔ نہ انہیں گھر جانے کی اجازت دی گئی نہ سامان ساتھ لینے کی۔ ان کی توہین کی گئی ان کی تسبیح اور جیب میں موجود کچھ پیسے بھی چھین لئے گئے اور کھانے کے لئے بھی کچھ نہ دیا گیا۔ جب انہوں نے اپنے جرم کے بارے میں استفسار کیا تو انہیں یہ بتایا گیا کہ "ہمارے علماء تم سے ناراض ہیں، بیرونی ممالک کی سفارتیں تمہارے وجود سے خوفزدہ ہیں اور ہمارے آفندی تمہاری وجہ سے تین راتوں سے نیند سے محروم ہیں۔" وہ اس مرتبہ نو سال تک مصر میں مقیم رہے لیکن ان کا تمام اثاثہ کتابوں پر مشتمل ایک لائبریری تھی جسے برطانیہ کے اقتصادی امور کے وزیر نے ہتھیا لیا اور کچھ عرصے بعد ڈبوں میں پیک کر کے ایران روانہ کر دیا۔ یہی وہ برطانیہ ہے جو دانشور اور اہل قلم ہونے کا بہانہ بنا کر اور شیطانی آیات (Satanic verses) کے مصنف سلمان رشدی کا دفاع کرتا ہے لیکن رحمانی آیات کے طرفدار سید جمال الدین جیسے اہل علم اور دانشوروں کے ساتھ دوسرا سلوک کرتا ہے!

ہمیں نہیں معلوم کہ جب اس مرد حق کو ایک ملک سے دوسرے ملک اور دوسرے سے تیسرے ملک جلاوطن کیا جاتا ہوگا تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ خصوصاً اس مرتبہ ان پر بہت سختی کی گئی۔ ان کی عظمت و بزرگی کا ذرہ برابر خیال نہ رکھا گیا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سید

جمال ایک کفن پوش مرد مجاہد کی طرح ایک ملک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی راہ لیتے لیکن ان کے آہنی ارادوں میں کسی قسم کا تزلزل یا شکست رونما نہ ہوتی۔ وہ ایک مسیحا کی طرح مسلمانوں کی ترقی و تکامل اور اتحاد و اتفاق کے لئے کوشاں رہتے اور ان کے دل میں یہ آرزو بڑی آب و تاب سے باقی تھی کہ انیسویں صدی کے سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کریں اور اپنی آنکھوں سے اسے مغربی ممالک کی غلامی سے نکلتے' آزادی و استقلال حاصل کرتے اور اسلامی اصولوں پر عمل کرتے دیکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی طاقتیں ہمیشہ ان سے خوفزدہ رہتیں جیسا کہ اپنی حریف طاقت سے خوفزدہ رہتی ہیں اور سائے کی طرح ان کا تعاقب کرتیں۔ ان کی بلند ہمت اور پختہ ارادوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مصر کے ان کارندوں یا درندوں نے ان سے وہ سلوک کیا کہ انہیں بھوکا رکھا اور پیسے بھی چھین لئے تو ایران کے کچھ تاجروں نے ان سے اظہار ہمدردی کرنا چاہا اور انہیں کچھ رقوم دینا چاہیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیں کہ "وہ تاجران رقوم کے ان سے زیادہ محتاج ہیں اور شیر جہاں بھی جاتا ہے اپنا شکار خود ڈھونڈ لیتا ہے۔"

دوبارہ ہندوستان

۱۸۸۰ء میں سید جمال الدین کو بحری جہاز میں بٹھا کر زبردستی ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔ وہ جس دن کراچی کی بندرگاہ پہنچے بدقسمتی سے اسی دن کابل میں برطانوی قونصل جنرل کے قتل کئے جانے کی خبر پھیلی تھی۔ اس خبر کے موصول ہوتے ہی انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور ہر گھنٹہ پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے۔ کچھ دن بعد رخصت ملتی ہے تو وہ بمبئی روانہ ہو جاتے ہیں اور علی رو قافی نامی شخص کے گھر ٹھہرتے ہیں۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد علم و دانش کے گہوارے حیدر آباد دکن میں وارد ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نظام حیدر آباد اہل علم و دانش کی قدر کرتے تھے اور روشن فکری اور آزادی کی تحریکوں کی حتی الامکان حمایت کیا کرتے تھے۔ سید جمال سلطان نواز جنگ کی رفاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نظام حیدر آباد کے وزیر اعظم سالار جنگ سے تفصیلی ملاقات کرتے ہیں۔ وہ یہاں بھی حق و حقیقت کا پیغام پھیلانے اور آزادی کا بیج بونے سے دریغ نہیں کرتے اور علیگڑھ تحریک کے حامیوں سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔ مصر میں انجمن وطنی کے تجربات اور انجام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ایک مخفی اور زیر زمین تنظیم عروہ تشکیل دیتے ہیں۔ اس تنظیم کے مختلف ممالک میں شعبے ہوتے ہیں بغیر اس کے کہ ایک شعبہ کو دوسرے کی خبر ہو۔ نظام حیدر آباد ان کی اس تحریک اور مقاصد کی حمایت و سرپرستی

میں کسی طرح کی کمی نہیں آنے دیتے۔

نیچریہ کا جواب

سید جمال حیدر آباد دکن میں تھے کہ ۱۹/ رمضان ۱۲۹۸ھ.ق. میں انہیں ریاضی کے ایک ٹیچر کا خط موصول ہوتا ہے۔ اس خط میں نامہ نگار اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ ان دنوں ہندوستان میں ہر جگہ نیچر' نیچر کا شور ہو رہا ہے۔ کیا نظریہ نیچریہ (Naturalism) دین اسلام کے خلاف ہے یا اس کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اگر مطابق ہے تو اس میں اور دین میں کیا نسبت ہے۔ لہذا خط لکھنے والا سید جمال سے اس کی وضاحت چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ نیچریوں کے خلاف اپنا مشہور تحقیقی مقالہ نیچریہ (Refutation of materialism/naturalism) کا جواب لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ جواب فارسی زبان میں بمبئی سے شائع ہوتا ہے اور پھر اردو زبان میں ترجمہ ہو کر کلکتہ سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوتا ہے۔ مفتی شیخ محمد عبدہ اسے عربی زبان میں ترجمہ کر کے بیروت سے ۱۳۰۳ھ میں شائع کرتے ہیں رسالته فی ابطال مذهب الدهرین (۷۶ صفحات) یہ تحقیقی رسالہ فارسی زبان میں ایران سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

اس تحقیقی مقالے میں سید جمال نیچریوں کو دہریہ یعنی خدا کا منکر قرار دیتے ہیں اور ان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو تین سو یا چار سو سال قبل مسیح سے مختلف شکلوں اور رنگ وروپ میں ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ ان کا اصل مقصد الٰہی ادیان اور خدا کی بندگی کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ یہ لوگ جس قوم میں اثر و رسوخ حاصل کرتے ہیں اس کے اخلاق کو فاسد کر دیتے ہیں اور اس کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے عقائد پر ذرا سا غور و فکر کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ کس طرح معاشرے میں انتشار اور اجتماعی اضمحلال کو پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ دین ہوتا ہے جو معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے سے پیوست رکھتا ہے اور دین کے بغیر ہر گز تمدن (Civilization) استوار نہ ہو سکے گا حالانکہ اس گروہ کی بنیادی تعلیم مذہبوں اور ادیان الٰہی کو صفحہ ہستی سے مٹانا ہے۔

سید جمال آغاز میں کائنات کے بارے میں فطرت گرائی (naturalism/materialism) کے نظریات کو بیان کرتے ہیں۔ وہ ڈارون کے نظریۂ پیدائش (Darwin`s theory of Evolution) کو بھی بیان کرتے ہیں اور عقلی دلائل' تجربہ اور مشاہدے کی مدد سے اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ بعد ازاں وہ یورپی فلاسفرز کے مادی نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور پھر موضوع سخن کو کمیونزم اور سوشلزم کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اشتراکیت و

التقاطیت نے کس طرح اقوام عالم کو غلط اور فرسودہ نظریات میں الجھائے رکھا۔ آخر میں وہ دین اسلام اور اس پر ایمان لانے کی اہمیت اور امتیاز کو ثابت کرتے ہیں۔

تمدن اور عمرانیات پر مبنی ان کے نظریات خاصی حد تک علامہ ابن خلدون کے نظریات سے ملتے ہیں اس فرق کے ساتھ کہ ابن خلدون تعصب کو معاشرے اور تمدن کی بنیاد بتاتے ہیں جبکہ سید جمال دین کو تمدن کی اساس سمجھتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ میں قوموں کے عروج وزوال، تمدن اور انحطاط کے عوامل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سید جمال لکھتے ہیں کہ مذہب انسان کے لئے تین عقیدے لے کر آیا ہے اور انسانی جان میں تین صفات ودیعت کرتا ہے۔ پہلا عقیدہ یہ ہے کہ انسان یقین کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے۔ تیسرا یہ عقیدہ کہ انسان اس لئے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تاکہ خود کو اس سے زیادہ وسیع عالم میں پہنچنے کی تیاری کرے اور ظلم، ناانصافی اور اچھائیوں اور برائیوں سے ملی جلی اس تنگ و تاریک دنیا سے نکل کر ایسے پاک و پاکیزہ عالم میں جانے کا رخت سفر باندھے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جو تین صفات مذہب ودیعت کرتا ہے وہ حیا، امانتداری اور سچائی ہے۔

سید جمال اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تین عقیدے اور یہ تین اخلاقی وانسانی صفات تمدن (Civilization) عمرانیات (Colonization) اور رفاہ (Prosperity) کی بنیادیں ہیں۔ آسمانی مذاہب نے انہی اصولوں کو ترویج دیا ہے اور انہی پر انسانی سعادت موقوف ہے۔ جبکہ مادیت اور فطرت کے طرفدار ان قدروں کی نفی وتردید کرتے ہیں اور ڈارون اور اس کے ہم خیال لوگ انسان کو حیوانیت کے مقام تک گرادیتے ہیں۔ وہ انسان کو ایسا حیوان بنادیتے ہیں جس میں دل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ شرف و عزت اور اشرفیت کے احساسات سے عاری ہوتا ہے۔ مادیت اسے بتاتی ہے کہ سعادت اس میں ہے کہ وہ زندگی کی آسائش اور رفاہ کی چیزوں کو خواہ کیسے بھی ممکن ہو اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہوں چھین لے کیونکہ اس زندگی کے بعد اس نے فنا ہو جانا ہے۔ لہٰذا یہاں ان افکار سے متاثر لوگوں کا اخلاق تباہ ہو جاتا ہے، انسانیت کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے اور انسان اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے سعادت کے راستے کو کھو دیتا ہے۔

یہ اس جواب کی جانب ایک اجمالی سا اشارہ ہے جس کی تفصیل کو رقم کرنا اور نیچریوں کی حقیقت کو واضح کرنا سید جمال نے ضروری سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں ابھی تک اس قسم کے افکار خاصی رونق کے حامل ہیں۔ سر سید احمد خان کے افکار کے علاوہ

جسٹس سید امیر علی کی کتاب روح اسلام اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ لوگ دہریئے تو نہیں ہیں لیکن یورپ اور یورپی افکار کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے اور فلسفہ ادیان اور دین اور نیچریوں کی اصل حقیقت وماہیت واضح نہ ہونے اور تاریخ نہ جاننے کے باعث لاشعوری طور پر اس قسم کے افراد نے برصغیر میں دینی حمایت کے جذبے سے سرشار ہونے کے باوجود ہر مافوق الفطرت اشیاء، فرشتوں، معجزوں اور ان جیسی دوسری چیزوں کو جو مادے کی عینک میں نہیں آسکتیں، یا کسی صورت میں ان کی توجیہ کی ہے یا ان کا خاکی و دنیاوی معنی و محمل تلاش کیا ہے لیکن سید جمال الدین جیسے عظیم مفکرین کے افکار کی روشنی میں ان کی حقیقت واضح ہے۔ اس تحقیقی مقالے کے علاوہ سید جمال نے اپنے ایک مقالے "تفسیر مفسر" میں جو ان کے مجموعہ مقالات میں محفوظ ہے، سرسید کی تفسیر قرآن پر بنیادی اعتراضات اٹھائے ہیں۔

کلکتہ

سید جمال کی حیدر آباد دکن میں اقامت کے دوران مصر میں ۱۸۸۲ء میں عرابی پاشا کی تحریک نے سر اٹھایا اور وہاں کی برطانوی نواز حکومت کے خلاف آزادی کا پرچم بلند کیا۔ برطانیہ تو ویسے ہی سید جمال سے ادھار کھائے بیٹھا تھا اور اس سے بھی خوفزدہ تھا کہ وہ حیدر آباد دکن اور ہندوستان میں کیا گل کھلاتے ہیں لہذا اس تحریک کو بہانہ بنا کر انہیں کلکتہ لے جاکر نظر بند کر دیا گیا۔ اس تحریک کے نتیجے میں اسکندریہ شہر پر زبردست بمباری ہوتی ہے اور ایک تجربہ کار قیادت نہ ہونے کے سبب یہ تحریک اپنے مطلوبہ نتیجہ کو حاصل نہیں کرپاتی۔ اس میں شک نہیں کہ سید جمال ہی آزادی کا یہ پودا مصر میں لگا کر آئے تھے لیکن اگر وہ خود اس کی کاشت بھی کرپاتے تو مطلوبہ نتائج حاصل ہوسکتے تھے۔ وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اس کی قیادت ور ہنمائی کرسکتے تھے لیکن برطانیہ کی حکومت انہیں نظر بند کرچکی تھی۔ ان پر سختیوں کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ تحریک کی شکست کے بعد انہیں آزاد کر دیا گیا۔ انہوں نے کلکتہ میں پڑھے لکھے طبقے کے لئے تعلیم و تعلم پر اپنا مشہور لیکچر دیا۔ اس لیکچر میں انہوں نے برصغیر کو علم و فن کا نقطہ آغاز اور گہوارہ قرار دیا اور تعلیم و تعلیم کی اہمیت، علوم کے فوائد اور فلسفہ و حکمت اولی حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کی قیمتی آراء کو ہم نے تعلیم و تعلم پر ان کے نظریات کی صورت میں محفوظ کیا ہے۔

ان لیکچرز کے علاوہ سید جمال نے علیگڑھ تحریک کی اصلاح اور اس کے مغربی رجحانات کی تنقیص کو اپنا اولین فرض سمجھا۔ انہوں نے اپنے شاگرد محب حسین کو شفیق معلم (استاد) نامی

جریدہ کی بنیاد رکھنے کی جانب راغب کیا۔ اس جریدہ کے مختلف شماروں میں (جو محرم ۱۲۹۸ھ سے لے کر ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ تک شائع ہوتے رہے) ان کے چھ مقالات بھی شامل کئے گئے تھے۔ انہوں نے سید الاخبار اور مفرح القلوب نامی جرائد کو بھی اپنی فارسی زبان کے مقالے ارسال کئے۔ ان مقالہ جات میں وہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق بر قرار رکھنے 'اسلامی اخلاق اپنانے 'یورپی تہذیب سے دور رہنے اور جدید علوم حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔

وہ زیادہ عرصہ کلکتہ میں نہیں رہے۔ مشرق کی سرزمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ان کے لئے تنگ ہو گئی تھی۔ لہذا ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء میں انہوں نے مشرقی اقوام اور عالم اسلام کو خیر باد کہہ کر مغرب کا رخ کیا تاکہ وہاں اپنی آواز بلند کریں یا وہاں کی آزاد فضا میں رہ کر اپنے افکار منتشر کریں۔ راستے میں ان کا گزر سوئز کینال سے ہوا جہاں انہیں کس بے دردی سے کچھ دن نظر بند رکھا گیا تھا۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دوستوں اور ارباب سیاست کو خطوط لکھے۔ ان خطوط میں ایک خط عارف ابوتراب کے نام ہے جس میں وہ تقاضا کرتے ہیں کہ عارف مصر کے وزیر اعظم ریاض پاشا کے پاس جائے اور ان کی کتابیں اور رسائل بوشہر کی بندرگاہ روانہ کردے۔ وہ ریاض پاشا کے نام ایک تفصیلی خط لکھتے ہیں جو ان کی شخصیت کے بارے میں دستاویزات میں موجود ہے۔ اس خط میں وہ فری میسن کی حیلہ گری اور فریب پر مبنی سیاست کو بے نقاب کرتے ہیں اور اپنے اوپر لگنے والے ہر الزام سے اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہیں۔ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے بعد وہ مصر سے جلاوطن کئے جانے کے وقت سے لے کر کلکتہ تک اپنے پر ہونے والے مظالم کی روداد بیان کرتے ہیں اور پھر مشرق کو چھوڑ دینے کا عزم ظاہر کرتے ہیں۔

پیرس

۱۳۰۰ھ.ق / ۱۸۸۳ء میں سید جمال ایک مختصر سے عرصے کے لئے لندن اور پھر پیرس میں ہیں۔ پیرس کے لوگوں کے لئے یہ قابل تعجب امر ہے کہ عالم اسلام کا اتنا عظیم مفکر اور مصلح ان کے شہر میں موجود ہے۔ وہ اس عظیم انسان کو مشرق کے استنبولی لباس میں دیکھ کر بہت مسرور ہوتے ہیں جو پیرس کی سڑکوں پر احتیاط سے چلتا ہے اور وہاں کی عمارتوں کو غور و فکر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ خاص کر ایک ایسے وقت میں جب پیرس کے بہترین اخبار و جرائد اپنے قیمتی کالموں کو سید جمال کی شخصیت اور افکار سے زینت دے رہے ہیں۔

پیرس میں سید جمال کی ملاقات اپنے ایک پرانے ارادتمند جیمس سانوا (ابو نضارہ) سے ہوتی ہے۔ یہ دوست پہلے مصر میں ابو نضارہ کے نام سے ایک جریدہ نکالا کرتا تھا جس میں مصر کی

بند سیاست کو طنز و مزاح کے پیرایہ میں نشانہ بنایا جاتا تھا اور مصر کے حکمرانوں پر تنقید کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس اخبار کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ آزادی و استقلال کی حمایت کرنے اور غلام حکومت پر نکتہ چینی کرنے کے الزام میں اس اخبار کو بند کر دیا گیا اور انہیں مصر سے نکال باہر کیا گیا۔ ابو نضارہ اس کے بعد پیرس میں آگئے۔ انہوں نے اس اخبار کی اشاعت جاری رکھی اور مختلف طریقوں سے اسے مصر بھیجتے رہے۔ سید جمال مصر کی آزادی کے طرفدار تھے اور برطانیہ کی ظالمانہ سیاست کو مصر میں ختم کر دینا چاہتے تھے لہٰذا وہ ابو نضارہ کے ساتھ ہو گئے اور ان کے جریدے میں اپنے مقالے شائع کرنے لگے۔ ابو نضارہ یہودی تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذہب کے اس فاصلے کے باوجود سید جمال کے افکار سے خاصے متاثر تھے۔ ابو نضارہ کے تمام شمارے برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس دوران سید جمال مصر میں برطانیہ کے اعلیٰ عہدیداروں اور جرنیلوں کو فرضی ناموں سے خط لکھ کر سرزمین مصر کو خالی کرنے کا الٹی میٹم دیتے تھے۔ اسی طرح کے خطوط خدیو مصر اور اعلیٰ حکام کو بھی موصول ہوئے۔ ان خطوط کی وجہ سے مصر کی حکومت اور برطانیہ کی سفارت کو خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ایک طویل عرصے بعد فرانس کی پولیس کے تعاون سے انہیں اس ضمن میں کچھ صحیح اطلاعات موصول ہوئیں۔

عروۃ الوثقی

سید جمال الدین کے مصر سے جلاوطن کئے جانے کے کچھ عرصے بعد مصر کی حکومت نے ان کے ممتاز شاگرد شیخ محمد عبدہ کو بھی مصر سے نکال باہر کیا۔ وہ بیروت چلے گئے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں وہ سید جمال کے ایماء پر پیرس میں آجاتے ہیں اور اس کے بعد سے یہ استاد شاگرد دونوں مل کر ایک نئے جریدے یعنی "عروۃ الوثقی" کا آغاز کرتے ہیں۔ عروۃ الوثقی یعنی نہ ٹوٹنے والا رشتہ۔ بلاشبہ جو رشتہ قرآن اور ایمان کی بنیادوں پر قائم ہو گا وہ ہرگز نہ ٹوٹے گا۔ یہ حضرات اس رشتہ کو پوری مسلمان قوم میں استوار کرنا چاہتے ہیں۔ برصغیر کے مخلص اور باایمان مسلمان تاجر عروۃ الوثقی کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ یہ خود ہندوپاک کے مسلمانوں کے اسلام سے لگاؤ رکھنے اور اس کی راہ میں مال سے جہاد کرنے کی بہترین مثال ہے۔ عروۃ الوثقی (Urwat-ul-Wosqa) مفت تقسیم کیا جاتا تھا اور اسے تمام اسلامی ممالک ترکی، مصر، سوڈان، الجزائر، اردن، تیونس، ایران، افغانستان، ہندوستان، حجاز اور خلیجی ریاستوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سید جمال لکھتے ہیں:

۱۔ مشرقی اقوام خصوصاً مسلمانوں کو انحطاط و پسماندگی کے اسباب و عوامل سے خبردار کرنا۔
۲۔ مسلمانوں کو نجات کا راستہ دکھانے کی کوشش اور یورپ کی اندھی تقلید سے روکنا۔
۳۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اسلام دشمن عناصر کے منفی پروپیگنڈے کا مثبت جواب دینا۔
۴۔ قرآن کے پیروکار تمام فرقوں میں بھائی چارگی اور اتحاد کی فضا برقرار رکھنا۔

عروۃ الوثقی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں روزمرہ کی اہم سیاسی خبریں درج ہیں اور دوسرے میں اسلامی موضوعات پر سید جمال کے سادہ اور رواں قلم سے مفید مقالے درج ہیں۔ ان مقالوں میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں اور انحطاط کے اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے موضوعات میں قضا و قدر ' تعصب ' اتحاد ' قیادت ' وہم ' مایوسی اور ناامیدی شامل ہیں۔ وہ اس اخبار میں اگر ایک طرف امت مسلمہ کو برطانیہ کی پلید سیاست سے آشنا کرتے ہیں تو دوسری جانب صفات رذیلہ اور برے اخلاق اور بری صفات سے پاک کر کے ان میں اسلامی اخلاق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک طرف اہالی مصر کو انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے کی پرزور ترغیب دے رہے ہیں تو دوسری جانب مہدی سوڈانی کی تحریک کی زبردست حمایت کر رہے ہیں اور مہدی اور اس کے طرفداروں کی شجاعت اور فتوحات پر مبنی واقعات کو زور و شور سے عروۃ الوثقی کی زینت بنا کر مصر والجزائر اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات ابھار رہے ہیں اور اس طرح برطانیہ کی عزت و شوکت کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ عروۃ الوثقی ایک طرف جدید علوم کی ترغیب دے رہا ہے تو دوسری جانب اسلام کا پیغام اور اللہ تعالی کا فرمان پڑھ کر سنا رہا ہے اور مسلمانوں کے عروج کی تاریخ رقم کر کے انہیں مایوسی اور خوف سے نکال رہا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ عروۃ الوثقی افکار اور آرائے عامہ پر غیر معمولی اثر ڈال رہا ہے اور برطانیہ کی سیاست پر زبردست حملے کر رہا ہے۔ ایک شمارے میں وہ برطانیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ایک ایسا اژدھا ہے جس کی نہ بھوک کی کوئی حد ہے نہ پیاس کی انتہا۔ بیس کروڑ انسانوں کو ہڑپ کرنے کے بعد بھی اس کا پیٹ نہیں بھرا اور تامنز اور گنگا کا پانی پینے کے بعد بھی اس کی پیاس نہیں بجھی۔ منہ کھولے ہوئے کھڑا ہے کہ کسی لمحہ بھی پوری دنیا کو ہڑپ کر جائے اور نیل و جیحون کے دریا نگل لے۔"

سید جمال اگر اس دور میں ہوتے تو برطانیہ کے ساتھ امریکہ اور آئی ایم ایف کو اپنے حملوں کا مرکز قرار دیتے۔ اس لئے کہ جو کام گذشتہ عہد میں برطانیہ کرتا آیا تھا وہ آج امریکہ اور اس سے

متعلقہ ادارے بخوبی انجام دے رہے ہیں اور نت نئے بہانوں سے مشرقی اقوام کو غلام بنا رکھا ہے۔(۱)

عروۃالوثقیٰ کے ایک اور شمارے میں سید جمال وطن کی حفاظت کو دینی فرائض میں سے قرار دیتے ہیں اور پھر قوم کے غدار کی تعریف یوں کرتے ہیں :

"غدار اور وطن فروش سے ہماری مراد صرف وہ شخص نہیں جو نقد رقوم کے بدلہ میں اپنے شہروں کا سودا کرلے بلکہ وہ بھی ملک کا غدار ہے جو اس کا سبب بنتا ہے کہ دشمن اس ملک میں قدم رکھ سکے اور وہ بھی جو دشمن کو اپنے ملک میں قدم رکھنے کی اجازت دے حالانکہ اس سے ممانعت کر سکتا ہو۔"

عروۃالوثقیٰ کے دو شمارے نکلے تھے کہ ہندوستان کی انگریز حکومت نے اسے ممنوع اور غیر قانونی قرار دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد مصر کی برطانیہ نواز حکومت نے بھی نوبر پاشا کی سرکردگی میں اس پر نظارت کے لئے ایک گروہ تشکیل دیا۔ مصری اخبار و جرائد میں یہ خبر عام کردی گئی کہ اگر کسی کے پاس عروۃالوثقیٰ دیکھا گیا تو حکومت اس پر پندرہ سے پچیس پونڈز تک جرمانہ عائد کر سکتی ہے۔ پوسٹ آفسوں کی کڑی نگرانی کی جانے لگی اور لفافوں کو کھول کر دیکھا جانے لگا۔ لیکن عروۃالوثقیٰ پھر بھی کسی نہ کسی طریقہ سے پہنچتا رہا۔ (E.G.Brown) ای۔ جی۔ براؤن اس ضمن میں لکھتے ہیں :

"حکومت برطانیہ عروۃالوثقیٰ کے طوفانی حملوں اور اس کی غیر معمولی شہرت سے خوفزدہ ہو گئی تھی چنانچہ اس نے ہندوستان میں اس کی ترسیل پر پابندی لگادی اور عین ممکن ہے کہ دوسرے وسائل کے ذریعے سے اس جریدے کے وجود کو ختم کرنے کا باعث بنی ہو۔"

پیرس میں عروۃالوثقیٰ کی اشاعت میں تاخیر ہونے لگی۔ حکومت فرانس کے دباؤ کی وجہ سے پریس کے کارکنان زحمت میں پڑھنے لگے یہاں تک کہ اٹھارہ شمارے شائع ہونے کے بعد ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ / ۶، اکتوبر ۱۸۸۴ء میں عروۃالوثقیٰ بند کردیا گیا۔ اس کے تمام شماروں کا کامل مجموعہ متعدد مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں اور ملکوں کی حقیقت اصلیت جو پریس کی آزادی کے طرفدار ہیں ۔۔۔۔! اگرچہ عروۃالوثقیٰ زیادہ عرصے باقی نہ رہ سکا لیکن اسی مختصر عرصے میں یہ مشرقی اقوام کی بیداری 'ان میں احیائے اسلام' آزادی اور اتحاد کی لہر دوڑانے میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ ہم نے اس کا ایک مقالہ اپنی اسی کتاب "اسلامی افکار و

۱۔ آئی ایم ایف نے پہلی بار تسلیم کرلیا ہے کہ کچھ ایشیائی ملکوں کے بارے میں اس نے بنیادی غلطیاں کی ہیں۔

Dawn, Karachi : Jan.16, 1998

شخصیات ''میں شامل کیا ہے ۔اس کے شماروں کی کل تعداد اٹھارہ ہے اور پہلا شمارہ ۱۵ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ / ۱۳' مارچ ۱۸۸۴ء کو اور آخری ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ / ۱۷' اکتوبر ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا۔

اسلام اور علم

۲۹ مارچ ۱۸۸۳ء کو ایک فرانسیسی مفکر ارنسٹ رنان (Ernest Renan) نے سوربن (Sorbonne) یونیورسٹی پیرس میں منعقدہ ایک کانفرنس میں اسلام اور علم (Islam&Science) کے عنوان سے ایک تقریر کی جس میں اسلام کو علوم کا مخالف قرار دیا اور ثابت کیا کہ غیب پر ایمان اصلاح اور تبدیلی کے متضاد ہے۔ یہ تقریر ان کے اخبار (Journal des Debats) میں شائع ہوئی۔ سید جمال نے ان کے اس مقالہ کا جواب دیا لیکن اسے چنداں شہرت حاصل نہ ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عربی زبان سے فرانسیسی میں اسے صحیح سے ترجمہ نہ کیا گیا تھا۔ اس پر اور لوگوں نے بھی جواب لکھے لیکن وہ اتنے جامع نہ تھے۔ ٹھیک دو ماہ بعد سید جمال نے اس تقریر کا مدلل اور تفصیلی جواب عربی زبان میں شائع کیا جو ترجمہ ہو کر (Journal des Debats) مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۸۳ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ارنسٹ رنان سید جمال کی شخصیت اور افکار سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے بہت سے نظریات کے غلط ہونے کا اعتراف بھی کر لیا۔ وہ سید جمال کے بارے میں لکھتے ہیں :

''میں جب بھی ان سے ہم کلام ہوتا ہوں تو ان کی فکری آزادی 'اخلاق میں شرافت اور گفتار میں صراحت و قاطعیت دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ عہد قدیم کے کسی عظیم دانشور سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ گویا کہ میں ابن سینا' ابن رشد یا پانچویں صدی کے ان قائدین کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہا ہوں جنھوں نے انسانیت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور انہیں غلامی سے نکالنے کی کوششیں کیں۔''

انسائیکلو پیڈیا (Shorter Encyclopedia) میں نقل کیا گیا ہے کہ یہ جواب جرمن زبان میں بھی شائع ہوا ہے۔ سید جمال کا یہ جواب اس صدی کے دانشوروں کی دسترس میں نہ تھا یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ جو پیرس میں مقیم تھے اور جن کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا' انہوں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ اور اس کے بعد فارسی میں ترجمہ کر کے ۱۹۳۳ء میں ایران سے شائع کیا۔

مہدی سوڈانی کا قیام

سید جمال کو پیرس میں مقیم ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ ابھی برطانیہ کے خلاف عرابی پاشا کی تحریک ٹھنڈی نہ پڑی تھی کہ سوڈان میں محمد احمد مہدی نے قیام کیا اور مہدویت کا دعوی کر کے وہاں کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ مہدی نے دعوی کیا کہ وہ ہی مہدی موعود ہیں جو خدا کی زمین میں عدل و انصاف قائم کریں گے جبکہ وہ ظلم و ستم سے بھر چکی ہو گی۔ عقیدہ مہدویت اور امام مہدی کا ظہور مسلمانوں کے متفقہ مسائل اور مسلمات میں سے ہے اور اسی لئے مختلف لوگ مختلف ادوار میں اس سے غلط فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ بہر حال اگر اس بات سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مہدی کی تحریک قرآن و سنت کے دائرے میں تھی۔ مہدی سوڈانی شرک کے خلاف جنگ کرتا تھا اور بدعتوں کا مخالف تھا۔ اس نے اپنی تحریک کو صوفیانہ انداز سے ترتیب دیا تھا لہذا وہ اس تحریک کے پیروکاروں کو اپنا مرید سمجھتا تھا اور ان سے اس انداز میں بیعت لیتا تھا:

"ہم خدا اور رسولؐ سے بیعت کرتے ہیں اور تجھ سے بیعت کرتے ہیں کہ خدائے واحد کی پرستش کریں گے۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں گے چوری نہ کریں گے' زنا کے مرتکب نہ ہوں گے' کسی پر ناروا تہمت نہ لگائیں گے اور شریعت کے دائرے میں تیرے احکامات کی تعمیل کریں گے۔"

انہی دینی احساسات سے فائدہ اٹھا کر اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا تھا اور حکومتی افواج اور بیرونی عوامل کو پسپا کیا تھا۔ برطانیہ نے جب اس تحریک کو کامیابی کے نزدیک دیکھا تو اسے کچلنے کے لئے کئی ہزار انگریز دستے بھیجے۔ لیکن پہلے ہی مقابلے میں انہیں خاک سے یکساں کر دیا گیا۔ اس شکست فاش کا بدلہ لینے کے لئے جنرل گردن کو لندن سے خرطوم روانہ کیا گیا جبکہ جرنیل گراہام پہلے ہی مہدی کے مجاہدین سے برسر پیکار تھے۔ لیکن مہدی کے مجاہدین گوروں کو پے درپے شکستیں دیتے رہے جن میں جرنیل گرون کو بھی تہ تیغ کر دیا گیا۔ ہزاروں انگریز فوجوں کے قتل عام اور مسلسل شکستوں کی وجہ سے برطانیہ کو ذلیل و رسوا ہو کر سوڈان سے نکلنا پڑا۔ سید جمال الدین بھی یہی چاہتے تھے کہ اقوام مشرق سلطنت برطانیہ کی غلامی سے نکلنے کے لئے جہاد کریں اور میدان عمل میں مقابلہ کریں۔ لہذا انہوں نے مہدی سوڈانی کی تحریک کی کامیابیوں اور برطانیہ کی مسلسل شکستوں اور جانی نقصانات کو بڑی آب و تاب سے عروۃ الوثقی میں جگہ دی۔ انہوں نے اس تحریک کے مجاہدوں کو اسلامی غیرت کا مظاہرہ کرنے پر داد تحسین دی۔ جب ہندوپاک میں

مہدی کی تحریک کی حمایت میں مظاہرے ہوئے تو انہوں نے اس تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ :

"محمد احمد مہدی کی تحریک ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں بڑی عظمت سے برخوردار ہے اور اگرچہ وہ (محمد احمد) مہدی نہیں ہے لیکن ہندوستان کے لوگوں کو اس کے بارے میں یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے تاکہ شاید یہ عقیدہ برطانیہ کی غلامی سے نکلنے کے لئے ان کی صفوں میں اتحاد برقرار کرنے کا باعث ہو"

اسلامی کانفرنس

سید جمال الدین انیسویں صدی میں عالم اسلام میں اسلامی اتحاد (Pan-Islamism) کا نعرہ لگانے والے پہلے مصلح ہیں۔ ان کی اس تحریک کا اعتراف اشتراکی مزاج و طبیعت رکھنے والے علماء یعنی عبیداللہ سندھی بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی کانفرنس یا الموتمر العالم الاسلامی کی تجویز پیش کرنے والے سب سے پہلے مفکر بھی وہ خود ہیں۔ وہ اس کانفرنس کے مرکز کو مکۃ المکرمہ قرار دیتے ہیں جہاں سے اس دین کا پیغام پھیلا اور جہاں مسلمان ہر سال خانہ کعبہ کا حج کرنے کی غرض سے جمع ہوتے ہیں۔ دوسرے بین الاقوامی اداروں من جملہ اقوام متحدہ کی طرح جس بے جان اسلامی کانفرنس کی تنظیم (OIC) کو ہم جانتے اور پہچانتے ہیں سید جمال اس سے مختلف کانفرنس کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر اسلامی ملک سے ایک حکومتی ترجمان کے علاوہ ایک ایسے نیک اور جید عالم دین کے انتخاب کو ضروری سمجھتے تھے جو صحیح معنوں میں مسلمان قوم کا نمائندہ ہو۔ سید جمال الدین عالم اسلام کی یکجہتی اور ترقی کیلئے اس سے زیادہ عملی خطوط پر سوچتے تھے۔ وہ تجاویز دینے پر اکتفا کرنے کے بجائے مکۃ المکرمہ میں شریف مکہ کی قیادت میں ایک اسلامی خلافت تشکیل دینا چاہتے تھے جو زید بن علی کی اولاد میں سے تھے۔ نیز اس قسم کی کانفرنس کو بھی عملی صورت دینا چاہتے تھے۔ شواہد اس کی تائید کرتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے مغرب کو چھوڑ کر انہوں نے ایک بار پھر مشرق کا رخ کیا لیکن حالات نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔ ایران کے دربار نے اصلاحات کے بہانے ان سے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی فرصت چھین لی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلامی کانفرنس کے تصور کو سب سے پہلے عبدالرحمٰن کواکبی نے پیش کیا لیکن ایک لبنانی مورخ نے المنار نامی جریدے میں "الجامعۃ الاسلامیہ" کے نام سے ایک مقالہ لکھا ہے اس مقالہ میں مورخ نے حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اسلامی کانفرنس کا تصور جو کواکبی نے پیش کیا ہے اسے انہوں نے سید جمال الدین کی فکر سے

لیا تھا۔ اس امر کی تصدیق تفسیر قرآن "المنار" کے مصنف محمد رشید رضا نے بھی کی ہے۔

لندن

برطانیہ کے ادارہ ہندوستان کے صدر اعظم گلیڈسٹون (Gladstone) کے استعفی کے بعد ان کی جگہ چرچل لے لیتا ہے۔ مشہور انگریز مصنف ولفریڈ بلنٹ (Wilfrid Blunt) چرچل کو تیار کر لیتا ہے کہ وہ سوڈان، مصر اور افغانستان کے امور پر سید جمال سے مذاکرات کریں۔ بلنٹ کی دعوت پر سید جمال لندن آتے ہیں اور ۱۰ شوال ۱۳۰۲ھ / ۲۳ جولائی ۱۸۸۵ء میں جیمس اسٹریٹ لندن میں واقع ادارہ ہندوستان میں رانڈولف چرچل سے ان کے مذاکرات شروع ہو چکے ہیں۔ یہ مذاکرات تین گھنٹے تک جاری رہتے ہیں۔ چرچل سید جمال سے پوچھتا ہے کہ وہ سلطنت برطانیہ سے کیا چاہتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ سلطنت برطانیہ کو مسلمان اقوام افغان و ایران و ترک و مصر اور عربوں سے مل کر روس کے خلاف ایک اتحاد تشکیل دینا چاہئے۔ نیز مسلمانوں کے سامنے حسن نیت ثابت کرنے کے لئے سرزمین مصر کو خالی کر دینا چاہئے۔ آخر میں طے پاتا ہے کہ جب بھی انگلستان کی حکومت مصر کو خالی کرنے کی تاریخ معین کر دے گی تو سید جمال خلافت عثمانیہ اور سلطنت برطانیہ کے درمیان موجود مسائل میں وساطت کریں گے۔ نیز سوڈان کی حکومت اور خلافت عثمانیہ میں تفاہم برقرار کرنے کی کوشش کریں گے۔ چرچل سید جمال سے خاصا متاثر ہوتا ہے اور اس ضمن میں کئی اور مذاکرات کے دور ہوتے ہیں جن میں طے پاتا ہے کہ پہلے چرچل استنبول جائیں گے اور سلطان عبدالحمید سے گفتگو کریں گے اور ان کی روانگی کے دو دن بعد سید جمال روانہ ہوں گے۔ سید جمال کی روانگی کے تمام انتظامات بلنٹ کی جانب سے مکمل کر لئے جاتے ہیں لیکن استنبول پہنچ کر چرچل اپنا عقیدہ بدل لیتا ہے اور سید جمال کی آمد سے مخالفت کرتا ہے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو ہندوستان کے سیاسی نمائندوں کے ساتھ ہونے والی میٹنگ میں سید جمال سیاست حاضرہ پر عربی زبان میں زبردست تقریر کرتے ہیں جو غیر معمولی طور پر پسند کی جاتی ہے۔

ایران

سید جمال لندن سے پیرس واپس چلے جاتے ہیں۔ پیرس میں وہ کچھ عرصے قیام کے بعد ایک بار پھر مشرق کا رخ کرتے ہیں۔ وہ مکۃ المکرمہ میں خانہ کعبہ کی زیارت کے بعد بوشہر کی بندرگاہ پر قدم رکھتے ہیں۔ یہاں سے وہ نجد، قطیف اور یمن کی جانب جانا چاہتے ہیں۔ بظاہر ان کا مقصد اسلامی خلافت کی تشکیل کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔ اسی دوران جبکہ وہ ایران کی بندرگاہ

بوشہر میں تھے کہ شاہ ایران کی جانب سے ذیقعدہ ۱۳۰۳ھ / جون ۱۸۸۶ء میں انہیں ایک ٹیلی گرام موصول ہوتا ہے۔ ناصر الدین شاہ ان کی عالمی شہرت کی وجہ سے انہیں تہران آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

۲۰ ربیع الاول / ۱۳۰۴ھ۔ق۔ کو ہم انہیں تہران میں دیکھتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد شاہ ایران انہیں ملاقات کا موقع دیتا ہے اور ایران میں ترقی' اصلاحات اور آبادی و عمران کی بات کرتا ہے۔ سید جمال بڑی بے باکی سے شاہ کی فضول خرچیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ اپنی اصلاحات کو دانشوروں اور صاحب نظر افراد کے سامنے پیش کرنے کی تجویز سامنے لاتے ہیں۔ شاہ انہیں بہت سے وعدے وعید دیتا ہے لیکن ان تجاویز پر عملدر آمد نہیں کرتا۔ شاہ کے درباری اور سلطنت برطانیہ کے زر خرید غلام اور جاسوس شاہ کو سید جمال سے متنفر کرنے میں اپنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سید جمال جب دربار کی جانب سے سرد مہری و وعدہ خلافی دیکھتے ہیں تو دانشور' علماء اور عوام کے سامنے اپنے افکار و نظریات پیش کرتے ہیں اور ایران کے دربار میں موجود جبر و استبداد کی کھلے عام شکایت کرتے ہیں۔ نتیجتاً انہیں تہران کو ترک کرنے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ ابھی وہ موسم میں مناسب تبدیلی کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ انہیں روس کے ایک معروف صحافی کاتکوف کی جانب سے روس آنے کی دعوت دی گئی ہوتی ہے۔

روس

جریدۂ موسکو مورخہ ۲۰ جون ۱۸۸۷ء میں سید جمال الدین کی روس میں آمد کی خبر بڑی آب و تاب سے دیتا ہے۔ کاتکوف روس میں سید جمال کی شخصیت کا تعارف کروانے' ان کے مقالات کی اشاعت اور تزار روس سے ان کی ملاقات کرانے میں خاصی سرگرمی دکھاتے ہیں لیکن کچھ عرصے بعد ان کی وفات ہو جاتی ہے۔

اسی دوران سید جمال کو ایران میں ان کے میزبان اور محترم دوست حاج امین الضرب کی جانب سے ایک خط ملتا ہے جس کے جواب میں وہ دربار ایران میں حاکم استبداد کی شکایت کرتے ہیں اور دربار کی جانب سے صدارت یا وزارت کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں صدر مملکت نہیں بننا چاہتا میں وزیر نہیں بننا چاہتا' مجھے رقوم یا گرانٹ کی ضرورت نہیں۔ نہ میرے اہل و عیال ہیں اور نہ جائیداد و ملکیت اور نہ ہی انہیں رکھنے کا خواہاں ہوں۔ کتنے ہی لوگ میری وجہ سے بیگ اور پاشائی کے رتبہ تک پہنچے اور کتنے ہی افراد میری وساطت سے اعلیٰ مقامات و منصب پر فائز ہوئے لیکن میں خود ہمیشہ ایک حالت پر رہا ہوں اور باقی رہنا چاہتا ہوں۔

مسلمانوں کی دنیا و آخرت کی اصلاح اور نصیحت کے سوا میرا کوئی مقصد نہیں اور آخری آرزو یہ ہے کہ شہداء و صالحین کی طرح میرا خون بھی اس راستے میں بہہ جائے۔"

۲۵ ذیقعدہ ۱۳۰۴ھ / جون ۱۸۸۷ء میں سید جمال موسکو کو ترک کر کے روس کے دوسرے اہم شہر پیٹرز برج (Saint Peters bourg /leningrad) کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ برطانیہ کی وزارت خارجہ و سفارت 'ہندوستان کی انگریز حکومت' خلافت عثمانیہ اور ایران کا دربار روس میں سید جمال کی سرگرمیوں اور شہر میں ان کی آمد کو حساسیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان اداروں کے جاسوس اپنی حکومتوں کو بھیجی جانے والی رپورٹوں میں ان کی ایک ایک نقل و حرکت کو منعکس کرتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ وہ برطانیہ کی اس رقیب سپر پاور کی سلطنت میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔

سید جمال اس دوران روس کے ارباب سیاست سے ملتے ہیں اور بادشاہ و ملکہ سے ملاقات کرتے ہیں۔ تزار روس ان سے بہت سے سوالات کرتے ہیں۔ وہ اس شہر کے اخبار و جرائد میں بھی مشرقی ممالک میں برطانیہ کی ظالمانہ سیاست پر مفید مقالے لکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ روس کو خلافت عثمانیہ کی مخالفت سے نکال کر مشرق کے اکھاڑے میں برطانیہ کے سامنے لا کھڑا کریں۔ لیکن شاید مذکورہ سفارتوں اور اداروں کی سرگرمیوں کی وجہ سے یا روس کے ارباب سیاست کی کم مائیگی کی وجہ سے وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے میں چنداں کامیابی حاصل نہیں کرتے۔ وہ اس دوران روس میں موجود تیس لاکھ مسلمانوں کے حقوق کو بھی مد نظر رکھتے ہیں جنہیں روس کے کمیونسٹ اور الحادی نظام میں ظلم کی رسی سے باندھ دیا گیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وہ قرآن کریم کے نسخوں اور دینی کتب کی اشاعت کے لئے بھی خاصی جدو جہد کرتے ہیں۔

دوبارہ ایران

ذیقعدہ ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء کو سید جمال پیٹرز برج یا لینگراڈ کو ترک کر کے جرمنی کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ وہ میونخ میں مقیم ہوتے ہیں کہ ناصر الدین شاہ جو نمائش دیکھنے کے لئے پیرس جا رہے ہوتے ہیں 'میونخ میں کچھ وقفے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ اپنے گذشتہ سفر میں جو کہ یورپ کا تیسرا سفر تھا ناصر الدین شاہ قاجار 'سلطنت کا خزانہ لٹا چکا تھا۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے وہ بینکنگ سے حاصل ہونے والے منافع 'تمباکو (کاشت کئے جانے سے لے کر خرید و فروخت اور در آمدات تک) اور دریائے کارون اور سرزمین ایران کے دوسرے منافع کا مغربی تہذیب کے کچھ مختصر قیمتی تحفوں کے بدلے میں سودا کر آیا تھا۔ اب وہ برطانیہ کے رقیب اور

اپنے پڑوسی ملک روس سے خوفزدہ تھا۔ لہذا سید جمال کی عظیم شخصیت اور سیاسی نفوذ کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ سید جمال سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس معضلہ کو حل کریں اور روس کی سلطنت کو اس کا سادہ اور مختصر حل پیش کرنے کی پیشکش کریں۔ امین السلطان اس ضمن میں ان سے پانچ گھنٹے تک مذاکرات کرتے رہتے ہیں۔ سید جمال کیونکہ ہر ممکنہ طریقے سے برطانیہ کی ظالمانہ سیاست کو خاتمہ دینا چاہتے تھے اور شاید اس طریقے سے دربار ایران کو برطانیہ سے دور کرنا چاہتے تھے لہذا خاصے اصرار کے بعد اس ماموریت کو قبول کرتے ہیں۔ وہ ۱۳۰۷ھ میں دوبارہ موسکو میں وارد ہوتے ہیں اور وہاں کے سیاسی رجال سے مذاکرات اور انہیں قانع کرنے کے بعد کہ دربار ایران کی مخالفت روس کے حق میں نہیں ہے ربیع الثانی ۱۳۰۷ھ میں دوبارہ وارد تہران ہوتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے اس مرتبہ بھی دربار ایران ان سے صحیح سے پیش نہیں آتا۔ شاہ ایران ایک مہینے بعد انہیں ملاقات کی اجازت دیتا ہے۔ اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد امین السلطان روس کی سفارت میں سید جمال کی ماموریت سے یکسر انکار اور لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔

سید جمال جب دیکھتے ہیں کہ سلطنت قاجاریہ کی سیاست صرف مکر و فریب پر مبنی ہے اور وہ برطانیہ کے اداروں کی پابند ہو گئی ہے' تو وہ معاشرے کی تمام سطح کے لوگوں میں پوری جرات اور شہامت کے ساتھ حریت' آزادی' اصلاحات اور استقلال کا نعرہ لگاتے ہیں۔

شہنشاہیت کے اس گھٹے ہوئے دور میں سلطنت کے خلاف ان کی صریح اور جوشیلی تقریریں سن کر اور ان کے افکار و آراء سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ یہ باتیں زبان زد عام و خاص ہونے لگیں کہ سید جمال سچ بولتا ہے کہ شاہ ظالم ہے' شاہ وطن فروش ہے شاہ عیاش ہے اور شاہ کے وزراء چور اور غدار ہیں۔ شہنشاہ ایران نے جو یہ باتیں سنیں اور بغاوت کے آثار دیکھے تو اسے یقین ہو گیا کہ سید جمال صرف ایک عظیم مفکر اور ماہر سیاستدان ہی نہیں بلکہ انقلاب اور آزادی کے ایک بے مثال رہنما بھی ہیں۔ لہذا اس مرتبہ اس نے بڑی سختی کے ساتھ ان کی جلاوطنی کے احکامات صادر کئے۔ انہوں نے ان احکامات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اپنے حامیوں اور میزبان سے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی کے غلام یا نوکر نہیں کہ شاہ ایران جب چاہے انہیں بلا لے اور جب چاہے نکال دے۔ اگر ان کا وجود سر زمین ایران کے لئے اتنا ہی مضر تھا تو پھر ہزار منتیں کر کے انہیں مغرب سے دوبارہ ایران کیوں بلوایا گیا تھا اور وساطت کے لئے روس بھیجا گیا تھا۔

دربار کی جانب سے جب دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا تو وہ تہران سے کچھ فاصلے پر واقع شاہ عبدالعظیم کے مزار میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ سینکڑوں لوگ روزانہ شاہ عبدالعظیم جیسی بزرگ شخصیت اور سید السادات کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتے تھے۔ سید جمال نے اس دینی مرکز کو سلطنت کے خلاف

اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ وہ سات مہینے تک کھلے عام دربار کی حماقتوں، فضول خرچیوں اور قوم و ملک سے غداری پر شدید حملے کرتے رہے۔ وہ حکومت کے خلاف محاذ کھڑا کرنے میں پوسٹرز، پمفلٹ سمیت تحریر و تقریر کے ہر ذریعے کو بروئے کار لاتے رہے۔ ان کے یہ بے سابقہ اقدامات شاہ اور اس کے وزراء کے غیظ و غضب کا باعث بنتے ہیں اور شاہ عبدالعظیم کے مزار سے ہی انہیں بدترین انداز میں جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ شاہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک خاص دستہ آگے بڑھتا ہے اور سردی کے سخت موسم میں انہیں اٹھا کر برف کے تودوں پر پٹخ دیتا ہے۔ شاہ کے یہ بھیجے ہوئے درندے اسی حالت میں انہیں مٹی اور برف کے تودوں کے درمیان گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ ان کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔ جس پر یہ سپاہی انہیں تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں لیکن وہ تو پہلے ہی جھٹکے میں بے ہوش ہو چکے تھے۔ پہلے انہیں قم لے جایا جاتا ہے۔ اور وہاں سے کرمانشاہ پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں کچھ دن انہیں رہنے دیا جاتا ہے تاکہ ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیماری اور تشدد میں جان دے دیں اور ان کا خون شاہ کے گلے میں پڑ جائے۔ بہر صورت جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ کو انہیں خانقین یعنی ترکی ایران سرحد سے جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ اس جلاوطنی میں بیرونی ممالک کی سفارتوں کے علاوہ سلطنت برطانیہ بھی اہم کردار ادا کرتی ہے جو سید جمال الدین کی ایران میں موجودگی کو دربار ایران سے کئے گئے معاہدے اور ایران میں انگلستان کے مفادات کے لئے مضر تصور کرتی ہے۔

تمباکو کی تحریک

سید جمال الدین کو ایران سے جلاوطن کر کے بغداد پہنچا دیا گیا۔ وہاں بھی باب عالی (ترکی) سے خاص احکامات پہنچنے کے بعد ان پر سختی شروع کر دی گئی۔ لیکن آخر کار وہ بصرہ چلے گئے۔ اپنی جلاوطنی سے پہلے وہ شاہ ایران اور برطانیہ کے درمیان ہونے والے معاہدوں کے خلاف بہت کچھ بول چکے تھے اور عوامی سطح پر عوام سے لے کر علماء، دانشور طبقات کو ان معاہدوں سے حاصل ہونے والے نقصانات اور خساروں سے آگاہ کر چکے تھے۔ چنانچہ جب غیر ملکی کمپنیوں نے ایران میں اپنا جال پھیلانا شروع کیا اور مغربی طرز کی دکانیں، تھیٹر، شراب خانے، رقص و سرود کے مرکز اور فحاشی کے اڈے کھلنے لگے اور دو لاکھ فرنگی ایران کے مختلف شہروں میں وارد ہو کر قدم جمانے لگے تو ایران کے دیندار علماء نے ان معاہدوں کے سیاسی و اقتصادی نقصانات سے زیادہ لوگوں کے دین و ایمان کی فکر کی۔ لوگوں نے بھی ہر حوالے سے ان کا پورا ساتھ دیا۔ تقریباً ہر شہر میں ان فرنگیوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات بھڑکنے لگے لیکن شیراز میں ان

نفرت کی لہر بہت شدید تھی۔ رمضان ۱۳۰۸ھ میں جب ان کمپنیوں کے برطانوی ملازمین شیراز کے قرب وجوار میں پہنچے تو لوگوں نے احتجاج کے طور پر تمام دکانیں بند کردیں اور پورے شہر میں ہڑتال کردی گئی۔ وہاں کے ایک مشہور عالم دین سید علی اکبر شیرازی نے مسجد میں لوگوں کو جمع کیا اور تقریر کے دوران اپنی عبا میں سے تلوار نکال کر کہا کہ جو فرنگی بھی تمباکو کے اثاثوں کو خود سے منحصر کرنے کیلئے آگے بڑھے گا وہ اس تلوار سے اس کا پیٹ چاک کردیں گے۔ سید علی اکبر شیرازی کو گرفتار کر کے ان پر تشدد کیا گیا اور شیراز میں حکومت نے جوابی کاروائی کی۔ آخر کار سید علی اکبر کو جلاوطن کر کے بصرہ بھیج دیا گیا جہاں ان کی ملاقات سید جمال الدین سے ہوئی۔
سید علی اکبر شیعوں کے عالمی پیشوا اور مرجع تقلید مرزا حسن شیرازی کے رشتہ دار تھے اور انہی کے پاس سامرا جا رہے تھے۔ سید جمال الدین نے ان کے توسط سے مرزا شیرازی کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ حجتہ البالغہ نامی اس تاریخی خط میں سید جمال نے مرزا شیرازی کو ایران میں پیش آنے والے بحران کے بارے میں صحیح اطلاعات فراہم کیں۔ انہوں نے شاہ ایران اور انگلستان کے درمیان ہونے والے معاہدوں کو تفصیل سے بیان کیا اور ان سے حاصل ہونے والے نقصانات کی نشاندہی کی۔ اس کے علاوہ دربار میں حاکم ظلم واستبداد اور علماء پر ہونے والے مظالم کی تفصیلات بھی رقم کیں اور اپنے پر ہونے والی زیادتیوں کے علاوہ سید علی اکبر شیرازی پر ہونے والے تشدد اور جلاوطنی کو شاہد کے طور پر پیش کیا۔ آخر میں انہوں نے اس دینی پیشوا سے چاہا کہ وہ اپنے دینی فریضہ کو انجام دیتے ہوئے ناصر الدین شاہ کی اس احمقانہ سیاست کے خلاف لوگوں کا فریضہ معین کریں اور بتائیں کہ لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟

اس خط کا عربی ترجمہ ان کی زندگی پر موجود کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجلہ المنار جلد دھم sq 820 میں اور انگریزی زبان میں براؤن کے نوشتہ جات (E.G.Brown op.cit 15-21) میں اسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ علی اکبر شیرازی یہ خط مرزا شیرازی کے پاس لے جاتے ہیں اور بذات خود بھی ایران کے حالات ومسائل سے انہیں آگاہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد مرزا شیرازی کی جانب سے مورخہ ۱۷ محرم ۱۳۰۹ھ کو کامران مرزا کے حوالے سے شاہ ایران کو ایک تار بھیجا جاتا ہے جس میں معاہدۂ تمباکو کو قرآن کریم کے خلاف اور ایران کے استقلال کو کمزور کرنے کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ نیز علماء اور کچھ عام لوگوں پر کیے جانے والے مظالم کو اس معاہدہ کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ جواب کے طور پر شاہ ایران کی طرف سے بغداد میں سلطنت کے نمائندے مرزا محمود خان کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ مرزا شیرازی کے پاس جا کر اس معاہدے کے فوائد بیان کریں اور اس کو ختم کرنے کے نقصانات کی

وضاحت کریں۔

مرزا شیرازی اس معاہدے کو یکسر دین کے خلاف سمجھتے تھے لہذا ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ کو ایک بار پھر ان کی جانب سے ٹیلی گرام بھیجا جاتا ہے اس مرتبہ یہ تار نائب السلطنت کے توسط سے بھیجا جاتا ہے لیکن جب دربار ایران مرزا شیرازی کے اصرار کے باوجود اس معاہدے کو منسوخ کرنے کے بجائے وضاحتوں پر اکتفا کرتا ہے تو وہ تمباکو کے استعمال کو سرے سے حرام اور ناجائز قرار دے دیتے ہیں۔ یہ فتوی مرزا حسن آشتیانی جیسے جید علماء کو تہران بھیج دیا جاتا ہے اور اسے منتشر کرنے میں وہ بھی خاصا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ فتوی ایک غیر معمولی اثرات کا سبب بنتا ہے اور اس کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوتے ہیں ' سلطنت کے سپاہیوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور کچھ لوگ شہید ہو جاتے ہیں عورت ' مرد ' بوڑھے ' جوان ' بازاری اور نوکر پیشہ افراد سے لے کر فوج اور سول حکام تک سب کے سب تمباکو کے استعمال سے مطلقاً پرہیز کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ حکم شاہ کی دہلیز تک پہنچتا ہے۔ جب شاہ اپنی بیگمات پر اعتراض کرتا ہے کہ تمباکو کا استعمال جائز ہے تو بیگمات جواب دیتی ہیں کہ جس کسی نے ہمیں تم پر حلال کیا ہے اسی نے تمباکو کا استعمال ' جس حد تک کہ مذہب کے دائرے سے باہر ہے ' حرام قرار دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء اور دینی پیشوا کس حد تک اس وقت کے ایرانی معاشرے میں نفوذ رکھتے تھے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیعت کے عالمی پیشوا ہر دور میں اس طرح کے تاریخی فتوے دیتے چلے آئے ہیں۔ اس صدی میں اس کی مشہور مثال وہ فتوی ہے جو امام خمینی نے شیطانی آیات (Satanic Verses) کے مصنف سلمان رشدی کے بارے میں دیا تھا۔ عوام کا سخت دباؤ شاہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے اور ۵ جمادی الثانی ۱۳۰۹ھ کو یہ معاہدہ مکمل طور پر منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ اس پوری تحریک کو شروع کرنے اور اسے نتیجہ تک پہنچانے میں سید جمال کا کردار اور ان کے گروہ کی خدمات اپنی جگہ محفوظ ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ علماء کی توجہ شاہ ایران کی حماقتوں کی جانب مبذول نہ کراتے اور برطانیہ کی سازشوں کو ان کے سامنے بے نقاب نہ کرتے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح یہ کمپنیاں بھی نہ معلوم کتنے سال تک ایرانیوں کو اپنا غلام بنائے رکھتیں۔

دوبارہ لندن

ایران کی سلطنت بصرے میں سید جمال کی سرگرمیوں سے واقف ہو چکی تھی۔ لہذا اس نے اس ضمن میں ترکی کی حکومت کو لکھا۔ اور اس سے پہلے کہ باب عالی کا حکم حاکم بصرہ تک پہنچتا

سید جمال لندن روانہ ہو چکے تھے۔ ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۰ء میں لندن پہنچنے کے بعد وہ ایران کے سیاسی و معاشرتی حالات کے بارے میں مقالے لکھتے ہیں۔ شروع میں وہ ایران کے معزول شدہ وزیر مختار مرزا ملکم خان کے اخبار "قانون" میں اپنے کچھ مقالے شائع کراتے ہیں۔ صحافی و خبر نگار ان سے انٹرویو لیتے ہیں۔ نیشنل لبریشن کلب (National Liberation Culb) میں وہ ایران کی سیاست حاضرہ پر زبردست تقریر کرتے ہیں لیکن انگلستان کی خارجہ پالیسی پر مطلقاً کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ ان کی اس تقریر کی خبر گارجین (Guardian- Manchester) مؤرخہ ۱۸ دسمبر ۱۸۹۱ء میں شائع ہوتی ہے جو ان کی غیر معمولی شخصیت اور افکار پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ انگلستان کے دانشوروں اور ارباب سیاست کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہیں کہ وہ ایران کے حالات و مسائل سے صحیح واقفیت نہیں رکھتے اور قونصل خانوں اور حکومتی اداروں کے ذریعے سے ایران کو سمجھنے میں خاصی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ اس طرح سید جمال لندن کی آزاد فضا میں انگریزوں کی آرائے عامہ کو ایران میں موجود ظلم و استبداد کی جانب مائل کرتے ہیں۔ اسی اثناء میں انہیں معاہدہ تمباکو کے منسوخ کیے جانے کی خبر ملتی ہے اور یقین ہو جاتا ہے کہ علماء ہی کے ذریعے سے وہ ایران میں اسلام' آزادی اور اصلاح کی آواز اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایران کے صف اول کے چند نمایاں علماء کے نام ایک اور تفصیلی خط لکھتے ہیں۔ اس خط میں شاہ کی سیاست اور دربار کے کارنامے درج کرنے کے بعد انہیں ناصر الدین شاہ کو اقتدار سے معزول کر دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ لندن میں وہ ضیاء الخافقین (Zia-ul-Khafiqain) نامی ایک جریدہ نکالتے ہیں جو عربی اور انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ اس مجلّہ میں وہ شاہ ایران اور دربار پر شدید حملے کرتے ہیں اور ایران میں اصلاحات اور آزادی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ اس جریدے کے پہلے شمارے مورخہ رجب ۱۳۰۹ھ میں وہ مرزا شیرازی کے نام اپنا خط شامل کرتے ہیں جبکہ دوسرے میں علماء کے نام خط (حملتہ القرآن) شائع کرتے ہیں۔

سید جمال کے سیاسی اقدامات اس حقیقت کو بخوبی ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک کالم نگار یا صحافی نہیں بلکہ ایک منجھے ہوئے سیاستدان تھے جو اس وقت کی رائج سیاست اور ڈپلومیسی کو اچھی طرح برتنا جانتے تھے۔ ان کے اقدامات میں سے ایک ملکہ برطانیہ کے نام ان کا تفصیلی خط بھی ہے۔ اس خط میں وہ ایران میں موجود ظلم و استبداد کی جانب ملکہ کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ وہ تمباکو تحریک سے لے کر اصلاحات' آزادی' مظاہرات اور علماء پر ہونے والے مظالم تک کی روداد ان کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ وہ سلطنت برطانیہ اور اس کے زیر نظر کمپنیوں کے طرز عمل کو ایران کے لوگوں کے انسانی حقوق چھینے جانے کے مترادف قرار دیتے ہیں اور برطانیہ کو

سلطنت شہنشاہی کی کھلی حمایت روک کر قوم وملت کا طرفدار بننے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ ملکہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ انگلستان کی حکومت کو اپنے طرز عمل کی اصلاح کرنے پر مجبور کریں اور ایران میں آبادی، عمران اور اصلاحات کے لئے شاہ ایران پر ضروری دباؤ ڈالیں۔ آخر میں وہ خبردار کرتے ہیں کہ اگر سلطنت برطانیہ ان امور کی جانب کوئی مثبت قدم نہیں اٹھائے گی تو یہ کام سلطنت روس انجام دے گی۔

شاہ ایران لندن میں سید جمال کی سیاسی سرگرمیوں سے ویسے ہی خوفزدہ تھے لیکن جب انہوں نے ضیاء الخافقین اور قانون نامی جرائد دیکھے اور ایران کے صف اول کے علماء کے نام سید جمال کا خط پڑھا تو ان کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے برطانیہ کے سفیر کے سامنے سلطنت ایران کی طرف سے سخت احتجاج کیا اور سید جمال کو ایک قانونی مجرم قرار دے کر ایران کے حوالے کرنے اور ان کے جریدے پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔ برطانیہ کی وزارت خارجہ انہیں توضیحات پیش کرتی رہی کہ وہ سید جمال کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی لیکن کسی صورت شاہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ آخر کار وزارت خارجہ مذکورہ جریدے کے پرنٹنگ پریس کو گرانٹ بند کرنے کی دھمکی دے کر ضیاء الخافقین کو رکوا دیتی ہے۔ اور صرف دو شمارے شائع ہونے کے بعد یہ جریدہ بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ انہیں دنوں سید جمال کو ترکی کے سفیر سلطان عبدالحمید کی جانب سے استنبول آنے کی دعوت ملتی ہے لیکن سید جمال اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد ترکی کے سفیر کو سلطان عبدالحمید کی جانب سے دو خط موصول ہوتے ہیں۔ پہلے خط میں سفیر کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ ہر حال میں جمال الدین کو استنبول روانہ کرے اور اگر سید جمال اس دعوت کو قبول نہ کریں تو سلطان سفیر کا کوئی عذر قبول نہ کریں گے۔ دوسرا خط سید جمال کے نام ہوتا ہے اس خط میں انہیں نہایت عزت واحترام کے ساتھ استنبول آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ سید جمال اس دعوت کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ خلافت عثمانیہ ان کی صلاحیتوں کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے بروئے کار لانا چاہتی ہے ایسے میں افسوس کا مقام ہے کہ ان کی صلاحیتیں کفار کی سرزمین میں ضائع ہو جائیں۔

یوں تو انہیں ترکی میں اس اہتمام سے بلائے جانے کے حقیقی اسباب وعوامل واضح نہیں لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سرگرمیوں کو زیر نظر لانے اور انہیں پابند کرنے کے لئے ترکی بلایا گیا تھا۔ ایک عرصہ دراز سے دوسری سفارتوں کی طرح ترک سفارت بھی ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی ۔ ان کی مذمت اور ہجو میں اختر نامی جریدہ سفیر ایران کی کوششوں سے ترکی ہی میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ ایران نے بھی سلطان عبدالحمید سے تقاضا کیا تھا کہ وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال

کرتے ہوئے دربار ایران کے خلاف ان کی سرگرمیوں کو خاتمہ بخشیں۔ سلطان کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ سید جمال شریف مکہ کی سرکردگی میں ایک نئی اسلامی خلافت کی تشکیل میں منہمک ہیں اور اگر یہ بات حقیقت نہ بھی رکھتی ہو تب بھی یہ اندیشہ تو موجود تھا کہ لندن میں ترکی کی اصلاحی تحریک کہیں ان کے زیر قیادت نہ چلی جائے۔ یہ تمام احتمالات اپنی جگہ قابل ذکر ہیں اور بعید نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک سبب کارفرما ہو یا پھر سلطان عبدالحمید اپنی قیادت میں اسلامی کانفرنس کی تشکیل کا ارادہ رکھتے ہوں اور اس کے لئے سید جمال کے وجود کو ضروری سمجھتے ہوں۔

آخری سفر

۱۳۱۰ھ.ق / ۱۸۹۳ء میں سید جمال اسلامبول میں وارد ہوتے ہیں۔ سلطان کے قصر کے نزدیک نشان طاس کے علاقے میں ان کے لئے ایک خوبصورت گھر کا انتظام کیا جاتا ہے۔ وہ جب استنبول یا اسلامبول پہنچتے ہیں تو پروٹوکول کے افسر آگے بڑھ کر ان کے سامان کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔

آپ کا سامان کہاں ہے؟

سید جمال: کتاب اور کپڑوں کے بکسوں کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔

افسر: ٹھیک ہے ان کی جگہ بتا دیجئے۔

سید جمال: اپنے سینہ کی جانب اشارہ کر کے یہ کتاب کے بکسے ہیں۔ اور اپنے پہنے ہوئے کپڑوں کی جانب اشارہ کر کے یہ لباس کے بکسے ہیں۔

سلطان عبدالحمید سے ہونے والی ملاقاتوں میں وہ مسلمانوں میں موجود فرقہ گرائی اور اندرونی اختلافات پر سلطان کو ایک تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق بر قرار کرنے کی جانب ان کی توجہ دلاتے ہیں۔ اس ضمن میں سلطان سے کئی ملاقاتوں کے بعد وہ مسلمانوں میں اتحاد بر قرار کرنے کیلئے ایک گروہ تشکیل دیتے ہیں اور مندرجہ ذیل لائحہ عمل ترتیب دیتے ہیں۔

۱۔ حکومتی و مملکتی سطح پر شاہ ایران، خدیو مصر، شاہ مراکش اور دوسرے رؤسا سے مذاکرات کرنا اور اتحاد کے لئے راہ ہموار کرنا۔

۲۔ سنی شیعہ اور اس جیسی دوسری تفریق سے بالاتر ہو کر اسلام کے علماء، زعماء اور مشائخ سے خط و کتابت کرنا اور اتحاد بر قرار کرنے کیلئے انہیں ایک مرکز پر جمع ہونے کی ترغیب دینا۔

طے یہ پایا کہ مذکورہ لائحہ عمل کے دوسرے اور اہم حصے کو سید جمال انجام دیں گے جبکہ

پہلے حصے کو سلطان عبدالحمید انجام دیں گے۔ سید جمال اسلامی کانفرنس کی تشکیل کے لئے ہر ملک سے ایک سرکاری نمائندہ کے علاوہ صف اول کے ایک جید عالم دین کے وجود کو لازمی قرار دیتے ہیں جو صحیح معنوں میں ملت اسلامیہ کا ترجمان ہو۔ تمام اسلامی ممالک کے یہ نمائندے اسلامبول میں جمع ہو کر ایک کانفرنس کا سنگ بنیاد رکھیں اور امت مسلمہ کے اہم اور بنیادی مسائل کو چاہے وہ کسی خطہ اور گوشہ سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں' اس کانفرنس میں حل و فصل کریں۔ نیز قانونی طور پر تمام اسلامی ممالک اس کانفرنس کے فیصلوں کا بھرپور احترام کرتے ہوئے ان کے تابع رہیں گے تاکہ تمام ممالک مل کر مسلمانوں کی ترقی و تکامل کے وسائل جمع کریں اور اسلام کو نشاۃ ثانیہ عطا کریں۔ نیز اگر مغربی ممالک میں کوئی ملک کسی اسلامی مملکت پر حملہ آور ہو تو اس کانفرنس میں اس ملک کے خلاف جہاد کا اعلان کیا جائے اور اس سے ہر طرح کے سفارتی تعلقات منقطع کر کے اس کی مصنوعات کو حرام قرار دیا جائے اور تمام ممالک اس سے نبرد کے لئے خود کو تیار کریں۔

اگر سید جمال اس نوعیت کی کانفرنس کو عملی صورت دینے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر مسلمان عالمی برادری سے رحم کی بھیک مانگنے اور مدد کا تقاضا کرنے کے محتاج نہ رہتے اور اپنے مسائل کو اسی کانفرنس میں حل کر لیا کرتے۔ وہی مقاصد جن کی بر آوری کے لئے دنیا کی مقتدر اور ترقی یافتہ اقوام 'اقوام متحدہ یا (UNO) کو استعمال کرتی ہیں۔ سید جمال نے سلطان سے یہ درخواست بھی کی کہ ایران کی حکومت جس کی اکثریت شیعہ مذہب ہے' ایک مستقل حکومت ہے۔ لہذا انہیں جذب کرنے اور اتحاد کے لئے سازگار ماحول فراہم کرنے کے لئے مناسب ہے کہ خلافت عثمانیہ شیعوں کے مقدس مقامات پر مبنی علاقوں یعنی نجف و کربلا و سامراء کو ایران کے حوالے کر دے۔ اس کانفرنس کی سربراہی پر سید جمال اور سلطان کے درمیان اختلاف نظر تھا۔ بعد میں سید جمال کو اندازہ ہوا کہ سلطان خود سے خلیفہ اسلامی بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

بہر حال کانفرنس کے لائحہ عمل کے دوسرے حصے کو انجام دینے کے لئے انہوں نے دانشوروں اور مفکرین پر مبنی ایک مختصر سا گروہ تشکیل دیا جو مشرق کی پانچ سے زائد زبانوں پر مکمل عبور رکھتا تھا۔ انہوں نے پانچ سو سے زائد خطوط تمام اسلامی ممالک میں موجود نامور علماء اور اہم شخصیات کو روانہ کئے۔ انہیں دو سو سے زائد جوابات بمع تحفے تحائف کے موصول ہوئے۔ یہ جوابات بمع تحفوں کے سلطان کی خدمت میں بھجوا دیئے گئے۔ سلطان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرط مسرت سے سید جمال کو گلے لگا لیا۔ جب کانفرنس کے دوسرے حصے کو عمدگی سے انجام دیا گیا اور پہلے حصے کی باری آئی اور علماء و عوام سے رابطہ برقرار ہونے کے بعد

حکومتی سطح پر مذاکرات کا مرحلہ سامنے آیا تو سلطان نے ان امور کو باب عالی کے حوالے کر دیا اور صدر اعظم اور شیخ الاسلامی کی موافقت کو ضروری سمجھا۔ اس کے بعد سے مسائل الجھتے چلے گئے۔ بد قسمتی سے انہی دنوں ایران میں ان کے ایک مرید مرزا رضا کرمانی نے ان سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ اس مرد حق پر سید جمال سے والہانہ عقیدت رکھنے اور آزادی کی تحریک چلانے کے الزام میں خاصا تشدد کیا گیا تھا یہاں تک کہ وہ ایران سے نکل کر ترکی آگئے۔ سید جمال نے انہیں ملاقات کی اجازت نہ دی لیکن ان کے علاج کے اخراجات ادا کرتے رہے اور دیکھ بھال بھی کرواتے رہے۔ مرزا رضا واپس ایران جانا چاہتے تھے تو انہوں نے ملاقات کے لئے بہت زور ڈالا۔ سید جمال نے اجازت دی۔ مرزا رضا سید جمال کو اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی روداد سناتے رہے یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سید جمال نے جب اس حق پرست مجاہد کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو ان کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے سختی سے جواب دیا:

"رونا بوڑھی عورتوں کا کام ہے۔ جب تک انسان کے لئے موت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اسے ظلم اور پستی کو ہرگز برداشت نہیں کرنا چاہئے۔ جاؤ اور ظلم کی جڑ کو ایران سے اکھاڑ پھینکو۔"

سید جمال کی ترغیب پر مرزا رضا کرمانی ایران واپس چلے جاتے ہیں اور شاہ عبدالعظیم کے مزار پر مورچہ جما کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ذیقعدہ ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۶ء ایران ناصر الدین شاہ کے مسند نشین ہونے کے پچاس سالہ جشن کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اس جشن کو شروع ہونے میں ایک دن باقی ہے کہ قضا سے شاہ ایران حضرت عبدالعظیم کے مزار پر حاضری کے لئے آتا ہے اور عین اسی جگہ پر وہ مرزا رضا کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے جہاں سے سید جمال کو بیماری کی حالت میں مارتے پیٹتے اور توہین کرتے لے جایا گیا تھا۔ حق ہے کہ قدرت اپنے نیک بندوں پر کئے جانے والے مظالم کا انتقام ضرور لیتی ہے۔ اس قتل کے بعد ایک طرف سے مرزا رضا اعتراف کر لیتے ہیں کہ وہ سید جمال کے قریبی ارادتمند ہیں اور دوسری طرف سلطان کی جانب سے اسلامبول میں اس موضوع کے بارے میں تحقیقات کرائی جاتی ہیں۔ ان تحقیقات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ قتل سید جمال کی ترغیب پر کیا گیا ہے۔ اس قتل کے بعد ایرانی حکومت رسمی طور پر سید جمال کو ایران کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اس لئے کہ سید جمال ایرانی الاصل ہیں اور شاہ کے قتل میں ملوث ہیں۔ ترکی کی حکومت اس ضمن میں ٹال مٹول سے کام لیتی ہے اور انہیں افغانی بتاتی ہے لیکن ایران کی وزارت خارجہ ایران میں اسد آباد کے حاکم سے اور دوسری جگہوں سے ان کے ایرانی ہونے پر متعدد دستاویزات خلافت عثمانیہ کو پیش کرتی ہے۔ دربار ایران اور

باب عالی کے درمیان یہ کشمکش دس ماہ تک جاری رہتی ہے اور آخر کار سلطان سید جمال کو ایران کے حوالے کرنے کا وعدہ بھی کر لیتے ہیں۔ اس مسئلے کے علاوہ بھی اس دوران ایسے اتفاقات اور مسائل پیش آتے ہیں جو سید جمال کے گرد حصار مزید تنگ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ان پر سختیاں بڑھ جاتی ہیں اور ان سے ملنے والوں کی بھی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ بہر صورت منجملہ مسائل کے ایک مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ عباس حلمی خدیو مصر کے نائب اسلامبول آتے ہیں اور سید جمال سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ملاقات کی اجازت نہیں دی جاتی۔ سید جمال تفریح کیلئے ہر روز باہر نکلا کرتے تھے۔ شاید خدیو کو اس کی اطلاع مل گئی تھی یا اتفاقاً وہ پریس میں کچھ دیر کے لئے خدیو سے ملاقات کر لیتے ہیں۔ سید جمال سے حسد کرنے والے چاپلوس درباری اور خلافت کے جاسوس اس ملاقات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ اس ملاقات کو پہلے سے طے شدہ بتلاتے ہیں اور سید جمال پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے اس ملاقات میں خدیو کو خلیفہ بننے کی پیشکش کی لیکن خدیو نے اسے مسترد کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ناروا تہمتوں اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کے گھٹے ہوئے ماحول میں سید جمال کسی طرح کی سرگرمی نہ کر سکتے تھے بلکہ خود ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا لہٰذا انہوں نے سلطان عبدالحمید کو خط لکھ کر خلافت عثمانیہ کی جانب سے ان پر ہونے والی زیادتیوں کا گلہ کیا اور سلطان کو ان چاپلوس اور مکار درباریوں کے وجود سے آگاہ کیا جو کسی لمحہ بھی ان پر جھوٹ باندھنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ وہ سلطان کو توجہ دلاتے ہیں کہ اس ماحول میں ان کے لئے اسلام کی خدمت کرنا ناممکن ہے اس لئے کہ یہ کوئی صفت لوگ انہیں آزادی سے کام نہ کرنے دیں گے اور وہ صفائیاں پیش کرنے میں اپنی توانائیاں ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا صلاح اس میں ہے کہ انہیں لندن جانے کی اجازت دی جائے۔ جب سید جمال کو سلطان کی جانب سے اس ضمن میں کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو انہوں نے برطانیہ کے سفیر کے پاس یہ پیغام بھیج دیا کہ ان کی لندن واپسی کے انتظامات کئے جائیں۔ برطانیہ کے سفیر ان کی واپسی کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ ادھر یہ خبر سلطان تک پہنچی تو انہوں نے سید جمال کو یہ پیغام بھجوایا کہ اسلام کی عزت کی خاطر وہ راضی نہ ہوں کہ منصب خلافت کی اس حد تک توہین کی جائے کہ وہ فرنگیوں کے ممالک میں جا کر پناہ لیں۔ سید جمال تو رخت سفر باندھ چکے تھے لیکن قضا نے اجازت نہ دی اور اسلامی حمیت اور غیرت آڑے آئی۔ چند دن بعد یہ خبر پھیلی کہ ان کے جبڑے میں سرطان پھیل گیا ہے۔ سلطان نے اپنے خاص طبیب سے معالجہ کروایا۔ لیکن ۵ شوال ۱۳۱۴ھ / ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اس مرد حق نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

ان کی وفات کے اسباب و عوامل کی تفصیلات خاصی مختلف ہیں لیکن شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں زہر دیا گیا اور ان کے دانت میں معمولی سے درد کو اس کی آڑ بنایا گیا۔ وہ اپنی آنکھوں سے مشرقی اقوام کی برتری اور شان و شوکت دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس آرزو کو دل میں لئے اس دنیا سے چلے گئے۔ انہوں نے مشرقی اقوام کے عقائد و افکار کی اصلاح اور انہیں مغرب کی غلامی سے نکالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن تنگ نظری' حسد اور پستی نے مشرق کو ان کے آراء و افکار سے صحیح فائدہ اٹھانے اور انہیں ان کی زندگی میں عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ دیا۔ بعد کے ادوار میں بھی ان کی عظمت و مجاہدت کی وہ قدر دانی نہ کی گئی جو ان کے شایان شان تھی۔ انہیں گمنام طریقے سے دفن کیا گیا لیکن مرنے کے بعد بھی انہیں آرام نصیب نہ ہوا۔ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد ترکی کی حکومت نے تعصبات میں ڈوبے ہوئے کچھ جاہل افغانیوں کو عالم اسلام کے اس عظیم مفکر کی قبر کھودنے اور ان کی بے حرمتی کرنے کی اجازت دے دی اور ان کا جسد خاکی کابل لے جایا گیا۔ جب ایران میں ان کے قرابتداروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایرانی وزارت خارجہ کو اس ضمن میں لکھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی!

اللہ کے اس مقرب بندے کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد بھی کیا ایران کی شاہی سلطنت اور خلافت عثمانیہ انتقام الٰہی کا شکار نہ ہوتی۔۔؟ شاید یہی وجہ ہے کہ آج ترکی میں لادینیت حاکم ہے اور اسرائیل نے قدم جمائے ہوئے ہیں۔ مخلص و جانباز مسلمانوں کی موجودگی میں اور ایک اسلامی پارٹی کے برسرکار ہونے کے باوجود بھی وہاں دینی فرائض کو انجام دینا جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس عظیم تبدیلی کی وجہ مصطفیٰ کمال پاشا جیسے لادین اور وطن پرست لوگ ہیں جنہوں نے ترکی کی سرحدوں کا تو دفاع کر لیا لیکن سینکڑوں سالہ اسلامی تہذیب اور اسلامی اقدار کو دفن کر کے لباس خراش' رسم الخط اور طور طریقوں میں لادینیت کو حاکم کر دیا۔

سید جمال کے بارے میں کچھ دانشوروں کی آراء

برصغیر میں گذشتہ ادوار میں مولانا ابو الکلام آزاد اور انجمن ترقی اردو علیگڑھ کے صدر مولوی عبدالغفار خان سید جمال کی شخصیت پر مفید مقالے لکھ چکے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عظیم انسانوں کی عظمت کا اعتراف فہم و شعور رکھنے والے دوست اور دشمن سب ہی کرتے ہیں۔

۱۔ جواہر لعل نہرو Glimpses on the world history (دنیا کی تاریخ پر اجمالی نگاہ) میں مصر کے باب میں سید جمال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سید جمال الدین افغانی مصر میں انیسویں صدی کے سب سے بڑے مصلح تھے۔ وہ ایک مذہبی پیشوا تھے اور اسلام کو اس دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نفوذ نہ فقط مصر میں بہت زیادہ تھا بلکہ یورپی اسلامی اور عرب دنیا میں وہ غیر معمولی شہرت اور حیرت انگیز تاثیر رکھتے تھے۔"

۲۔ علامہ اقبال سید جمال کو اپنا امام اور مقتدا سمجھتے ہیں۔ وہ فارسی زبان کے مجموعہ کلام کے ایک حصے "جاوید نامہ" میں ایک نظم کہتے ہیں۔ اس عرفانی نظم میں وہ پیر طریقت ملا رومی کے ساتھ عالم ارواح کے سفر کے لئے نکلتے ہیں۔ دوران سفر انہیں سید جمال نماز کی امامت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چانچہ وہ سید جمال کی امامت میں دو رکعت نماز پڑھنا اور ان کے شرک و بت پرستی سے پاک ابراہیمی لہجہ میں قرآن کریم کی قرائت سننا اپنے لئے باعث صد عزو شرف سمجھتے ہیں۔

رفتم و دیدم دو مرد اندر قیام — مقتدی تاتار و افغانی امام
گفت مشرق زین دو کس بہتر نزاد — ناخن شان عقدہ ہائے ماگشاد
سید السادات مولانا جمال — زندہ از گفتار او سنگ و سفال

وہ سید جمال کو ہاشمی نژاد اور نسل رسول پاکؐ کا وہ تابناک گوہر سمجھتے ہیں جس کی روشنی پورے مشرق میں پھیلی ہوئی ہے اور اس روشنی سے مشرق کے پتھر اور سنگریزے بھی روشن ہیں
علامہ اقبال اپنی تصنیف کے فارسی ترجمے "احیائے فکر دینی در اسلام" میں لکھتے ہیں:
"اس دور کے مسلمانوں کی ذمہ داریاں بہت سنگین ہیں۔ انہیں ماضی سے یکسر اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اپنی مسلمانیت اور اپنے ایمان کی از سر نو تعمیر کرنا ہے۔ شاید شاہ ولی اللہ دہلوی وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اس ضرورت کا احساس کیا۔ لیکن جو شخصیت مکمل طور پر اس فریضہ کی عظمت و اہمیت کی جانب متوجہ ہوئی اور جس نے اسلامی افکار اور اسلامی تاریخ میں گہری بصیرت پیدا کی اور قوموں کے آداب و اخلاق میں اس کے وسیع تجربہ و مطالعہ سے حاصل شدہ وسعت نظر نے اسے ماضی اور حال کے درمیان ایک مستحکم پل اور مضبوط واسطہ بنا دیا' سید جمال الدین افغانی تھے۔ اگر ان کی ناقابل شکست توانائی تجزیہ نہ ہوتی اور اگر حالات انہیں صرف عقیدتی و اخلاقی زوایہ سے اسلام میں تحقیق کی اجازت دیتے تو آج دنیائے اسلام عقلی حوالے سے مستحکم ستونوں پر استوار ہوتی۔"

۳۔ مصر کی مشہور شخصیت مفتی شیخ محمد عبدہ جو اپنی شہرت کے باعث الاستاذ الامام کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور جن کی آراء تفسیر المنار میں نقل کی گئی ہیں در حقیقت سید جمال کے

افکار اور ان کی تربیت کا ثمر تھے۔ شیخ محمد عبدہ اپنے پورے وجود کو سید جمال کے مرہون منت سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سید جمال سے پہلے وہ اندھے تھے انہوں نے آنکھیں دیں وہ بہرے تھے انہوں نے سماعت دی وہ گونگے تھے انہوں نے زبان دی۔ اپنے ایک خط مورخہ ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ میں شیخ محمد عبدہ نے اس کا اظہار کیا کہ ان سے شیخ عبدہ کو تین ایسی حکمتیں منتقل ہوئی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی پتھر میں منتقل کر دی جاتی تو وہ انسان بن جاتا۔ وہ سید جمال کو ایک علامۂ دہر اور نابغۂ روزگار توصیف کرتے ہیں جس کے سینے میں علوم اور معانی کا سمندر رہو اور جس کی قدرت فکر لحہ بھر میں الجھے ہوئے گنجلک مسائل کو حل کر دے۔ (مجلہ کابل سال سوم' شمارہ اول و سوم)

۴۔ امیر شکیب ارسلان بھی سید جمال پر ایک تفصیلی مقالہ لکھتے ہیں۔ اس مقالے میں وہ سید جمال کو حکیم مشرق اور عالم اسلام کا ایک عظیم مفکر' بے مثال فلسفی اور حق کی ایک نمایاں نشانی قرار دیتے ہیں۔ وہ سید جمال کو ایک صحیح اسلامی معاشرے کو علمی صورت دینے والا مثالی رہنما قرار دیتے ہیں۔

۵۔ ڈاکٹر کلیم صدیقی سید جمال کے بارے میں لکھتے ہیں: "سامراجی طاقتوں کے اس پورے دور میں صرف ایک مرد حق گزرا ہے جس نے اسلام کو ایک عالمی تحریک کی نگاہ سے دیکھا۔ ان سے پہلے چھوٹے چھوٹے گروہ اور تحریکیں الگ الگ اسلام کیلئے لڑتے تھے۔ لیکن جمال الدین افغانی کا اثر و رسوخ افغانستان' ہندوپاک' ایران' خلافت عثمانیہ' مصر' شمالی افریقہ اور خود یورپ تک پھیلا ہوا تھا۔

تصانیف: ۱۔ نیچریہ یا مادی گری / Refutation of Material /Naturalism نیچریوں کے خلاف لکھا جانے والا تحقیقی مقالہ تین مختلف زبانوں یعنی فارسی' اردو اور عربی زبان میں۔ سب سے پہلے فارسی زبان میں ۱۲۹۳ھ میں بمبئی سے شائع ہوا۔ پھر اردو میں ترجمہ ہو کر کلکتہ سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔ استاد شیخ محمد عبدہ نے عربی زبان میں اسے ترجمہ کر کے بیروت سے ۱۳۰۳ھ میں شائع کیا۔ یہ رسالہ ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ تتمتہ البیان فی تاریخ الافغان (عربی) افغانستان کی مختصر تاریخ مطبوعہ قاہرہ

۳۔ مقالات جمالیہ (فارسی زبان میں مفید مقالات کا مجموعہ)

اس مجموعہ سے سید جمال کے بھانجے مرزا لطف اللہ نے اس کی نقل لکھی تھی جسے مرزا صفات اللہ نے شائع کیا۔

۴۔ بابیوں کے فاسد عقائد اور ان کی مخالفت میں اور ان کی حقیقت حال پر جامع مقالہ جو

پطرس البستانی کے دائرۃ المعارف میں موجود ہے۔

۵۔عروۃ الوثقی :

پیرس سے منتشر ہونے والے جریدے کے مکمل شماروں کا مجموعہ جسے سید جمال شیخ محمد عبدہ کے ساتھ مل کر منتشر کرتے رہے تھے۔یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ابابیل اخبار کے مدیر نے ۱۹۱۰ء میں مصر سے شائع کیا اور اس کے بعد مکتبۃ العرب نے ۱۹۵۷ء میں مصر سے شائع کیا۔ایران میں بھی یہ عربی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔

۶۔جریدہ ضیاء الخافقین

عربی و انگریزی زبان میں لندن سے شائع کیا جانے والا جریدہ جس کے صرف دو شمارے شائع ہو سکے۔

۷۔اسلام اور علم : فرانسیسی اسکالر ارنسٹ رنان (Ernest Renan) کا مدلل جواب جو فارسی،فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں شائع ہوا :

Journal des debats paris : 18,may 1883

۸۔حجۃ البالغۃ : شیعوں کے عالمی پیشوا مرزا شیرازی کو لکھا جانے والا تفصیلی خط۔ مختلف کتابوں کے علاوہ اس خط کا متن مجلہ المنار جلد دھم میں اور انگریزی زبان میں براؤن کے نوشتہ جات op cit صفحہ ۲۱۔۱۵ میں موجود ہے۔

۹۔حملۃ القرآن : ایران کے صف اول کے علماء و مراجع کے نام خط جس میں انہوں نے شاہ کی معزولی کا مطالبہ کیا تھا۔یہ خط ان کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں میں محفوظ ہے۔

۱۰۔ماسون۔عربی زبان میں فری میسن (freemason) کی اصل حقیقت و ماہیت پر لکھی گئی کتاب جو اس کی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہے۔(غیر مطبوعہ)

مدارک

سید جمال الدین،مقالات جمالیہ،تدوین لطف اللہ،تہران : ۱۹۳۳ء

سید جمال الدین،اسلام و علم،تبریز : مرکز انتشارات دار التبلیغ : ۱۹۶۸ء

سید جمال الدین،نیچریہ یا مادیگری،قم : دفتر انتشارات اسلامی

شیخ عبدہ و سید جمال الدین،عروۃ الوثقی،مصر : مکتبۃ العرب۔۱۹۵۷ء

صدر واثقی،سید جمال الدین حسینی،تہران : انتشارات پیام ۱۹۵۶ء

صفات اللہ جمالی،اسناد و مدارک درباره سید جمال الدین،قم : انتشارات دار التبلیغ ۱۹۷۲ء

لطف اللہ جمالی۔ شرح حال و آثار سید جمال الدین، برلن: و تمرس ڈروف۔ ۱۹۲۶ء
احمد شنتناوی و ابراہیم زکی۔۔۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، تہران: موسسۂ مطبوعاتی اسماعیلیان، ۱۹۳۳ء جلد نمبر (۷)
H.A.R GIBB and Kramers, Shorter Encyclopedia of Islam,Leiden:E.J. BRILL, 1974 (PP.85-87)
محسن الامین، اعیان الشیعہ، بیروت: دار التعارف، ۱۹۸۳ء
جواد صاحبی، سید جمال الدین اسد آبادی تہران: انتشاراتی فکر روز ۱۹۹۶ء
محمود محمود، تاریخ روابط سیاسی ایران وانگلیس تہران: چاپ اقبال، ۱۹۸۲ء جلد پنجم
جواہر لعل نہرو، نگاہی بہ تاریخ جہاں Glimpses on the world history
فارسی ترجمہ، محمود تفضلی، چاپخانہ، سپہر ۱۹۸۷ء جلد سوم ۱۴۲۱ء جلد دوم ۱۱۳۳
علامہ اقبال، احیائے فکر دینی، ترجمہ احمد آرام، تہران: موسسۂ فرہنگی منطقی نی ۱۳۸۷ھ ص ۱۱۳۔۱۱۲
علامہ اقبال، جاوید نامہ، لاہور: شیخ مبارک علی تاجر، ۱۹۴۷ء
سید امیر علی، روح اسلام (spirit of Islam) ترجمہ محمد ہادی حسین، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۹۰ء
محمد علی چراغ، اکابرین تحریک پاکستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء صفحہ ۲۳۸۔۲۳۰

شخصیات

(ب)

(ش)

(ص)

(ط)

(ع)

شخصیات

(ی)

کتابیات

کتاب	مصنف
۱۔ اسناد و مدارک دربارۂ سید جمال الدین	صفات اللہ جمالی
۲۔ اسلام و علم	سید جمال الدین
۳۔ اعیان الشیعۃ	محسن الامین
۴۔ احیائے فکر دینی	علامہ اقبال
۵۔ اکابرین تحریک پاکستان	محمد علی چراغ
۶۔ انساب الاشراف	بلاذری
۷۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ	ابن حجر
۸۔ الاخبار الطوال	ابو حنیفہ دینوری
۹۔ اسلامیات۔ الفتنہ الکبری	ڈاکٹر طہٰ
۱۰۔ الامامہ والسیاسہ	ابن قتیبہ
۱۱۔ الامویون بین الشرق والغرب	ڈاکٹر سید محمد وکیل
۱۲۔ الامام الحسن بن علی	کا ل اللطاوی
۱۳۔ اسوۃ الرسولؐ	اولاد حیدر فوق بلگرامی
۱۴۔ احقاق الحق	قاضی نور اللہ شستری
۱۵۔ الاسلام فی مواجهة التحدیات المعاصرة	ابو الاعلیٰ مودودی
۱۶۔ امالی صدوق	شیخ صدوق
۱۷۔ اردو ڈائجسٹ (مارچ۔ ۱۹۹۳، ۱۹۹۴)	الطاف حسن قریشی
۱۸۔ احیاء علوم الدین	غزالی
۱۹۔ البدایہ والنهایہ فی السلام	ابن کثیر
۲۰۔ بحار الانوار	باقر مجلسی
۲۱۔ تاریخ اسلام	شاہ معین الدین ندوی
۲۲۔ تاریخ الدولۃ العربیہ	عبد السلام ترمانینی
۲۳۔ تاریخ اسلام	حافظ ذہبی
۲۴۔ تاریخ ابن عساکر ترجمۃ الامام الحسن	محمودی

اسلامی افکار و شخصیات

سید محمد قرۃ العین عابدی

ناشر
ویلکم بُک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی۔ فون: ۲۶۳۲۱۵۱